خطوط غالب میں سوانحی عناصر

سوامی راما نند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی

ناندیڑ مہاراشٹرا

مقالہ نگار

زرین سلطانہ امین احمد

ریسرچ اسکالر

نگراں

ڈاکڑ سیلم محی الدین

،پروفیسر، ریسرچ گائیڈ، صدر شعبہ اُردو
شری شواجی کالج، پربھنی

ریسرچ سینٹر

اسکول برائے زبان، ادب و ثقافتی مطالعات

سوامی راما نند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی
ناندیڑ مہاراشٹرا

فروری-2023

Khutoot-E-Ghalib Mein Sawanehi Anaser

SWAMI RAMANAND TEERTH MARATHWADA
UNIVERSITY, NANDED

For the Award of Degree
DOCTORATE IN PHILOSOPHY IN URDU

Submitted by
Zareen Sultana Ameen Ahmed
Research Scholar

Under the Guidance of
Dr. Saleem Mohiuddin
Associate Prof. Head, Dept. of Urdu
Shri Shivaji College, Parbhani

Research Center
School of Language, Literature & Culture Studies,
SRTMU, Nanded (Maharashtra)

February 2023
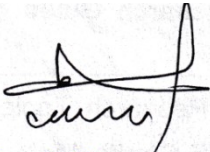
CERTIFICATE

This is certify that present thesis, titled **"KHUTOOT-E-GHALIB MEIN SAWANEHI ANASER"** is an original work carried out by Mrs. **ZAREEN SULTANA AMEEN AHMED** Under my guidance and supervision, and is being submitted forward of the degree of philosophy in Urdu to Swami Ramanand Teerth Marathwada University, Nanded. Her work and progress has been satisfactory to the best of my knowledge, it has not been submitted to any other university or board for any award.

Place : Nanded

Dated :

Dr. Saleem Mohiuddin
RESEARCH GUIDE
Professor & Head, Dept.of Urdu
Shri Shivaji College, PARBHANI

Dr. Saleem Mohiuddin
Professor & Research Guide,
Head, Department of Urdu
Shri Shivaji College, Parbhani

DECLARATION

I hereby declare that the thesis, titled **"KHUTOOT-E-GHALIB MEIN SAWANEHI ANASER"** is a record of original research work undertaken by me for the award of degree of Doctor of Philosophy in Urdu under the Supervision of **Prof. Dr. Saleem Mohiuddin,** Head, Department of Urdu, Shri Shivaji College, Parbhani, and not formed the basis for the award of any degree, diploma, associate ship, fellowship or titles.

I hereby confirm the originality of the work and that there is no plagiarism in any part of any dissertation.

Zareen Sultana Ameen Ahmed
Eligibility No. Ph.D/Feb-16/10
Research Center School of Language,
Literature & Culture Studies, SRTMU,
Nanded

انتساب

میرے والدین

اور

میرے

خاوِند

محمد جاوید

کے نام

جنھوں نے

میری قدم قدم پر

حوصلہ افزائی کی

ہر وقت

میرے ساتھ رہے

فہرستِ ابواب

عنوانات

پیش لفظ

اُردو نثری ادب میں دیگر اصناف کے علاوہ مکتوبات بھی اُردو ادب کا ایک بیش قمتی سرمایہ ہے۔مکتوبات یہ وہ ایک ادبی کارنامہ ہے جس میں انسانی زندگی رواں داوں نظر آتی ہے۔یہ ادب کا قدیم ترین فن ہے جس میں ہر قسم کے مضامین سموئے ہوئے ہیں۔

مکتوبات یا خطوط انسانی زندگی کے حال ، ماضی اور مستقبل کے تمام حالات کا عکس پیش کرتے ہیں جس میں انسانی رشتوں، جذباتوں، محبتوں، خوشیوں، غموں کی خوبصورت جھلکیاں موجود ہوتیں ہیں جو انسان کی حیات زندگی کے ساتھ جڑی ہوتیں ہیں۔

خطوط نویسی کا فن نہایت قدیم فن ہیں ۔زمانہ قدیم سے رقعہ کی شکل میں رسمی خطوط ہوا کرتے تھے یعنی بادشاہوں کے فرمانوں ، دستاویزات اور احکامات رقعہ کی شکل میں ہوتے تھے۔اور قاصِد سے خط رسائی کا کام لیا جاتا تھا۔ خط باہمی محبت کا اظہار خیال ہے جو ہجر کے ایام میں سکون قلب عطا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ خط کو ملاقات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

اُردو ادب میں مکتوب نگاروں کی کوئی کمی نہیں ہیں ۔اُردو ادب کے ہر عہد میں خطوط نویسی کومختلف مکتوب نگاروں نے اپنے الگ انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہیں۔ لیکن غالب کے مکتوب نگاری میں مخصوص طرز ادا ہے ان کی مکتوب نگاری دوسری تحریروں سے جدا ہے۔ غالبؔ کو اُردو مکتوب نگاری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط میں تہذیب، تاریخ ،معاشرت، ثقافت، سیاست کے ساتھ مکتوب نگاروں کے اُن عہد کے تمام گوشے موجودہے۔اس لیے غالب کے خطوط ایک خاص طرح کی دلچسپی اور لطف کے حامل نظر آتے ہیں۔

غالب کے مطابق جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے اس کو دور کے لوگوں تک پہنچانا گفتگو کو تحریر اور مکالمے کو مراسلہ کا جامہ پہنا نا ہے۔ اچھا خط اُس کو کہا جاسکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے اور اُس میں بے تکلفی بے سا ختگی، خلوص، فطری رنگ ، انفرادیت ،ذاتی تاثرات کی جھلک ہو۔ غالب کے نظر میں خط ایک نصف ملاقات کا ذریعہ ہے۔

جہاں تک غالبؔ کے خطوط پر تحقیقی کام کا تعلق ہے تو اب تک ان سے متعلق تہذیبی، تحقیقی، تنقیدی، اور سماجیاتی وغیرہ نقط نظر سے کام ہو چکے ہیں۔ البتہ غالب کے خطوط میں اُن کی نجی زندگی کے حالات اور اُن میں موجود سوانحی

عناصر اور اُن کے خطوط میں ادبی اور لسانی مطالعہ پر یکجا کام نہیں ہوا ہے۔ اس لیے میں نے اپنے اُستاد محترم کے مشورے سے پیش نظرمقالے میں '' خطوط غالب میں سوانحی عناصر'' کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے ۔

زیر نظرمقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب کا عنوان '' خطوط نگاری بحیثیت صنف ادب'' ہے ۔اس باب میں خطوط نگاری کی تاریخ، معنی و مفہوم ،اس کے اقسام ، آغاز و ارتقاء اور خطوط نگاری کو بحیثیت صنف ادب کب قرار دیا گیا ا ن تمام ترنکات پر روشنی ڈالی گی۔ جب سے خطوط نگاری صنف ادب بن کر سامنے آئی ہیں اتنی مقبول اور محبوب صنف بن گی جس کا مقابلہ ادب کی کوئی صنف مشکل سے کرسکتی ہے۔

اس باب میں مکتوب نگاری سے تعلق تمام تر ناقدین کے حوالے اختصار کے ساتھ پیش کئے گے اس کے ساتھ مکتوب نگاری کے فنی ارتقاء کا سیر حاصل تجزیہ پیش کیا گیا ۔اُردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبان و ادب میں مکتوب نگاری کی روایت کا تحقیقی جائزہ لیا گیا۔مکتوب نگارکی بنیادی عناصر ، عوامل کا تجزیہ اور فورٹ ولیم کالج نے اُردو نثر کے لیے جو کام کئے جس کی بناء پراُردو نثر نگاری نے جو ترقی کی منزلیں طے کیں ان تمام عوامل کاتفصیلی جائزہ پیش کیا گیا۔غالبؔ سے جدید اُردو نثر کا آغاز ہوا اور غالب کو اُردو مکتوب نگار کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ''اُردو میں خطوط نگاری کی روایت'' ہے ۔ اس باب میں اُردو خطوط نگاری کے ابتدائی دور کا مطالعہ کیا گیا جب اُردو خطوط نگاری فارسی انداز تحریر سے متاثر ہوا کرتی تھیں۔ جب فارسی زبان کمزور ہو تی گئی تب اُردو زبان نے اس کی تلافی کی۔اور اس طرح اُردو میں مراسلیت کا رواج بڑھتا گیا۔ محکمہ ڈاک کے قیام نے خطوط نگاری کو ترقی کے مواقع فراہم کیے۔چنانچہ کئی مرحلوں سے گزرنے کے بعد خطوط نگاری اُردو نثر میں داخل ہوگئی۔خطوط نگاری کے فن کو فروغ ملتا گیا اور کئی اُردو مکتوب نگار منظرے عام پر آئے جن میں مرزا محمد قتیل، غلاؔم امام شہیدؔ ،نواب واجد علی شاہ ، رجب علی بیگ سرورؔ ، خواجہ غلام غوث بے خبرؔ ، سرسید احمد خان ، محمد حسین آزاد، ڈ پٹی مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک، خواجہ الطاف حسین حالی،شبلی نعمانی ،مولانہ ابولکلام آزادؔ ، مرزا اسداللہ خان غالبؔ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ان تمام مکتوب نگاروں نے اُردو خطوط نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

تیسرا باب کا عنوان '' خطو ط غالب کا سماجی ادبی پس منظر (عہد غالب) '' ہے۔ ا س باب میں غالب کے خطوط کے مطالعہ سے اُس عہد کے سماجی، ادبی حالات کا پتہ چلتا ہے اور ان کے خطوط سے نہ صرف اُس عہد کی سماجی کڑیو ں کی حقیقی تصویر ملتی ہے بلکہ ہمیں اس عہد کی تہذ یبی، تاریخی، سیاسی، اور ادبی معاشرتی حالات سے واقفیت بھی ہوتی ہے۔ان تمام نکات پر روشنی ڈالی گئی۔

عہد غالب میں اُردو میں نثر کا ارتقائی پس منظر خطوط کی تاریخی اہمیت اور سماجی پس منظر کو پیش کیا گیا۔ ۱۸۵۷ ؁ء کی پہلی جنگ آذادی اور دہلی کی بربادی کا سماج پر اور اُردو نثر پر ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ غالب کے عہد کے سماجی تہذیبی اور سیاسی زندگی کے مطالعے کے لیے بھی خطوط غالب اہم ترین ماخذ ہیں غالب نے سماج میں فرد کے تعلق سے تمام پہلوؤں کا ذکر اپنے خطوط کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ ؁۱۸۵۷ء غالب کی زندگی کا حیرت نگیز دور ہے جب غالب نے دہلی کی بربادی ، دم توڑتی تہذیب کو اپنے آنکھوں سے دیکھا جو اُن کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ پیاری تھی اس درد کی شیدت کو غالب نے اپنے خطوط پیش کیا۔ان تمام نکات کا جائزہ لیا گیا۔

باب چہارم '' خطوط غالب کا لسانی مطالعہ '' اس عنوان پر مشتمل ہے۔ اس باب میں لسانیات کی تاریخ، آغاز و ارتقاء، لسانیات کے معنی ومفہوم اور اور اس کے اقسام پر تفصلی جائزہ لیا گیا۔غالبؔ نے اپنے خطوط میں بعض لسانی اور لغوی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے جن میں مفرادت، مرکبات، تذکیر و تانیث اور متفرقات شامل ہیں۔اس کے علاوہ بعض امور ایسے ہیں جن کا تعلق ادبی ولغوی مسائل سے ہے ۔یہاں غالبؔ کے خطو ط میں زیر بحث آئے ہوئے لسانی اور لغوی مسائل کا تحققی و تفصلّی جائزہ لیا گیا۔

غالبؔ کے نثری تحریر وں میں تذکرو تانیث پر بھی گفتگو کی ہے۔ قواعد ، املا کے علاوہ تذکرو تانیث کا خاص طورپر خیال رکھا ہے غالب اُصول کے سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اور اپنے خطوط میں اپنے شاگردوں اور عزیز واقادب کو تحریری اُصول کے ساتھ تذکیروتانیث پر بھی بحث کرتے تھے۔غالبؔ نے خطوط میں ایسے الفاظ بیان کیے اور ان الفاظوں کے لیے مذکر و مونث کا استعمال بھی بتایا ہے۔ جب ہم غالبؔکے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے اپنے خطوط میں جہاں دیگر مسائل پر بحث کی ہے اسی کے ساتھ قواعد زبان تلفظ اور اِملا کا بھی بطور خاص خیال رکھتے تھے اور اپنے

احباب اور شاگردوں کو اس طرف متوجہ کراتے رہتے تھے۔غالب کے خطوط کی خاصیت یہ تھیں کہ ان کے القاب و آداب دوسروں سے مختلف ہوا کرتے تھے اور ان کے طرز تحریری بھی جُدا تھی۔ان تمام نکات کا تفصلّی اور تحقیقی جائرہ پیش کیا گیا۔

باب پنجم کا عنوان ''خطوط غالب میں سوانحی عناصر'' ہے۔ اس باب میں خطوط غالب میں سوانحی عناصر پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ سوانحی عناصر کے مطالعہ کے ساتھ سوانحی نگاری کی علم پر روشنی ڈالی گئی۔ مزید اس باب میں سوانحی عناصر کے معنی و مفہوم، سوانحی عناصر کی روایت اور اس کے اُصول و اقسام پر روشنی ڈالی گئی۔غالب کے خطوط میں ان کی سوانحی عناصر پائے گے ان

عناصـر کـا تبصـرا کیـا گیـا۔ ان کی زنـدگی میں جـو واقعـات پیش آئے اور غـالبؔ جن پریشانیوں اور تکلیفات سے گزرے ان میں موجود سوانحی عناصـر کـا تفصـیّلی جـائزہ لیا گیا۔

باب ششم ''غالب کی خطوط میں سوانحی عناصر کا تجزیہ'' پر مشتمل ہے۔ جس میں خطـوط میں موجـود سـوانحی عناصـر کی مکمـل وضـاحت پیش کی گـئی۔ ان کی حـالات زنـدگی میں پیش آنے والے سـفروں کے علاوہ معاشـی مشـکلات ، آمـدنی، آخراجات اور تنگ دستی قرض اور اپنے پنشن کو پـانے کی کوشـش ان تمـام بـاتوں کـا ذکر ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے ۔ ان تمام سوانحی عناصر کا تفصلی تجـزیہ پیش کیا گیا۔

مقالے کے آخر حصہّ اختامیہ ہے جس میں مذکورہ چھ ابواب کا مختصراً جـائزہ لیا گیا۔ آخـر میں اُن تمـام کتـابوں اور رسـائل کی فہرسـت دی گی ہے جن کے مطـالعے اور مدرسے یہ مکـالے تحریـر ہـوا۔ اور اس بـات کی حـددرجہ کوشـش کی گـئی کہ یہ مقالہ ہر اعتبار سے معیاری و جاندار اور مکمـل ہـو۔ اب اس کوشش میں مجھے کہـاں تک کامیابی حاصل ہوئی۔ اہل نظر ممتحن حضرات کا فیصلہ فرمائیں گے۔

الحمـداللہ آج مجھے بہت خوشـی محسـوس ہـورہی ہے کہ مـیری پی۔ ایچ۔ڈی اس مقالے کے ساتھ انشاء اللہ مکمـل ہـونے جـارہی ہے جس کے پیچھے مـیرے والـدین کی دُعاؤں کا اثر ہے۔ میرے والد مرحوم الحاج محمد امین احمد، رٹیرڈ شیکن افیسر پنچایت سمتی پاتھری ، ان کی بـڑی خـواہش تھی کی میں پی۔ ایچ۔ڈی تـک تعلیم حاصـل کـروں۔ مجھے اس بـات کی خوشـی ہے کہ میں ان کی خـواہش الحمـداللہ مکمـل کـرنے جـارہی ہوں۔اللہ کا کرم اوران کی دعـاؤں کـا پھـل ہے کہ میں یہ مقـالہ مکمـل کرسـکی ہـوں اللہ انہیں جنت القردوس میں بلند درجات عطا کرتئے ، امین۔

میرے نگران پروفیسر سلیم محی الدین سر نے میری نثری اصناف میں دلچسـپی کـو دیکھ کـر مجھے مکتـوب نگـاری اس موضـوع میں'' خطـوط غـالب میں سـوانحی عناصر'' کا بہترین مشورہ دیا۔ میں دل کی عمیق گہرائیوں اپنے اُستاد اور میرے نگران پروفیسر سلیم محی الدین سر کا شکر یہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے موضـوع کے انتخـاب اور مواد کی فراہمی سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہرقدم پر میری ر ہنمائی کی آپ کے قیمتی مشـوروں مخلصـانہ رہنمـائی، مشـفقانہ برتـاؤ ، کتـابیں کی فـراہمی، حوصـلہ افزائی ، کام کرنے کی ترغیب دینا، سچ تو یہ کہو تـو آ پ کی رہنمـائی اور شـفقت کے بغیر یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچنا نا ممکن سا تھا۔ بہر حـال میں دل کی گہرائیـوں سے آپ کی خدمت میں شکریہ اداکرتی ہوں۔ساتھ ہی میرے اُستاد م ڈاکٹرحمیـد اللہ خـان سـر کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھیں نے مقالے کے اختتام میں مقالے کی تـرتیب وغـیرہ میں میری رہنمائی فرمائی۔

اس مقالے کی تحریر اور تکمیل جن کے بغیر نہ ممکن سا لگتا تھا ان کا شکر یہ ادا کرنا مجھ پر فرض ہے ۔ میرے خاوند محمد جاوید محمد ایوب ان کا میں دل کی عمیق گہرائیوں سے شکر ادا کرتی ہوکہ مجھے ہمشہ تحریک دلاتے رہے ہر وقت میرے ساتھ رہے۔ کتابیں جمع کرنے سے لیکر مواد کے مقالہ مرتب کرنے میں اورکمپوٹرائز کرکے پائے تکمل تک لانے میں میری مدد فرمائی آپ کا بے حدتعان رہا۔آپ کی کاوشوں کی ہمشہ ممنوں و مشکور ہوں گی۔

میرے خاندان میکہ اور سسرال کے تمام افراد میرے والدین ، ساس سسر ، میری بہنیں آسماء نوشن، فرحین، نازنین، تسلیم ، نسرین اور میرے بھائی محمد محسن احمد، مُبین احمد، معین احمد اور محمد خالد یہ سبھی نے میرے مقالہ کے دوران تعاون کیا ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ان سب کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میرے عزیز اور دوستوں کا شکر ادا کرتی ہوں جنہوں نے مقالے کو دوران میری مدد کیں۔

مقالہ نگار

زرین سلطانہ ولد امین احمد

شعبۂ اُردو ، ڈاکٹر ذاکرحسین ڈگری
کالج پربھنی۔

اوّل باب

خطوط نگاری بحیثیت صنف ادب

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

دُنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اُردو زبان میں بھی مختلف اصناف موجود ہیں۔اُردو کے نثری اصناف میں داستان، ناول، ڈرامہ، غیرافسانوی ادب۔ سوانح نگاری، مضمون نگاری، انشاء نگاری، خاکہ نگاری اور مکتوب نگاری وغیرہ شامل ہیں۔اُردو نثر اصناف میں مکتوب نگاری اپنا منفرد اور اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ مکتوب کی اہمیت و ضرورت کے سبب مکتوب نگاری کو صنف ادب کا درجہ حاصل ہے۔ آٹھارویں صدی کے ابتداء میں اُردو نثر کے اولین نمونے دکن ہی سے ملتے ہیں۔فورٹ ولیم کالج اُردو نثر کے لیے سنگ مل کی حیثیت رکھتا ہے۔میرامن کے بعد اُردو نثر کو مرزا غالب جیسا فن کار ملا ۔ غالب نے نثر میں باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں لکھی لیکن اُن کے خطوط نے اُردو نثر کو بیش قیمتی سرمایہ عطا کیا۔جس سے اُردو نثر کی دُینا ہی بدل گئی۔غالب کو اُردو مکتوب نگاری کانقو ش اول کہا جاتا ہے۔انھوں نے اُردو نثر کو نئی سمتوں سے روشناس کروایا ہے۔غالب کے خطوط میں بے ساختگی، سادگی، بے ریائی، دردمندی اور اخلاص موجود ہے اور یہی خصوصیات اس صنف کو ادب کا حصّہ بناتی ہیں ۔غالب کی بدولت مکتوب نگاری ادب کی ایک جاندار اور دلکش صنف بن گئی ہیں۔غالب نے خطوط اپنے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کو لکھے ہیں۔ جس میں اپنے عہدکے تاریخی،سماجی، سیاسی حالات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کے خطوط کے مطالعہ سے ہمیں ان کی شخصیت، کردار، مزاج اور ادبی ذوق سے واقفیت ہوتی ہیں۔دراصل ان کے خطوط سوانحی اور ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالب کی زندگی کے تمام تر حالات شب وروز اوراپنے عہد کے دہلی کے تمدنی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ان خطوط میں ڈرامائی کیفیت سے لے کر غالب کے مزاج کے کئی پہلو، زندگی کے ،مشاہدے اور تجربے موجود ہیں۔اور ان کی نثر ان کی شخصیت کی مکمل طورپر آئینہ دار ہے۔غالب کے نثر کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیات جدید انداز بیان ہے۔انھوں نے ایک وقت میں نثر کے مختلف اسالیب کو یکجا کردیا۔ کہیں افسانوی اندازہے توکہیں ڈرامے کے مکالمے نظر آتے ہیں۔

آٹھارہویں صدی کے خاتمے تک اُردو ادبی نثر میں اہمیں مذہبی، اخلاقی ، صوفیانہ کتابیں ملتی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پہلے اُردو نثر کا عام روجھان مرصع و مسجع،انشاپردازی کی طرف تھا اوراس پر فارسی اسلوب کے اثرات غالب تھے ، مگر جیسے جیسے نثر پھلتی گئی اور عوام سے جوڑتی گئی اور پر سے فارسی کے اثرات ختم ہونے لگے، اور اسلوب میں سادگی، سلاست پیدا ہوتی گئی۔یہی طرز جدید دور میں پروان چڑھ کر باغ وبہار سے ہوتا ہواخطوط غالب سے جا ملتا ہے۔خطوط غالب اس جدید طرز کے ساتھ اپنے عہد کے مکمل تصویر

کشی کرتے ہیں۔ اِن تازگی، توانائی اور دلکشی ہے، یہی وجہہ ہے کہ غالب کے خطوط اُردو ادب میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

مکتوب نگاری کی تاریخ

مکتوب نگاری کا آغاز کب ہوا،اس بات کو جانے سے پہلے ہمیں مکتوب نگاری کی تاریخ مطالعہ کرنا ہے۔مکتوب نگاری کی تاریخ نہایت قدیم ہے کاغذ ایجاد ہونے سے پہلے جب انسان درخت کے پتوں، مٹی کی تختیوں، دھات ، چمڑے کی پلیٹوں پر لکھتا تھا۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا کرتا تھا۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ تحریروں کا سلسلہ بھی آگے بڑھتا گیا، تو مکتوب نگاری بھی اس کے زیر اثر آگئی۔

جب انسان نے رسم الخط ایجاد کیااور لکھنا سکھا،اُسی زمانے میں خطوط نویسی کا آغاز ہوا ہوگا۔ اس بات کا پتہ ۱۸۸۷ ؁ ء میں السم نا (عراق) کے مقام پر کھدائی کے دوران تقر یبًا تین ہزارسال قبل کی تین سومٹی کی تختیاں اسی نکلی ہیں جن پر مصر کے قراعنہ کے نام سے خطوط کندہ ہیں۔اس مٹی کی الواح پر خط سریانی میں عبارت درج ہے جن سے مصر اور اس کے دیگرممالک کے تعلقات پر ورشنی پڑتی ہے۔لہذا یونان کے شاعر ہو مر (Homer) اور مورخ پیروڈوس Herodous)) کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم یونان میں خط و کتاب کا رواج تھا۔یونانی خطوط نگاری سے بخوبی

واقفیت رکھتے تھے بلکہ اس سے دلچسپی اور شوق بھی تھا۔ یونان کی طرح روم کی خطوط نگاری کی بھی تاریخی اہمیت ہے۔روم کی خطوط نگاری میں کئی مکاتیب افلاطون ،ارسطو اور اپیکیورس سے بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔ اہل روم نے ہی مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن بنا دیا۔

لاطینی میں ہوریس نے (Horance) منظوم خطوط لکھنے کی روایت قائم کی مغربی مکتوب نگاری میں سرو رکو پہلا مکتوب نگار ماناجاتاہے۔انگریزی ادب میں ڈاکٹر سمویل جانس (Dr. Samuel Johneen)کے علاوہ لارڈ رچیڑ فیلڈ (Lard Chester) ولیم کوپر (Williamce Couper) چارلیس لیمپ Carls Lamp))کیٹس (Keals) شلی(SellY) ہائر (Hyron) براوَننگ (Browning) اور جارج برناڈشاہ (George Barnard Shah) کے خطوط قابل ذکر ہے۔ فرانسی ادب میں نپولین (Nepolean) والٹیر(Valtire) وکڑ ہیوگو(Victor Hugo) ارو گائی دی سویاسال کے خطوط خاص مقام رکھتے ہیں۔

عرب میں بھی خط لکھنے کارواج تھا۔ خط لکھنے والے کو کاتیب کہا جاتا تھا۔ اسلام کے ظہور کے بعد اس فن نے کافی ترقی کی۔ آنحضرت ﷺ کی جانب سے ارسال لکھے گئے خطوط ایک مرتب شکل میں دستیاب ہیں۔ عربی خطوط کی تاریخ میں عبدالحمیدبن یحی کا نام قابل ذکر ہے انھوں نے نہ صرف خط کی ابتداء کی بلکہ مضمون نیز القاب و آداب میں جدّت پیداکی۔ عربی زبان و ادب میں عبدالحمیدین یحی اسے مکتوب نگاری میں جن کے خطوط نجی ذاتی اور ادبی نوعیت کے ہیں۔

لہذا ایرانیوں نے اپنی حکومت میں عربی زبان کو نکال کر فارسی زبان کا رواج عام کیا فارسی کو دفتری زبان بنادیا اور عربی کی جگہ فارسی میں بھی خطوط لکھے جانے لگے۔ غرض ہندوستان میں بھی فارسی زبان و ادب میں بزرگارن دین اور صو فیائے کرام کے خطوط کا سرمایہ ملتا ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے بیٹوں اور امراء کے نام لکھے خطوط آج بھی موجود ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں کے فارسی خطوط خاص طورپر قابل توجہ ہے۔ ان کے خطوط میں باہمی گفتگو کا پورا لطف موجود ہے۔

غالبؔ نے اپنے خطوط میں اس بات کا تذکرہ کئی جگہ کیا ہے کہ ان کا اصل میدان فارسی ہے۔لیکن خود ان کے قول کے مطابق انہوں نے اردو میں خطوط لکھنے کی وجہہ یہ بتائی کہ ضعف العمری کے باعث ان میں دماغی قوت کی اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے معیار اور مرتبے کی فارسی لکھے۔جس کاذکر غالب نے منشی شیو نرائن کے خط میں کیا۔اور اُردو میں خط لکھنے کے لیے اُن سے رائے دریافت کی۔

مگر بھائی تم غور کرو اُردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گااور اس عبارت میں معنی نازک کہوں کر بھروں گاا بھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں، کون سی بات، کونسی کہانی، کون سامضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں، تمہاری رائے تو مجھ کو بتاؤ۔ " ۱؂

مکتوب نگاری کی تعریف

انسان نے خیال کی ترسیل کے لیے خط کو ذریعہ بنایا لیکن کس بھی صنف کو ادب کا حصّہ بنے کے لیے کئی مراحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ کسی بھی صنف کو نکھرنے اورسنوارنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے جب جاکر وہ صنف ادب بنتی ہیں۔ خطوط نگاری کے فن سے واقف ہونے کے لیے ہمیں خط کی تعریف، معنی اور مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔

خط کے لغوی معنی لکیر یا سطر کے ہیں یہ لفظ عربی زبان سے ماخوذ ہے ۔ عربوں کے یہاں یہ لفظ تحر یر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔مگر وقت حالات اور زمانے کے تغرات کے لحاظ سے اس کے معنی میں تبدیلی پیدا ہوتی گی پھر اس کو مراسلہ تحریر نامہ کہا جانے لگا۔ ابتدا میں یہ لفظ خط کے نام سے منسوب نہیں تھا۔ بلکہ اس کو رقعہ کہا جاتا تھا۔ زمانہ قدیم سے رقعہ کے معنی میں رسمی خطوط ہوا کرتے تھے ۔یعنی مخصوص بادشاہوں کے فرمانوں، دستاویزات ارو احکامات کو رقعہ کہا جاتا تھا۔اِن احکامات و رقعات کی رسائی کے لیے مخصوص اشخاص کا انتخاب ہوا کرتا تھا۔حا لانکہ اِنسان نے ترسیل خیال کے لیے یہ سبیل تو نکالی لیکن خط کو اپنے اصلی روپ میں آنے کے لیے ایک عرصہ لگا۔ ۲۰۰۰ ق م تک رقعات میں براہ راست مخاطب کا انداز نہیں ملتا ہے۔ ابتداء میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک تیسرا شخص ہوتا تھا جسے قاصد یا نامہ بر کہتے تھے۔ جس کا کام نہ صرف خط کی رسائی تھا بلکہ وہ خط پڑھ کر بھی سناتا تھا۔ خط عام طورپر دو اشخاص کے درمیان اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کا ایک تحریر ذریعہ ہے۔

خط کی تعریف مندرجہ ذیل بیان کی گئی ہیں۔

سید سلمان ندوی لکھتے ہیں۔

خط کیا ہے آپس میں دو آدمیوں کی بات چیت ہے'' ۲ے"

خط با ہمی محبت کا اظہار خیال ہے جو ہجر کے ایام میں سکونِ قلب عطا کرتا ہے۔ اسی لیے خط کو نصف ملاقات کاذریعہ سمجھا گیا ہے۔انسان خط میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار آزادنہ طورپر کرتا ہے۔اِس ضمن میں مرزا غالبؔ نے بھی یہی کہا کہ خط ملاقات کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ باہمی تکلّم بھی ہے۔

' پیرومرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں۔ ۳ے "

خط کی تعریف بقول عبدالحق

خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارحیات کا صحیفہ ہے اِس میں وہ صداقت و خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا"۔ ۴ے

عبدالحق نے خط کو انسان کی دِلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ کہا ہے۔ جس میں سداقت اور خلوص موجود ہوتا ہے جس سے انسان کی شخصیت اور سیرت کا اندازا ہوجاتا ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے خط کی تعریف اس طرح کی ہے کہ خط میں بے تکلفی، بے سادگی، خلوص موجود ہوتا ہے۔ نہ کہ علمیت کی نمائش ہو۔

قول غا لبؔ کے جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے۔ اسے دور کے لوگوں تک پہچا نا، گفتگو کوتحریر کا مکالمے کو مراسلے کا جامہ پہنا تا۔ اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے ناتیں کر تاہوا نظر آئے۔ جس میں بے تکلفی، بے ساختگی خلوص فطری رنگ انفرادیت ذاتی تاخیرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ وہ خط جس میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشاہزداری کی شان تکلف کااظہار خطایت کا جوش دکھا یا جائے خط نہیں مضمون ہے۔ ۵ـہ

مکتوب نگاری کا فن آسان ترین فن ہے اِس کے لیے کس طرح مہارات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی اُستاد سے مشورہ لینے کی ضرورت ہیں۔ مکتوب کی صنف بہت حد تک کئی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اِس میں ہر بات کی گنجائش ہے خطوط کے دائرے میں وہ تمام موضوعات سموئے جاسکتے ہیں جن کا تعلق اِنسان کے ذہنی ارتقاء اور زندگی کے مختلف گوشوں سے ہوتا ہے۔ اِس میں ہجر کی داستان ،وصل کا مزہ،مصائب و آلام کا ذ،کامیوں پر اظہار غم ،کامیابیوں پراظہار مسرتؔ، نفرت ،خلوص غرض یہ کہ ہربات کی ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ بلکہ خطوط کے ذریعہ زندگی کے ہر شعبے پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ خط میں کوئی مرکزیت نہیں ہوتی۔ باتیں بدلتی رہتی ہیں لہجے میں اتار چڑھاو آتا رہتا ہے ۔گفتگو میں نرمی اور گرمی آتی رہتی ہے۔

خطوط نگاری کے اصول و ضوابط نہیں بنائے گئے لہذا خطوط نگاری کی صنف فنی جکڑبندیوں سے بہت حد تک آزادہے۔ تجزیہ نفس کی زبان میں غیر آہنگ تلازم کی صنف ہے اِس میں ہر بات کی گنجائش ہے۔ خط کے لیے نہ موضوع کی قید ہے اور نہ ہی اِس کے ہیت کے لیے ضابطے متعین کئے گئے ہیں لیکن ادبی خطوط اپنی داخلی کفیات اور موضوعات کے لحاظ سے دیگر اصناف ادب سے ممتاز ہیں۔

ڈاکڑ خلیق انجم رقمطراز ہیں،

مکتوب نگاری کا کوئی اصول اور ضابطہ مرتب نہیں کیاجاسکتا لیکن کسی مکتوب کے لکھے جانے کا کوئی محرک نہ ہوتا وہ کسی خط کے جواب میں نہ لکھا گیا ہو تو اسے مکتوب کہنا مشکل ہے ہر اِس تحریر کو جو خط کی فارم میں لکھی گئی ہو۔ مکتوباتی ادب میں جگہ دینا مناسب نہیں کیونکہ بعض اوقات اس فارم میں انشاء بردازی کے جوہر بھی دکھائے جاتے ہیں۔ ان تحریروں کا محترک کوئی اور مقصد ہوتے ہے۔" ۶ـہ

یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا لکھا ہوا خط اہم ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ہر عظیم مکتوب نگار کے خطوط ایک ہی درجےکے ہوں یہی وجہ ہے کہ بہت کم مکتوب نگار ایسے ہیں جن کے خطوط کو مکاتیبی ادب میں جگہ حاصل پائی ہے۔اُردو ادب میں بے شمار اصناف اور ہزاروں دلکشیاں موجود ہیں لیکن غالب کے خطوط میں جو جادو اور اندازِ تحریر ہے وہ کسی دوسرے میں نہیں۔خط مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک باعمل سمجھوتہ ہے مکاتیب سے ہر دوافراد کے درمیان صداقتوں کا اظہار ہوتا ہے ۔اور یہی اظہار انکی زندگیوں کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔

بابا اَردو مولوی عبدالحق خط کے متعلق آپنے خیالات کا اِظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"ہماری ہر تصنیف و تالیف ہماری ہر عملی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے غیروں کے لیے ہے اور ہم یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گی اس لیے مصلحت وقت کا خیال ہوتاہے عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جب اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھا جاتا ہے تو وہاں کوئی عزیت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ بلا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے وہ ہر مسئلہ اور ہرشئے سے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ خطوط کی یہی سادگی اور بے رہائی ہے جو دلوں کو لبھالیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کو خطوط سے انسان کی سیرت کا جیسا انداز ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔" ۷ـ

مولوی عبدالحق کے اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خط کے ذریعہ انسان اپنی تمام تر کیفیات اورخیالات کو سچائی کے ساتھ ظہار کرتا ہے۔جس کی وجہہ سے انسان کی سیرت اور شخصیت کا انداز ہوجاتا ہے۔خطوط نوسی کا فن ایک عجیب کیفیت رکھتا ہے خط نہ صرف خبر رسانی کا کام کرتا ہے بلکہ اس کی نمایت مخاطبِ کوراز داں بنانا اور آپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا بھی ہے۔لہذا کاتبِ تحریر اپنا ماضی اپنے اخلاق و عادات اپنی رائے اپنے قلم کے ذریعہ مخاطب کے سامنے ظاہر کردیتا ہے۔

خطوط نوسی نثر نگاری کی ایک مستقلِ صنف ہے اور یہی وہ صنف ہے جس'' میں کاتب تحریر اپنا ماضی الضمیراپنا کیر یکٹر character اپنے اخلاق وعادات دوسروں سے متعلق اپنی رائیس اپنی سوسائٹی کا سچاّ چربہ غرص کے ہر وہ بات جو اس کے قلم سے تراوش کرئے صحیح طورپر دنیا کے سامنے ظاہر کردینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔" ۸ ـ

خطوط نہایت دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں چونکہ اِن میں راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں جس کو سننے اور پڑھنے کا اشتاق ہر ایک کو رہتا ہے۔ اس کے علاوہ خطوط سچائی اور حقیقت کی عکاسی بھی کر تے ہیں اس میں دھوکا فریب ریاکاری، مکاری، جعل سازی بالکل نہیں ہوتی۔خط ہر ایک دل کو مرغوب ہوتا ہے قاصد کی صورت سب کو پیاری لگتی ہے جو خط کے ذریعے دو اشخاص کے درمیان دوری کو قربت میں تبدیل کرتاہے خط ہر ایک قلب کے لیے نو ید مسرت ہے مگر کبھی کبھار یہ رنج و ماتم کی کیفیت یھی پیدا کرتا ہے۔غرض خط انسانی جذبات و خیالات کو صفحہ قرطاس پر اتارنے کا ایک ذریعہ ہے خطوط نوسی کی ابتداء کے لیے کسی قاعدے یا قوانیں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وسیے خطوط ابتداء میں رسمی ہواکرتے ہیں ان میں طویل القاب کا استعمال ہوا کرتا تھا۔ جس سے مقصد تحریر فوت ہوجاتا ہے۔

خطہ جتنا مختصر ہوتا ہے اتنی اس میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ مگر خط اتنا طویل بھی نہ ہو کہ وہ دفتر بن جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خط کو نہ تو لفظ میں سمانے کی ضرورت ہے اور دفتر بنانے اور اوراق سیاہ کرنے کے بجائے درمیان روی ہی اِسکے لیے مفید ہے۔ خط میں عام فہم زبان کا استعمال ضروری ہے۔ تاکہ مکتوب الیہ اِس کو سمجھ سکے۔ غرض خطوط میں عام گفتگو کی زبان ہونی چاہیے تاکہ وہ ہر ایک کی سمجھ میں آسکے یہی خط کی سب سے بڑی خوبی ہے اور ہی مکتوب نگاری کا فن ہے۔مکتوب نگاری کے سلسلے میں ایک اور اہم بات ہے کہ ہر اچھے خط میں مقصدضرور ہوا کرتا ہے، جس کے لیے وہ لکھا جاتا ہے یعنی مکتوب نگار جو کہنا چاہتا ہے وہ اپنے انداز میں کہے کہ مکتوب الیہ کو پیغام کا علم ہوجایئے۔

ڈاکڑسیدّعبداللہ خط کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

خط بڑا ہی نازک فن ہے یہ جگر گذاری بھی ہے اور آئینہ سازی بھی۔ یہ مختصر اور محدود بھی ہے اور وسیع اور بے کراں بھی اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے بیش بھی ہے بظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر ورق پھر بھی دفتر ہے۔" ۹ ـہ

خطوط میں ادبی چاشنی لطافت، نزاکت اور سادگی و ہرکاری ہوتی ہے خط ایک جہانِ راز ہے جو صحفۂ قرطاس پر اُترکراپنےاحساسات وہ جذبات کا اظہار کرتا ہے خطوط میں دنیا وی مسائل کی حثییت ثانوی ہوتی ہے۔لیکن نجی مسائل اور نجی باتیں تحریر میں آتی ہیں مختصر اور موثر تحریر جس میں سرگوشی اور ہم کلامی کی کیفیت موجود ہو وہ خط کی تعریف میں پورےاُترتے ہیں۔ خط کا مقصد اِن لوگوں تک

اپنے خیالات کی رسائی کرنا ہے جو حد سماعت سے کافی دور ہے اس لیے تو انسانی ذہن نے اس کی ابتداء کی اور ہزاروں کوس دور بیٹھ کر ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اس بات کو مرزا غالب نے خود بیان کیا ہے۔

بقول غالب

میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزاروں کوس بیٹھے بہ زبان قلم سے باتیں کرواور ہجرمیں وصال کے مزے لیا کرو۔"۱۰ ؎

مکتوب کے اقسام

ضروریات زندگی میں مکتوب نگاری کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ادب میں اس کے قوانین اور اقسام بنائے گئے۔ خطوط نویسی عام حالات میں معلومات کا ذریعہ ہوتی ہے۔سیاسی ، دفتری، تجارتی، کاروباری اِداروں میں ترسل کا کام انجام دینے کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔

بقول عرفان الحق،

ضروریات زندگی میں خطوط نگاری بڑی اہمیت کا حامل ہے خطوط نویسی عام حالات میں معلومات کا ذریعہ ہوتی ہے ابتداء میں خطوط نوسیی کے کوئی قواعد نہیں تھے۔ رفتہ رفتہ اِس صنف میں آداب و قوانین کا استعمال ضروری سمجھا گیا۔ خطوط کی اقسام ہیں جیسے سیاسی، دفتری، تجارتی، کاروباری، اطلاعاتی، عملی، معلوماتی، جذباتی، خیالی وغیرہ لیکن عام طورپر خط تین قسموں پر مفہم ہے"۔ ۱۱ ؎

اس لحاظ سے خط کو تین حصّوں میں تقسم کیا گیا ہیں۔

۱. سرکاری خطوط

۲. ادبی خطوط

۳. نجی خطوط

سرکاری خطوط :۔

سرکاری خطوط مختلف دفاتر اور سرکاری معاملوں کے تعلق سے لکھے جاتے ہیں۔ اِن خطوط میں نجی، ذاتی خیالات کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ جس کام کی خاطر وہ خطوط لکھے جاتے ہیں اس کی تفصیل ہوتی ہے لکھنے والے کالہجہ نجی یا ذاتی نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ سرکاری قوانین اور سرکاری آئین کو مخوص رکھ کر خط لکھتا

ہے۔سرکاری معاملوں کو انجام دینے کے لیے یہ خطوط دستاویزات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

مثال کے لیے نمونہ خط ملا خطہ کیجئے۔

بخدمت جناب اسٹفٹ رجسٹرار صاحب

انجمن بائے امداد باہمی سٹی زون دہلی۔ ۶

جناب عالی

مودبانہ التماس ہے کہ اہل علاقہ پہاری بھوجلہ بہت غریب لوگ ہیں ہم انجمن بائے امداد باہمی سے متفیدہونے کے لیے اپنے علاقے میں اس انجمن کی ایک شاخ کھولنا چاہتے ہیں لہذاء ہمیں یہ شاخ کھول کراستفادنے کاموقع دیا۔ اِس لیے انسپکٹر علاقے کو بھج کر ہم علاقہ والوں اس سے فوائد سمجھا نے کا بھی انتظام کیا جائے۔

فقط

اہلیان گلی محلہ میدان

ادبی خطوط :۔

اِن خطوط میں گھریلوزندگی کے وا قعات نہں ہوتے بلکہ کسی علمی و ادبی مو ضوع پر اظہار خیال ہوتا ہے مختلف جرائد کے مدیران کے نام جو خطوط لکھے گئے وہ بھی ادبی خطوط میں شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ خطوط اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ خطوط ملک کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ قارعین اپنے ردعمل کا مظاہرہ بھی ان خطوط کے ذریعے ہوتا ہیں۔ اِن خطوط کی نوعیت نجی یا ذاتی نہیں ہو تی بلکہ عمومی ہوتی ہے۔

مثلاً مرزا غالبؔ کا یہ ادبی خط ملاخطہ کیجئے۔

بنام مولوی عبدالرازاق شاکرؔ

قبلہ۔ پہلے معنی ابیات بے معنی سنئے۔

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا"

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ایران میں رسم ہے کے داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حا کم کے سامنے جاتاہے۔ جیسے شعل دن کو جلا نا یا خون آلودا پڑا بانس پر لٹکا کر لے جا نا پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے ا س کا پیر ہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگر چہ مثل تصو یر ہے اعتبار ِمحض ہو موجب، ر نج وملال وآزار ہے۔ ۱۲ ؎

نجی خطوط :۔

نجی خطوط اپنے عزیز و ارقاب اور دوستوں کو لکھے جاتے ہیں جن میں مروت جذبات و احساسات خلوص، ہمدردی و غم خوار کا اظہار خیال ہوتا ہے۔ اِن میں گھریلو زندگی کے واقعات اور اپنی نجی بات پر اظہار خیال ہوتا ہے ان خطوط میں کسی عملی وادبی مو ضوع پر اظہار خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ کامیاب مکتوب نگار اپنی نجی باتوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے کہ وہ ہمیں اپنی ہی داستان معلوم ہونے لگتی ہے۔

نجی خط کا ایک نمونہ ملاخط کیجیے۔

جانثار اختر کا خط صفیہ اختر کے نام میری صفو تمہارے دونوں خط کہو تو زبانی سنا سکتا ہوں تمہارے خط میں کتنی جازبیت ہے تم کیا جانو جی چاہتا ہے صفیہ یوں ہی باتیں کرتی رہے۔ اور میں اس کے ہونٹوں کی نازک جنبشوں کو مسلسل تکتا رہوں۔ ہر رات سوتے وقت تم میرے پاس آبیٹھتی ہو اور میں نہ جانے تم سے کیا کیا کرتا ہوں تم مگر کوئی بات نہیں کرتیں۔ اس لیے کی تم مجھ سے خفا ہو۔ نہیں نہیں میری صفیہ مجھ سے خفا نہیں ہوسکتی میں تو آج بھی اس کی گود میں سر رکھ کر سو تاہوں۔ اچھا اب تم اچھی اچھی باتیں کرو مگر ٹھہر و مجھے پیارکرنے دو۔۱۳ ؎

۶۱جنوری۱۹۴۴

تمہارا اختر ۔

جہان تک نجی یاذاتی خطوط کا تعلق ہے اِس میں کوئی شک نہیں کہ ذاتی خطوط عموماً لکھنے والے کی شخصیت اور اس کے ذاتی عقائدہ خیالات کو سمجھنے میں ہر چیز سے ذیادہ مددگار ہیں۔ نجی خطوط کی حثییت '' آپ بیتی '' ہی ہوتی ہے اس لیے ہر شخص انہیں دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ پڑھنے والا لکھنے والے کے بہت قریب ہوجاتا ہے۔ ایک بلند پایہ مصنف اپنی دوسری تصانیف میں عام لوگوں کی سطح سے بہت بلندی پر پنہچ جاتا ہے۔ مگر خطوط میں وہ اتنا نیچے اتر آتا ہے کہ قاری اسے اپنی سطح پر محسوس کرتے ہیں۔نجی خطوط یا ذاتی خطوط سے متعلق عندیب شادانی لکھتے ہیں کہ پرایؤیٹ private خطوط میں

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

مصلحتوں کے تمام پر دے اٹھ جاتے ہیں اور قلم کی زبان صحیح مضوں میں دل کی ترجمان بن جاتی ہے مثال کے طورپر علامہ شبلی نعمانی کے وہ خطوط پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جو انہوں نے زہرہ بیگم صاحبِ اور عطیہ کے نام تحریر فرمائے۔ ان خطوط میں موصوف نے تعلیم نسواں پر اوردوسرے معاشرتی مسائل کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی دوسری تصنیف میں نہیں ملتے۔

مکتوب نگاری پر جب ایک ادبی صنف کی حیثیت سے گفتگو کی جاتی ہے تو اس کی ہیت کا مسئلہ بھی سامنیآتاہے۔ کیوں کہ اصناف ادب کی درجہ بندی میں دو چیزیں نہیں نظر آتی ہیں۔ موضوع و ہیت پر زور دیا جاتاہے۔ خط لکھتے وقت خط نگار کو موضوع اور ہیت دونوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

ڈاکڑ نسرین ممتاز بصیر رقمطرزہیں

"ادب میں انہیں خطوط کو صنف کی حثییت سے قبول کیا گیاہے جن میں فطری گفتگو کا انداز اپنے تمام دلچسپ پہلووں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ یعنی خط لکھنے والا اپنے مخاطب کے ساتھ با تیں کرتا ہوا نظر آے اور یہ بھی ممکن ہے جب خط میں غیر ضروری تغع وبناوٹ کو دخل نہ ہو؟ "۴۱ے

خط کی بنیادی صفت اس کا اختصار ہے اس کی طوالت کی نقط نظر سے عیب سمجھا جاتا ہے کیوں کہ خط نگاری اپنے ادبی حسن کے لحاظ سے ایک نہایت ہی نازک فن ہے جہاں غیرضروری تکلف اور بناوٹ کی گنجائش نہیں۔ خط جو کچھ بھی تحریر کیا جائے وہ بے ساختہ اور برجستہ ہونا چا ہے۔ اس لیے خط کے لیے کہا جاتا ہے لکھا نہیں جاتا خط کچھ محاسن بھی رکھتے ہیں۔

مشلاًدلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں کیونکہ ان میں رازداری ہوتی ہے اور انسانی فطرت ہے کہ وہ راز جانے کے لیے بے قرار رہتا ہے خط جز میں کل کا نظارہ کرانے کا نام ہے۔ خط اگر شائع کرانے کے خیال سے یہ لکھا جائے تو مکتوب نگاری کی شخصیت کا آ ئینہ دار ہوتا ہے۔ یعنی خط کے مضامین وہی ہیں جو انسان کی زندگی کے موضوعات ہیں لیکن موضوع اور اسلوب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کچھ باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے جس سے خط قاری کی دلچسپی کا باعث بن سکے۔

ارتقاء وآغازاُردوخطوط نگاری کا

ابتداء میں فارسی مکتوب نگاری درباروں کی حد تک محدود ر ہی کم و بیش سارا فارسی انشائی ادب معنوعیت اور بے جا آرائش کا دفتر بن گیا۔ ہندوستان میں

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

فارسی مکتوب نگاری شاہی دربار تک محدود رہی چونکہ یہ خطوط پرْ تکلف اور شاہی انداز میں لکھے جاتے تھے اس کے باوجود فارسی مکتوب نگاری کے کئی مجموعہ دستیاب ہوے ہیں۔ یہ مجموعہ فارسی ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں امیرخسرو کا فن انشاء ضائع، بدائع پر تھا البتہ ابوالفصل نے خط نگاری کو ایک جداگا نہ انداز سے آشنا کیا۔ جو بناوٹ سے پاک تھا۔ لیکن پیچیدہ تھا اسی لیے ابولفصل کو فارسی خطوط نگاری میں سب سے اونچا درجہ حاصل ہے شاہی کاتبوں اور منشیوں کے یہ رقعات اور مکتوبات اور انتظامی امور کے تحت وجود میں آئے۔ اسی لیے ان میں جذباتی کیفت نہیں ہے۔ مگر ان مکتوبات اور رقعات میں زبان اور قواعد کی پابندیوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔فارسی میں خطوط نو یسی کو رسمی اور کاربـاری مقاصد کے علاوہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے ۔صوفیاء کرام اپنے مرشدین کی اصلاح ہدایت کے لیے خطوط لکھتے ۔ جن میں فلسفہ و تصوف کی تشریح و تفسیر بیانی کی گئی ہے۔

ستراویں اور اٹھارویں صدی میں مکتوبات کے کئی مجموعے وجود میں آگئے تھے۔ تبلیغی، تاریخی اور سیاسی قدو قیمت کے علاوہ ان خطوط کا ادبی رتبہ بہت بلند ہے مگر ان رقعات اور مکتوبات کا رحجان مشکل پسندی کی طرف تھا۔اس لیے بہت مختصر حلقہ میں اس کی پذیرائی ہوئی۔ درباروں میں خطوط نوسیی کے مقابلوں کی رسم نے زور پکڑا تو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور شاہی لطف و کرم کی خواہش نے اس فن کو عظیت بخشی کاتبوں اور مینوں نے عبارت آرائی کے وہ جوہر دکھائے کہ رقعہ انشاء پردازی کا نمونہ بن گیا۔زبان بیان، خیال، عبارت اور مضامین کی جدّت پسندی نے ان مکاتیب کو ادبی وقار بخشا ۔ ایک عرصہ دراز تک خطوط نگاری میں القاب و آداب کی طوالِت شاہی تکلفات کا اثر فارسی مکاتیب پر غالب رہا۔ ان مکتوباتی اسلوب کو محمد شاہی روش کہا جاسکتا ہے۔

مئی ۱۸۰۰ ء میں جب فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا اور ڈا کٹر گل کرسٹ کو پرنسپل مقدر کیا گیا۔ جان گلکرسٹ کا نام اردو ادب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ حالانکہ گلکرسٹ کی جتنی تصنیفن اور خطوط منظر عام پر آئے ہیں وہ سب انگریزی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن محمد عتیق صدیقی صاحب نے گل کریسٹ کے لکھے خطوط کا اردو ترجمہ پش کیا جارہا ہے۔

جان گلاکرسٹ ۱۷۸۲ء میں ہندوستان آئے جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں کیا۔

” ۱۷۲۸ء میں بمبئی وارد ہوتے ہی میں نے محسوس کرلیا تھا کہ میرا قیام خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو اس وقت تک نہ تو میرے ہی لیے خوشگوار ہوسکتا ہے اور نہ میرے آقاوں ہی کے حق میں مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دست گاہ میں نہ حاصل کرلوں جہاں عارضی طورپر مجھے قیام کرتاہے چنانچہ اُس زبان کو جیسے اس زمانے میں مورس کہتے ہیں سیکھنے کے لیے میں جم کر بیٹھ گیا۔“ ۱۵ے

گلکرسٹکی تصنیف و تالیف کے دور کا آغاز ۱۷۸۵ء سے ہوتا ہے۔ فتح گڑھ میں دو سال قیام کرنے کے بعد گلکرسٹ نے ہندوستانی زبان میں پوری دست گاہ حاصل کرلی۔ اور اس زبان کے قواعد و لغت مرتب کرنے کا اِرادہ کرلیا۔

اس سلسلے کا ایک خط ملتا ہے جو ۲ جنوری ۱۷۸۵ء کو لکھا گیا تھا۔ جس میں گل کرسٹ نے لکھا ہے۔

ہندوستان کے دوران قیام اپنا بیش تر وقت میں نہ ہندوستان زبان کی تحصیل میں صرف کیا ہے۔ اور اس زبان میں اب اتنی دست گاہ حامل کرلی ہے کہ اس کے قواعد اور لغت مرتب کرنے کا کام میں نے اس پیمانہ پر شروع کیا ہے۔ کہ اب تک کسی اور نے اتنے وسیع پیمانے پر یہ کام نہیں کیا ہے۔ ۱۶ے

اور اس خط سے یہ ظاہر ہوتاہے کہ وہ ہندوستان زبان پر کافی مہارت حاصل کرچکے تھے۔ اور بڑے پیمانے پر قواعداور لغت کا کام شروع کیا۔ زبان کے قواعد و لغت کی تدوین کے سلسلے میں گل کرسٹ نے ایک علمی مہم شروع کی اسی کتاب کا مواد فراہم کرنے کے لیے اس نے فیض آباد، الہ آباد، جونپور کا سفر کیا۔ اس کام میں انہیں بہت دشواروں کا سامنا کرنا پڑا۔

بالآخر ان کی یہ درخواست منظور کرئی گی۔ہمیں یہاں جان گل کرسٹ کے اُن خطوط کا ذکر کرنا ہے جو انھوں نے انگریزی زبان میں لکھے تھے۔ اسی سلسلے کی پہلی کڑی مندرجہ بالا خط ہے جو انھوں نے ۱۸۸۵ ء میں لکھاتھااپنی تصنف لغت کے سلسلے میں گل کرسٹ کا پہلا جو ہم کو ملتا ہے وہ نومبر ۱۷۸۶ء کا ہے۔

انراپیل بورڈ گوانر جنرل باجلاس کونسل کی ہمت افزائی کی بدولت جس جامع کتاب کی” ترتیب و تالیف میں کیا ایک مدت سے لگا ہوں آج اس کا پہلا نمبر آپ کی خدمت میں پیش کرنے فخر حاصل کررہاہوں۔ جناب عالی اور کونسل کی نظروں میں میری محنت و کاوش کے یہ نتائج اگر سود مند ہوں تو سابقہ علمی کارناموں کی طرح حکومت اس کی سرپرستی بھی قبول فرمائے“۔ ۱۷ے

جون ۱۷۸۷ء تک گل کرسٹ کلکتے میں مقیم رہے اور اپنی محنت و کاوش سے لغت (انگریزی ہندوستانی) کامسودا تیار کرچکے ۴ جون ۱۷۸۴ ء کو گورنر جنرل بااجلاس کو نسل کے نام ایک خط لکھا۔ اُن کے خط سے اس بات کا انداز ہوتا ہے کہ انھیں لغت کو مرتب کرنے کے لیے کتنی محنت و مشقت کرنی پڑی اور اس کو مکمل کرنے کے لیے نیل کی کاشت کی اجازات مانگی۔ نیل ایک اسی کاشت ہے جس کے پتوں کو نچوڑ کر نیلا رنگ بنایا جاتا تھا۔ ابتدائی دور میں نیل کی کاشت کو کامیابی ملی۔ اور جان گل کو لکھا ہے۔ Banyne colyin کرسٹ نے کلکتے کے اجنٹ

سرکاری اشتہار کے مطابق پانچ سو من نیل مہیا کریں گے اس سلسلے میں مندرجہ بالا حضرات ہی کو ہم ضامن کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ۱۸ ؎

اسی طرح سے گل کرسٹ نے اپنے خطوط کے ذریعہ ایک ہدایت لکھ بھیجی جس پابندی سے اس کتاب کا پہلا حصّہروانہ کیا گیا اسی پابندی کے ساتھ دوسرا حصہً بھی روانہ کردیا جائے۔ لہذا گل کرسٹ جب ہندوستان آیا تب وہ ہندوستان زبان کا طلب علم تھا ۔ پھر مصنف اور معلم بنا گیا۔ پھر اس نے ۲۰ جنوری ۱۸۰۱ء میں ہندوستان شعبے کے لیے خود کتابیں چھپانے کی تجویز کالج کونسل کے سامنے رکھی۔ جان گل کرسٹ کی مندرجہ بالا تجویز کو کالج نے منظوری دے دی اور جان گل کرسٹ نے ہندوستان پریس کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان زبان سکھانے والے طلباء کی تعداد کو دیکھتے ہوئے۔ ویلزی نے ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو فوٹ ولیم کالج کا قیام کیا۔ کالج میں معلموں کے تقرر ہوئے ہندوستان کے کونے کونے سے ان کو بلانے کے لیے خطوط کا سہارا لیا گیا۔

کالج کونسل کی کاروائیوں میں گل کرسٹ کی دو تحریریں محفوظ ہے یعنی دو خطوط ہیں جو ۱۸۰۳ء میں لکھے گئے ہیں۔ کالج کی ملازمت سے استفعی دینے کے بعد کا لج کونسل کو کرسٹ نے جو خط لکھا وہ ۲۳ فروری ۱۸۰۴ء کا ہے لیکن تاریخی حیثیت سے ۱۲ جنوری کا خط بہت اہمیت رکھتا ہے جس میں جان گل کرسٹ نے اپنے خیال کو ظاہر کرتے ہوئے کالج کونسل کو لکھا تھا۔ وہ دو تحریریں آخری خطوط ہے جو جان گل کرسٹ کے لکھے۔ اور ۱۸۰۴ ء میں شاید علالت کی وجہسے یورپ واپس جانے کا فصلہ کیا اور ملازمت سے استفعی دینے کے لیے کالج کونسل کو ایک خط لکھا اور اپنا استفعی کی وجہہ بتائی۔ اس طرح مسٹرگل کرسٹ کے جوش اور خروش اور ان کی انتہات محنت قابلیت کی وجہہ سے اُردو کو ترقی کی راہیں ملی۔

مسٹر گل کرسٹ فورٹ ولیم کالج کے منتظم اعلی تھے اور انھوں نے اردو کی ترقی کے لیے بے انتہا کوشش کی انھوں نے اُردو زبان کی ترقی کے لیے اہل قلم ان گینت حضرات کو جمع کرکے فارسی، عربی اور سنسکرت کے بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ اس کے علاوہ اور دوسری زبانوں کے شہ پارے اُردو زبان میں ترجمہ کئے گئے۔ چونکہ اُردو ہندوستان کی دوسری بولیوں سے مل کر بنی تھی۔ اس لیے اس شعبہ کو اُنھوں نے ہندوستانی شعبہ کا نام دیا اور اُردو زبان ہندوستانی زبان کہلانے لگی۔

بعض نقادوں کا ماننا ہے کہ ان سب کے پیچھے زبان کو ترقی دینے کا مقصد نہیں ھیکہ اس میں انھیں اپنا مفاد نظر آتا تھا اور یہی نہیں بلکہ فورٹ ولیم کالج قا ئم کرنے کا مقصد ہی روپیہ پیسہ اور کامیابی و کامرانی حاصل کرناتھا۔ لہذا مقصد جو بھی ہو لیکن ڈاکڑ جان گل کرسٹ نے ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان فارسی کی جگہ اُردو کو ہندوستانی زبان کا ردجہ دیا۔ جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اسے قومی درجہ دیا گیا تھا۔

دلی ؔ کا کالج ورنٹیکل ٹرا نسلیشن سوسائٹی کا کردار بھی اہم ہے یہ سوسائٹی ۱۸۴۳ء میں دلی میں قاہم ہوئی سوسائٹیسے نہ صرف موتی نقل دہلوی کا ترجمہ تذکرہ شعراء شائع ہو بلکہ موتی لعل نے دوسرے رسالے بھی تصنف کئے۔ اس سوسائٹی نے ہندوستان طالب علموں کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کیں۔فورٹ ولیم کالج ، دلی کالج اور ورنکلر ٹرانسلین سوسائٹی کی خدمات اپنی جگہ مسلم ہیں انھوں نے ارو و نثرکے جدید آہنگ کے لیے فضا ہموار کردی اور اسطرح نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ سادگی کاجو اندزا مقبول ہوا اس کا ایک سبب اخبار وں اور رسائل کی اشاعت بھی رہا جس کے نتیجے میں عوام کو ایک قربت حاصل ہوئی۔۱۸۰۴ ء کہ میں جام جہاں نما اشاعت عمل میں آئی۔

" فورٹ ولیم کالج نے اگرچہ جدید اُردو نثر کی ابتداء کی تھی لیکن اس کی مطبوعات اخلاقیات تاریخ داستان لغت اورصرف نحو تک ہی محدود تھی۔ دلی کا لج و رنٹیکل ٹرا نسلیشن سوسائٹی کے اپنے ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اپنے ترجموں کے ذریعہ پہلی با ہندوستانی ذہن کو مغربی فکر اور مغربی ادب سے آشنا کیا۔" ۱۹ـ

دہلی کالج دہلی میں نواب غازی الدین حیدر کا مدرسہ اجمیری دروازے کے باہر بنا ہوا تھا۔ یہ مدرسہ ۱۷۹۲ ء میں قائم ہوا۔ اس وقت ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوچکا تھا۔ ہر طرف سیاسی انتشار تھا۔ اس سیاسی بدحالی کے دور میں تعلیم کی حالت بہت بتر تھی۔ چنانچہ دہلی میں ۱۸۱۳ ء میں انگریزی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا گیا اس کے لیے ایک لاکھ رقم منظور ہوئی لیکن دس برس تک ایک پیسہ

بھی خرچ نہیں ہوا۔ بالآخر ۱۸۲۳ ؁ ء کو ایک جنرل تعلیمی کمیٹی کو یہ رقم سپرد کردی گی اس کمیٹی کے سکریڑی تھے ڈاکڑ ولسن جو سنکرت کے عالم اور مشرقی علوم کے ماہر تھے۔ اس کمیٹی نے انگریزی اقتدار کے اصولوں میں تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیا اور اس مدرسے کا نام دہلی کالج کے نام سے مشہور ہو ا اس کے پہلے پرنسپل مسٹر ٹیلر تھے۔ کالج میں عربی، فارسی اور ا ُردو پڑھانے کے لیے مولوی رکھے گئے ان کی تنخواہ بھی مقرر ہوتی۔ طلبہ کے لیے وظیفے بھی دیے گئے۔

۱۸۲۸ ء میں انگریزی کا شعبہ بھی کھل گیا۔ انگریزوں کا بنیادی مقصد تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی اور مغربی علومسے روشناش کرایا جائے۔ مسڑ ٹیلر ۱۸۴۱ء تک پرنسپل رہے بعد میں فیلکس بوترو پرنسپل بنے۔ انہوں نے اردو اور انگریزی کے شعبوں کو ملا کر ایک کردیا اس کے بعد ڈاکٹر الواس اسپرنگر پرنسپل بنے۔ جب ۱۸۵۰ ء میں مسڑ کارگل پرنسپل بنے تو انہوں نے تعلیمی نصاب کی اصلاح کے کام سے دلچسپی لینی شروع کی۔ ۱۸۵۴ ؁ ء میں ٹیلر صاحب پھر سے پرنسپل بنے۔ ۱۸۵۷ ؁ ء میں ٹیلر صاحب کا انتقال ہوا اور یہ کالج مئی ۱۸۵۷ ؁ ء کو پھر بند ہو گیا اور سات برس بند رہا اور اب یہ کالج چاندی چوک پر منتقل کردیا گیا۔ مسٹر یڈ منڈو لموت اس کے پرنسپل تھے وہ ۱۸۶۸ ؁ ء تک رہے ۱۸۷۷ ؁ ء میں پھر کالج بند کردیا گیا۔ اور یہاں کے طالب علم اور استاد کو لاہور بھیج دیا گے۔

اس کالج کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعہ مغربی سا ئنس ریاضی اور فلاسفی وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ یہ شمالی ہند کا سب سے پہلا ادارہ تھا جس میں مشرق اور مغرب کے صحت مند عناصر موجود تھے اس کالج کی وجہہ سے اردو زبان و ادب کی ایک شان دار روایت قا ئم ہے نثر کے سلسلے میں دبستان دہلی کا ذکر غالبؔ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ غا لب ؔکی نثر ذیادہ تر ان کے خطوط پر مشتمل ہے۔

خطوط کتنے ہی ذاتی کیوں نہ ہو اور موضوع کے اعتبار سے کتنے ہی محدود کیو ں نہ ہو ایک اچھا مکتوب نگار کا قلم مکاتیب میں آ پسی رنگینی پیدا کردیتاہے۔ کامیاب خطوط میں ہر عہد اور کرہّ ارض کے حصے کے لوگوں کے ذوق کی تشفی کا سامان مل جاتا ہے۔ ہر عہد کے انسان کا تعلق اپنے عہد کے تخلیقی دور سے قائم رہتا ہے۔ ہر عہد کے انسان کے لیے کئی ماخذ ہیں لیکن ۱۸۵۷ ؁ ء کے انقلاب کی جو تصویر غالبؔ نے پیش کی تھی اس کو سمجھنے کے لیے ان لوگوں کا ردعمل کیا تھا جو اس انقلاب کے ذمہ دار تھے وہ لوگ کیا سو نچتے تھے جن پر ان واقعات کا اثر ہوا تھا جسے کہ ایک شاعر کے ذہین میں دل میں دہلی کی تباہی و بربادی کا ایسا

اثر ہواکہ اس شاعر کا قلب کسی طرح متاثر ہوا یہ معلوم کرنا ہے تو کسی تاریخی کتاب کے بجائے غالبؔ کے خطوط کا ہی مطالہ کرنا ہوگا۔

۱۸۵۷ ؁ ء کے واقعہ انقلاب سے ملک کی اجتماعی زندگی پر جو اثرات ہوئے انقلاب کے اساب واقعات تاریخ کا ایک اہم حصہؔ ہیں۔ غالبؔ کو بھی انقلاب کا سامنا کرنا پڑا ان کی زندگی بھی متاثر ہوئی وہ انھیں شہر دہلی سے نکلنے پرمجبور کردیا۔ غالبؔ نے اپنے بعض خطوط میں ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ۔

"میں جس شہر میں ہوں اس کا نام دہلی ہے اور اس محلے کا نا م بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈ نے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہرکے ہیں۔" ۲۰ ؎

غالبؔ بے اپنے خطوط میں بیان کرہ حالات واقعات کی تصدیق دوسرے ذریعے سے کیے لیکن ان کی تاریخ حیثیت متعین کی جاسکتی ہے۔ انقلاب ۱۸۷۵ ؁ ء کے بعد جو سیاسی تبدیلی رونما ہوئی

غالبؔ اس تبدیلی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حضرت یہاں دو چیزیں مشہور ہیں ان میں آپ سے تصدیق چاہتاہوں۔ ایک تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آگرہ میں اشتہار جاری ہوگیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ڈھاچہ ٹوٹ گیااور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہوگیا دوسری خبریہ کی جناب اڈمنسٹن صاحب بہادر گورنمٹ کلکتہ کے چیف سیکرتر اکبر آباد کے لیفٹنٹ گور یز ہوگے خبریں دونوں اچھی ہیں خدا کرئے سچ ہوں۔" ۱۲ ؎

اودھ بیگمات کا نام ان کے خطوط کی وجہہ سے ہی زندہ ہے اسی طرح غلام غوث بے خبر کا نام مکتوب نگار کی حیثیتسے زندہ ہیں اگر وہ غالبؔ کو خطوط نہ لکھتے تو تاریخ ادب اردو میں ان کا نام غالب کے مکتوب الیہ کی حیثیت سے نہ آتا۔خطوط نگاری مہذب سماج کا ایک اہم فن ہے اس فن سے نہ صرف انسان سے محبت کا رشتہ برقرار رہتا ہے ۔

"خط اپنی بنیادی غرض و افادیت کے اعتبار سے ایک کاروباری چیز ہے یہ ایک مادی ذریعہ ہے نظام تمدّن کا جیسے مثلاً تار ٹیلی فون وغیرہ وغیرہ۔ مگر ذہین انسانی نے اس کو تہذیب وتکمیل کے اس درجے پر پنہچا دیا ہے کہ ایک مستقل فن بھی بن کیا ہے۔" ۲۲ ؎

قرۃ العین حیدر کے خیال سے۔

"دور حاضر کی ٹیکنالوجی نے خطوط نوسی کلچر کو تقر یباً ختم کردیا ہے اس اعتبار سے آئندہ صدیوں میں ہمارے مراسلے بھی قدیم لا شعوری الواع کی مانند عجا ئبا ت میں شمار کئے جایں گے۔ برٹش میو زیم میں پتھروں پر کندہ مراسلے موجودہ ہیں وہ بھی آپ اور ہم جیسے انسانوں نے ہی لکھے ہوں گے جب سے اب تک اس کا وجود ایک آن واحد ہے۔" ۲۳ ء

بہر غال قرۃ العین حیدر نے بھی اس تعلق سے اپنا خیال پیش کیا ہے کہ جدید دور کی ٹیکنالوجی نے خطوط نویسی کو ختم کردیا لیکن عجائبات میں موجود پتھروں پر کندہ جومراسلے ہیں وہ انسانوں کے لکھے ہوئے ہیں جو آج بھی خطوط کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

۱۔	غالب کے خطوط (جلدسوم)	۔ڈاکٹرخلیق انجم	ص ۴۵۰۱
۲۔	مکاتیب مہدی	۔ مہدی بیگم	ص۴
۳۔	عود ہندی	۔ مرزا غا لبؔ	ص۴۸
۴۔	مکتوب نگاری کا فن	۔ڈاکڑ شاداب تبسم	ص ۹۱

۵۔ تنقیدی اشارے ۔ پروفیسر آل احمد سرور ص۳۶
۶۔ خطوط غالبؔ ۔ڈاکٹر خلیق انجم ص ۱۳۱
۷۔ مکتوبات حالیؔ ۔ خواجہ سجاد حسین ص ۵۱
۸۔ ادبی خطوط غالبؔ ۔ مرزامحمد عسکری ص۰۱
۹۔ میرامن سے عبدالحق تک ۔ سیدّ عبداللہ ص ۷۷۳
۰۱۔ غالب کے خطوط (جلد اوّل) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۷۵۱، ۸۵۱
۱۱۔ محیط اردو ۔ عرفان الحق ص۲۰۰
۱۲۔ منتخب ادبی خطوط غالبؔ ۔ مغیث الدین فریدی ص ۹۲
۱۳۔ خاموش آواز ۔جانثار اختر ص ۵
۱۴۔ اردو خطوط نگاری ایک مطالعہ ۔نسرین ممتاز لصبہ ص۶۱
۱۵۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ۔ محمد عتیق صدیقی ص ۱۴،۰۴
۱۶۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ۔ محمد عتیق صدیقی ص۳۴
۱۷۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ۔ محمد عتیق صدیقی ص۹۴
۱۸۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ۔ محمد عتیق صدیقی ص۵۵
۱۹۔ خطوط غالبؔ (جلد اوّل) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۷۰۱ ، ۸۰۱
۲۰۔ خطوط غالبؔ (جلد اوّل) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۶۲
۲۱۔ خطوط غالبؔ (جلددوم) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۴۰۷
۲۲۔ وجہی سے عبدالحق تک ۔سیدعبداللہ ص ۳۱۵
۲۳۔ دامانِ باغباں۔ پیش لفظ ۔قراۃالعین حیدر ص ۱۲

باب دوّم

اُردو میں خطوط نگاری کی روایت

پندرھویں صدی کے ابتدائی عرصے میں ہی اُردو نثر سے متعلق کچھ نمونے دستیاب ہوئے ہیں جو داستانوں اور کچھ مذہب اور اخلاقیات مو ضوعاتی کتابوں کی شکل میں موجود ہیں۔اُردو زبان کا یہ نثری سرمایہ فارسی سے ترجمہ کیا ہواماخوذ ہے۔

ہندوستان میں صدیوں تک فارسی زبان سرکاری اور ادبی مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔فارسی زبان ایک طاقتور مرکزی حکومت کی زبان تھی اِسی خصو صیت کے سبب اعلیٰ طبقے کے لکھنے پڑھنے کی زبان فارسی ہوا کرتی تھی۔سرکاری اور ادبی مقاصد کے لیے فارسی زبان کے استعمال سے مقامی زبانوں کو زیادہ پنپنے کا موقع نہیں ملا لیکن صوفیوں اورسنتوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے مقامی زبان کا استعمال کیا جو مخصوص طبقے تک ہی محدود رہا۔ہندوستان میں مرکزی حکومت کا زوال شروع ہوتے ہی، مقامی زبانوں کو ترقی ملی ،جن میں اُردو زبان بھی تھی اِس لیے اُردو زبان کوفارسی زبان سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا۔ایک طویل عرصے تک فارسی زبان کودفتری زبان کی حیثیت حاصل رہی جس کی وجہ سے اُردوخطوط میں فارسی زبان کے اسالیب نظر آتے ہیں۔ اُردو کے شعرا ء بھی فارسی ہی میں خط لکھا کرتے تھے۔ اُردو مکتوب نگاری ،فارسی مکتوب کے زیر اثر پروان چڑھی اس لیے اُردو خطوط میں فارسی مکتوب نگاری کی روایت موجود ہے۔

اٹھارویں صدی کے آخرمیں انگریزی زبان نے ہندوستان کے لسانیات میں اپنے وجود کا احساس دِلانا شروع کیا۔ یورپ کے مختلف تجارتی کمپنیو ں نے ہندوستان کی عوام سے تعلقات قائم کرنے کی غرض سے اُردو سیکھنی شروع کی اور اُردو کی لغت اور قواعدکی کتابیں تیار کی گئی تا کہ انہیں اُردو زبان سیکھنے میں آسانی ہو۔

انیسوی صدی کے وسط میں جب فارسی زبان کمزور ہوتی گئی تب اُردو زبان نے اس کی تلافی کی اور اُردو میں مراسلت کا رِواج بڑھتا گیا۔ اِس لیے اُردو خطو نگاری کا اولین دور فارسی انداز تحریر سے متاثر رہا۔ اِس دور میں دیگر اصناف کی طرح مکتوباتی ادب میں بھی تبدیلی ہوئی۔ ادب کی یہ تبدیلی نہ صرف سماجی ، سیاسی اور معاشرتی حالات کہ نتیجہ تھی بلکہ ادبی شعور کے نئے انداز طرز کی ترجمانی بھی کررہی تھی۔

نصف انیسویں صدی کے ہندوستان میں انقلاب کا ماحول پیدا ہورہا تھا جس کے اثرات زندگی کے ہر شعبۂ اور زبان و ادب پر پڑے جس کی وجہہ سے اُردو نثر میں جدید طرز تحریر کا نیا انداز پیدا ہوا۔لوگوں کے ذہن فارسی زبان سے ہٹکراُردو نثر کی طرف متوجہ ہوئے اور یہی سے جدیدمکتوب نگاری کا آغاز بھی ہوا۔

انگریزی افسروں کو ہندوستانی زبان سیکھنے کی غرض سے جولائی ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیاجس کی وجہہ سے اُردو نثر کے لیے نئے راستے ہموار ہوئے، اور فارسی کتابوں کااُردو میں ترجمہ ہوا۔اُردو۔ نثر کے ترقی میں فورٹ ولیم

کالج کا کردار اہم ہیں۔ کچھ عرصے بعد ۱۸۴۳ ؁ء میں دلّی کالج ورنیکلرٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام ہوا۔ اس سوسائٹی نے

ہندوستانی طالب علموں کیلے نصاب کی کتابیں تیار کیں،اور مغربی ادب سے بھی روشناس کروایا۔اُردو نثر میں سادگی اور جدّت پسندی کا آغاز ہواجس کی وجہہ سے اخبار اور رسالوں کی اشاعت ہوئی۔ جس کے نتیجے میں عوام اُردو نثر سے قربت حاصل ہوئی۔

محکمہ ڈاک کے قیام نے خطوط نگاری کو ترقی کے مواقع فراہم کیے۔چنانچہ کئی مرحلوں سے گزرنے کے بعد مکتوب نگاری اُردو نثر میں داخل ہوگئی۔مکتوب نگاری کے فن کو فروغ ملتا گیا اور کئی اُردو مکتوب نگار منظرے عام پر آئے، جن میں مرزا قتیل، غلام غوثؔ بے خبر، رجب علی بیگ سرور، نواب وجد علی شاہ، اور مرزا غالب ہیں۔

انیسویں صدی میں مکتوب نگاری میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی نظر آئی ہیں۔ سادگی و سلاست اور جدّتَ جدید نثر کے اثرات مکتوب نگاری پر نظر آئے۔جدید مکتوب نگاری بے تکلفی اور مکالمے سے قریب ترہوگئی۔یہی وجہہ ہے کہ اس وقت مرا سلہ کو مکالمہ بنانے کا دعوی مرزا غالب کے علاوہ دیگر مکتوب نگاروں نے کیا۔

بقول مرزا غالب

میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے ہزاروں کو س بیٹھے بے زبان قلم سے باتیں کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔‘‘ ۱

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہے۔

مرزا غالبؔ نے اُردو میں خط لکھنے شروع کئے ان کے سامنے نثر نگاری کے دو انداز موجود تھے۔ ایک وہ پرتکلف انداز جو فارسی انشاء پردازی کے تتبع میں اُردو میں رواج پاچکا تھا۔ دوسرا سادہ طریقہ جس کو فوٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں نے رائج کیا۔“ ۲؎

علمی اور ادبی شخصیاتوں کا تنقیدی یا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں ان کے تحریروں تک رسائی کرنی ہوگی جو خطوط کے شکل میں لکھی گئی ہے۔ساتھ ہی ساتھ شاعر اور ادیب کے ذہنی محرکات کو سمجھنے کے لیے بھی ان کے خطوط کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔کیونکہ خطوط ہی واحد ذریعہ ہیں جن سے کسی انسان کی شخصیت کے بعض ایسے گوشوں کو دیکھا جاسکتا ہے جو دوسروں کے سامنے نہیں

ہوتے ہیں۔ابتدائی عہد سے حاضر تک کے خطوط اگر اپنی بدلتی ہوئی صورتوں کے ساتھ دستیاب

ہوجائیں تو ان خطوط کی روشنی میں ان کے لکھنے والوں کی شخصیت اور ہر عہد میں لسانیاتی نقط نظر سے زبان میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اس سے بھی واقفیت حاصل ہوسکتی ہے۔اُردو کے پہلے مکتوب نگار کے بارے میں احسن مارہروی کاخیال ہے کہ۔

بیشتر محققین کی قدیم سے قدیم تر اُردو خطوط کی دریافت کی سعی مشکور کے باوصف عام طورپر یہ رجحان ملتا ہے کہ مرزا غالب اُردو کے سب سے پہلے مکتوب نگار ہیں۔" ۳ ؎

۱۸۴۷؁ء غالب کا قدیم ترین خط دستیاب ہے۔ لیکن حامدحسن قادری نے '' انشائے بے خبر '' میں لکھا ہے کہ غالب سے قبل غلام غوث بے خبر ؔ نے ۱۸۴۰ ؁ء میں خطوط لکھنے شروع کیے۔اس بات کا پتہ حامد حسن قادری کے بیان سے ہوا ہے۔

"بے خیر نے اُردو میں نثر نگاری و خطوط کی طرف ۶۴۸۱ء میں توجہ کی یعنی غالبؔ سے کچھ پہلے" ۴ ؎

رجب علی بیگ سرورؔ ، غلام غوث بے خبر ؔ اور ،مرزا غالبؔ سے پہلے ۱۸۲۲؁ء کا ایک تحریر کردہ خط جس کو اُردو کا پہلا خط قرار دیا جاتا ہے ۔ عبدالطیف اعظمی کے تحریر کردہ مکالے سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

اس کے کاتب نواب حسام الملک بہادر ہیں۔ جو کرناٹک کے نواب دولہ جاں بہادر کے چوتھے بیٹے ہیں۔ اور مکتوب الیہ ان کی بڑی بھاوج نواب بیگم صاحبہ ہیں"۔ ۵ ؎

کافی عرصے تک ۱۸۲۲؁ء کاخط جو نواب حسام الملک بہادرنے لکھا تھا وہ تاریخ میں اولیت کا درجہ رکھتا تھا لیکن مرزا محمدقتیلؔ کے خطوط منظر عام پر آنے کے بعد معلوم ہوا کہ مرزا قتیل نے ۱۸۱۷؁ء سے قبل اُردو میں خط لکھنا شروع کردیاتھا۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ان کے شاگرد خواجہ امام الدین نے '' معدن الفوائد '' کے عنوان سے ۱۸۱۷ء میں شائع کیے۔

ابتدائی دور کے اُردو مکتوب نگاروں کے خطوط کا مطالعہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ زبان میں جو عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا اندازہ ہوسکے۔خطوط نہ صرف انسان کی شخصیت کا آئینہ بلکہ ملک کی تہذیب و معاشرت، ثقافتی اقدار اور سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ لسانی نقطہ نظر سے زبانوں میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان سے بھی روشناس ہوسکے۔اس دور کے مکتوب نگاروں اور مکاتیب کے مجموعوں کی

تعداد طویل ہے لیکن ان میں کچھ ایسے مکتوب نگار ہیں جن کی مکتوب نگاری کا مطالعہ ضروری ہیں جن کے مکتوب نگاری میں ابتدائی نقوش شامل ہیں۔اس صنف کے مکتوب نگاروں میں مرزا محمد قتیلؔ۔ غلام امام شہید، رجب علی بیگ سرور ، نواب واجد علی شاہ ، غلام غوث بے خبرؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مرزا محمد قتیلؔ۔

مرزا محمد قتیل ۱۷۸۵ ؁ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ قوم کے کھتری تھے ان کا نام دیوالی سنگھ تھا۔ مذہب تبدیل کرکے مسلمان ہوئے تو ان کا نام محمد حسن رکھا گیا، بعد میں مرزا محمد قتیلؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔مرزا قتیل فارسی شاعر و ادیب تھے ۔ مرزا محمد قتیل نے کچھ خطوط اُردو میں بھی لکھے تھے ۔ ان کے یہ اُردو خطوط کا مجموعہ ان کے شاگرد خوا جہ امداد الدین عرف خواجہ امامی نے '' معدن الفوائد '' کے نام سے ؁۱۸۱۷ء میں شائع کیا۔یہ شائع کردہ مجموعہ میں پانچ اُردو خطوط شامل ہے۔

مرزا محمد قتیل کے خطوط کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہیکہ یہ خطوط انھوں نے اُس دور میں تحریر کئے تھے جب ان کے شاگرد امدادالدین معاش کی خاطر باہر تھے۔ خطوط کی طوالت اور واقعات کا پھیلاؤ یہ ثابت کرتا ہے کہ اپنے شاگرد کی غیر حاضری میں ان کے گھر کے حالات کو تفصیل سے تحریر کیا کرتے تھے تاکہ ان کے شاگرد کو اپنے گھر سے دور ی محسوس نہ ہو۔

خواجہ احمد فاروقی نے مرزا محمد قتیل کے خط کا نمونہ '' جلوۂ خضر '' کےحوالے سے پیش کیا ہے۔ یہ خط کا نمونہ ملاخط کیجیے۔

جس کاجی چاہے ہمارے پاس آولے، گھر ہے اس کا اور کوئی آتا آتا یک بارگی رک جائے توہم کیا غرض، اگر یہ چاہے کہ ہم ساب ے لیاقت بھی کبھی کبھی آیا کرے تو یہ بات بہت مشکل ہے۔ اس واسطے کہ یہ عاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس گوشے کے بیچ اس طرح جمار ہے کہ ہزاردورہ کامل فلک ہشتم کاجس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے، سر پرسے گزرتو بھی اس جگہ سے اٹھ کر بہت جاوے تو اس دوسرے حجرے تک جاوے سو بھی دیکھا چاہیے۔" ۶؎

مرزا قتیل کے خطوط کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہیں کہ انھوں نے کچھ خطوط بغیر القاب و آداب کے لکھے ہیں۔ مرزا قتیل عام فہیم زبان میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ ان کے خطوط کو محفوظ نہیں رکھاگیا۔

غلام امام شہیدؔ۔

غلام امام شہید ۱۸۰۴ ء میں پیدا ہوئے۔غلام امام شہید کے والد کا نام شاہ غلام محمد تھا۔وہ لکھنوء کے رہنے والے تھے۔نعت گوئی کے سبب ان کو " مداح نبی " ، " عاشق رسول " کے لقب ملے۔ غلام امام شہید کے مکایب کا مجموعہ " انشائے بہار بے خزاں " سنہ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ " انشائے بہار بے خزاں " میں جو خطوط شامل ہیں وہ خط نویسی سکھانے کے لیے تصنیف کیے گئے تھے۔ یہ مجموعہ م ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ " انشائے بہار بے خزاں " میں شامل خطوط کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شہیدؔ نے اُس دور کے رِواج مقبول اور محبوب انداز میں ، القاب و آداب کی طوالت کے ساتھ ، پُر تکلف انداز میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔اس مجموعہ میں سادہ سلیس زبان میں خطوط شامل ہیں۔ مثال کے طورپر ایک خط ملا خطہ فرمائے۔

بندہ نواز، لالہ صاحب کی تعریف آپ جو کچھ لکھیں سو تھوڑی ہے یہ شخص خلق اور مروّت میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اگر چہ بندے کی حاضری کے کچھ ضرورت تھی اور موصی الیہ آپ کے فرمانے سے کبھی باہر اورقاصر نہیں ہوتا لیکن موافق ارشاد کے کل چاربجے حاضر ہوں گا اور ہمراہ رکاب چلوں گا زیادہ نیاز۔" ۷ے

" انشائے بہاربے خزاں " میں خطوط اپنے زمانے کے خاص انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہی وجہہ ہے کہ عبارت کی رنگینی ، قافیہ پیمائی اور تشبیہ و استعارات کی فراوانی ہے۔ان کے خطوط میں کہیں کہیں اُردو کے اشعار بھی استعمال کیے گئے ہے جو مکتوب الیہ کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہے۔حالانکہ غلام امام شہید ؔکو مکتوب نگاری کے رجحان مشکل پسندی اور انشاپردازی کے علم برداروں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن ان کا مجموعہ " انشائے بہار بے خزاں " میں مکتوبات سادہ سلیس زبان میں بھی لکھے گئے ہیں۔اس لیے اُردو مکتوب نگاری میں غلام امام شہید کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔اور ان کے خطوط کو اُردو مکتوب نگاری کے ابتدائی نقوش میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

نواب واجد علی شاہ۔

نواب واجد علی شاہ سنہ۱۸۲۲ء لکھنوء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ماجد علی شاہ اور والدہ کا نام ملکہ کشور تھا۔پندرہ سال کی عمر میں ان کے شادی عالم آرا بیگم سے ہوئی۔اس کے علاوہ نواب واجد علی شاہ نے کئی نکاح کیے لیکن تاریخ کی کتابوں میں جس نکاح کی شہرت ہے وہ سنہ۱۸۵۱ء میں وزیر زادی نواب رونق آرا بیگم سے ہوا۔ واجد علی شاہ کی حکومت کو نو سال ہی ہوئے تھے کہ انگریزوں نے سنہ۱۸۵۶ء میں ان کو تخت و تاج سے محروم کرکے کلکتہ بھیج دیا جہاں انھیں اپنی باقی زندگی جلاوطنی میں گزارنی پڑی۔واجد علی شاہ کے مکاتیب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

لکھئنوانیسویں صدی میں علم و ادب کا مرکزہوا کرتا تھا۔اور واجد علی شاہ کی تصنیفات بھی مقبولیت رکھتی ہے۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط، مکتوب نگاری کے ایسے نمونے ہے جو اپنے طرز فکر کے ساتھ منفرد نثری اسلوب کو پیش کرتے ہیں۔ واجد شاہ کی بہت سی بیگمات ان کے ساتھ کلکتہ نہ جاسکیں توان کے درمیان صرف خط و کتابت کا ہی تعلق رہا۔واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کے جو مجموعہ دستیاب ہوئے ہیں ۔خواجہ احمد فاروقی نے واجد علی شاہ اور ان کے

بیگمات کے خطوط کے مجموعوں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

مخزن اسرارسلطانی معروف بہ رقعات بیگمات (قلمی)،رقعات اہلیہ واجد علی شاہ(قلمی)، تاریخ غزالہ (مطبوعہ)، تاریخ نور (قلمی)،انشار راحت روح(مطبوعہ)، تاریخ ممتاز(مطبوعہ)، تاریخ بدر (قلمی) ، رقعات بدر (مطبوعہ) اوربیگمات اودھ کے خطوط موجود ہیں۔ ۸ے

واجد علی شاہ اور بیگمات اودھ کے خطوط اُردو نثر کی نشوونما کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ان خطوط میں مقامی رنگ نہیں ہیں لیکن بعض خطوط کی نثری تحریر میں غالب کے خطوط کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہیں۔ان خطوط میں سادہ و سلیس طرز اسلوب موجود ہے۔ان کے خطوط سے متعلق خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں۔

انسان کی اصلی سیرت کا انداز ہ عیش میں نہیں۔ تکلیف میں ہوتا ہے۔ یہ خطوط چونکہ انتزاع سلطنت کے بعد لکھے گئے ہیں اس لیے جان عالم اور ان کی بیگمات کے کردار کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ مٹیابرج وہ شاہانہ کرو فرباقی نہ رہا تھا پھر اس زمانے کا زندہ لکھنوء تھا۔ اس تہذب کے اصلی خط و خال ان تحریر وں میں صاف نظر آتے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنوء کے زوال کے بعد واجد علی شاہ ان کے متعلقین اور عایا کیا گزری۔ ان کے دلوں میں جان عالم کی کتنی محبت تھی اور خودبادشاہ ان حالات سے کتنے متاثر تھے اس لیے یہ خطوط صرف ادب ہی کا بیش قمت سرمایہ نہیں، تاریخ ہندوستان کی اہم دستاویز بھی ہیں۔“ ۹ے

واجد علی شاہ اور بیگمات کے یہ خطوط مسجّع اور رنگین عبارت میں لکھے گئے ہیں۔ جس میں حب الوطنی، ملک کی بدحالی

اور حکمرانوں کے مظالم وغیرہ کی تصویریں ملتی ہے۔ لیکن اس پریشانی اور بدحالی میں بھی ان خطوط میں شگفتگی، شائستگی اور سلیقہ نظر آتا ہے۔واجد علی شاہ کو جب انگریزوں نے قید کر لیا تو اِن کے دل پر گہرا اثر ہوا۔

اس کی ر و دار وہ نواب مرزا محل کو لکھتے ہیں۔

" صبابھی ہم قیدیوں کی پیغامبری نہیں کرتی ہر طرف پہرا ہے ہر طرف یاس ہے دو رفیق ہیں۔ ایک خوف دوسرے ہر اس، ایک قید خانے میں ہم پڑے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف حراست ہے ہمارے ساتھ اٹھارہ آدمی مصیبت جھیل رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے جینے سے بیزار ہے قید غم میں گرفتار ہے۔" ۱۰ ؎

واجد علی شاہ کے اس خط کی عبارت سادہ اور سلیس ہے الفاظ بھی عام فہم استعمال کئے گئے ہیں۔ اس میں ایک قیدی کی مصیبت اور قید میں تنہائی اور خوف و ہراس کی کیفیت ملتی ہے۔ واجد علی شاہ کا تعلق ابتدائی ہی سے سرزمین لکھنو او ر اودھ سے رہا ہے اسی لیے خطوط میں لکھنو کی زبان اس کا ماحول محفلیں، وہاں کی معاشرت کی پر چھائیاں ہمیں نظرآتی ہیں۔ ان کے خطوط میں ہمیں اکثر منظر نگاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے ساتھ خوش مزاجی، حسرت مجبوری، ایک حساس، دل کی تڑپ اور کسک دکھائی دیتی ہے۔ ساتھ ساتھ زبان میں شیرنی سادگی تہذیب لکھنوء کی خصوصیت رہی ہے وہ سب کچھ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔

اگرخط و کتابت میاں بیوی کے درمیان ہوتو وہ زیادہ قابل احترام ہوتی ہے۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے ہم راز ہوتے ہیں۔ واجد علی شاہ نے اپنی بیگمات کو لکھے خطوط کو شائع کرکے جُرات کا مظاہرہ کیا ہے۔حالانکہ یہ سب خطوط محبت نامے ہیں، چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ان خطوط کی مشترکہ خصوصیت ہے ۔

خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں۔

"خط لکھنے کے لیے صرف کاغذاور قلم ہی کی نہیں خونِ جِگرکی بھی ضرورت ہوتی ہے،جان عالم اور ان کی بیگمات کے خطوں میں حسرتوں کی سرخی ہے، جذبات کی گھٹا ہے۔ ارمانوں کا سوگ ہے۔ ان میں دلی کیفیات کا اظہار ہے۔" ۱۱؎

واجد علی شاہ کے خطوط اردو ادب میں قابل قدر اضافہ سمجھے جاتے ہیں۔ان خطوط میں روز مرہ کی زندگی کے بول چال کے الفاظ،محاورات کوبڑی خوبیاں کے ساتھ استعمال کیاگیا ہے۔ حالانکہ یہ خط پریشانی اور افرتفری کے ماحول میں لکھے گئے۔ پھربھی ان میں سادگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔

واجد علی شاہ اور ان کے بیگمات کے خطوط ان کے نثرنگاری کی واحد یادگار ہیں اور ان کا مرتب ہونا بھی جُرات کا کام تھا۔ ان کے خطوط کی امتیازی خصوصیات ان کی سادگی، صاف گوئی اور مکالماتی اندازِ تحریر ہے۔ یہ خطوط لکھنوی زبان اور تہذیب، معاشرت ، سیاست اورتاریخ کے اہم دستاویزات ہیں۔

رجب علی بیگ سرورؔ۔

رجب علی بیگ سرورؔ ۱۷۸۶ء لکھنوء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی تھا۔ ان کی تربیت اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ عربی ، فارسی زبان و اداب کے علاوہ تیر اندازی ، شہہ سواری ، خوش نویسی اور موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔
سرور کا محبوب مشغلہ خط و کتابت تھا وہ ایک اچھے مکتوب نگار تھے۔سرورؔ کے مکتوبات کا مجموعہ '' انشائے سرور '' کے نام سے شائع ہوا ہے۔'' انشائے سرورؔ '' میں سرور کے مختلف انشائی رنگ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے خطوط میں بے ریائی و خلوص، سادگی وبے تکلفی کی وجہہ سے انھیں اُردو کے ابتدائی دور کے مکتوب نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔سرورؔ کے خطوط میں مکالمہ کا انداز بھی ملتا ہے ۔سرور کے خطوط میں افکار وخیالات اور خاص طورپر زمانے کی نیرنگیاں اور موت و حیات کے موضوع پر اظہار خیال ملتا ہے۔ان کی شخصیت و کردار کے بہت سے پہلو اور ان کی سوانح حیات کے ساتھ ان کے عہد کے حالات کہ بہت سے گوشے بے نقاب ہوجاتے ہیں۔سرورؔ کے خطوط میں سلاطین اکابرومشاہیر کے علاوہ ا س دور میں ہونے والے فسادات ، وبائیں و بیماریاں، سیاسی وسماجی ، غارت گری ، لکھنوء کے حالات کا بیان ملتا ہے۔سرورؔ کے خطوط کی نمایاں حصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قدیم اور جدید طرز میں خطوط لکھے۔سرور کے خطوط میں سفر کا ذکر بھی ملتا ہے۔

خواجہ غلام غوث بے خبرؔ۔

خواجہ غلام غوث ۱۸۲۴ء میں نیپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ حضور اللہ تھا۔ان عمر چار سال کی تھی جب ان کے والد بنارس منتقل ہوئے تو خواجہ غلام غوث کی تعلیم و تربیت یہی بنارس میں ہوئی۔بے خبرؔ اپنے زمانے کے نامور نثر نگار تھے۔ان کے مکتوبات کا پہلا مجموعہ '' فعان بے خبر '' کے عنوان سے ۱۸۹۱ء شائع ہوا۔اس کے علاوہ بے خبرؔ کی دیگر تصنیفات میں '' خوننابہ جگر '' ، ''رشک لعل و گوہر '' اور ''انشائے بے خبرؔ '' شامل ہیں۔

خواجہ غلام غوث بے خبرؔ کے خطوط میں میں دو اسالیب ملتے ہیں۔ پہلا قدیم اور مقفّی اور دوسرا سادہ اور سلیس۔ بے خبرؔ نے ایسے خطوط بھی لکھے ہیں جس میں انھوں نے انشاپردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔

بے خبرؔ کے خطوط کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم میں وہ خطوط آتے ہیں جو انھوں نے اپنے دوستوں اورا حباب کے نام لکھے۔ دوسری قسم کے خطوط محض نجی اور ذاتی حالات پر لکھے گئے ہیں جو بے سادگی اور تکلفی کی عمدہ مثالیں ہیں۔بے خبر کے خطوط میں فارسی اور اُردو اشعار کی شمولیت بھی تھی جس سے مکتوب الیہ کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ان کے خطوط میں بات کرنے کا طریقہ

بہت ہی خوبصورت اور دلچسپ ہے۔ان کے خطوط کے خاص پہلو یہ ہیں کہ ان کی خلیق و ملنسارطبعیت اور ہمدردی سے بھر پور شخصیت کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

بے خبرؔ کے خطوط میں مرزا غالبؔ کے رنگ کی جھلک ملتی ہے۔کیونکہ ان کے بیشتر خطوط میں سادگی اور سلاست کی وجہ سے شوق ولطیف پیدا ہوتی ہے۔ مراسلہ کو مکالمہ بنادینے کی خوبی بھی بے خبر کے خطوط میں نمایاں ہے۔اس کی مثال اس خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے حکیم محمد شفیع صفی کے نام لکھا تھا۔

"خبر یہ باتیں تو جانے دیجیے سوےّاں منگوایے یاداسے بھی افطاری کی طرح ٹالیے گا۔ معلوم ہوا آپ کچھ بھی نہ منگوائیں گے آپ کو ٹا لناخوب آتا ہے۔ لائیے عطروپان ہی عنایت کیجیے میں رخصت ہوتا ہوں۔" ۱۲ــہ

غلام غوث بے خبرؔ عمر میں غالب سے چھوٹے تھے لیکن غالبؔ کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ان کی خطوط نگاری غالب کی وفات کے بعد بھی جاری رہی۔

مرزا اسداللہ خان غالب۔

سد اللہ خان غالب عرف مرزا نو شہ تخلص غالبؔ

غالب ۲ ڈسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ، چچا مرزا نصراللہ بیگ اور دادا قوقان بیگ خان جو شاہ عالم کے عہد میں سمر قند سے دِلی آئے تھے۔جو قوم ترک سلجوتی کے نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ غالب کے والد راؤ راجہ بختاور سنگھ کے فوجی دستے میں سپہ گرِ تھے ۔الور کی ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔جب غالب کی عمر پانچ، چھ برس کی تھی وہ چچا نصراللہ بیگ کی کیفالت میں آگئے۔ چچا کے انتقال کے بعد نانا خواجہ غلام حسین بیگ کے گھر پرورش پائی۔

غالب کی والدہ عزت انساء بیگم تعلیم یا فتہ خاتون تھی غالب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی ۔ اس کے بعد کی تعلیم آگرہ کے مشہور اُستاد شیخ معظم سے حاصل کی۔ عربی کی قواعد اور اعلیٰ تعلیم فارسی میں اپنے اُستاد عبدالصمد ایرانی سے پائی اور اُس میں مہارت حاصل کی۔ غالب اپنے عمر کے گیار واں سال میں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے لگے تھے۔غالب نے پہلے اُردو شعر گوئی کا آغاز کیا اور اپنا تخلص ‘‘ اسد ’’ اختیار کیا پھر فارسی میں شعر کہنے لگے تو ‘‘ غالب ’’ تخلص اپنایا۔

غالب کی عمر ۱۴ سال کی تھی جب نواب الہی بخش خان معروف کی دختر امراؤ بیگم سے شادی ہوئی۔ ان سے سات اولادیں ہوئیں مگر سب کی شیر خواری کے زمانے

میں موت ہوگی۔ پندرہ مہینے سے زیادہ کوئی نہ جیا۔آخر غالب نے امراؤ بیگم کے بھانجے مرزا زین لعابدین عارف کو بیٹا بنالیا۔ مرزا زین العابدین سے دونوں بہت محبت کرتے تھے وہ جوانی میں مر گئے تو غالب نے ان کی موت کے بعد بہت دردناک مرثیہ لکھا۔ عارف کے دو بیٹے باقر علی خان اور حسین علی خان تھے۔ غالب اور ان کی بیگم نے حسین علی خان کو گود لے لیا اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔ وہ دہلی میں بلی ّماروں گلی قاسم جان میں کرایے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کو زندگی بھر ذاتی مکان میسرّ نہ ہوا۔

۱۸۵۰ء میں بادشاہ دہلی نے انھیں خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا تھا۔پچاس روپے ماہانہ اس کام کی تنخواّہ مقررّ ہوئی تھی۔اسی عیسوی سن ۴ جون ۱۸۵۰ء کو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ کے خطابات سے نوازہ تو غالبؔ کا نام اس طرح ہوگیا۔ بجم الدولہ دیبر الملک نظام جنگ اسداللہ بیگ غالبؔ خان عرف مرزا نوشہ۔

غالبؔ کے چچاؔ نصرواللہ بیگ لارڈ لیک کی ما تحت چارسو سواروں کے رسالدار تھے ان کو جاگیریں دی گئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد جاگیریں واپس لے کران کے متعلقین کے لیے دس ہزار روپے سالانہ رقم مقرر کردی گئی ۔ کچھ دنوں کے بعد یہ پنشن بند ہوگئی۔غالب کی زندگی پر اس کا گہرا اثر پڑا۔غالبؔ نے پنشن کی واپسی کے لیے اشدحد محنت کی اور اس کے لیے کئی سفر کئے جس کے نتیجے میں ۴ مئی ۱۸۶۰ء کو تین سال کی روکی ہوئی پیشن کی رقم ایک ساتھ مل گئی تو ان کے کئی قرض ادا ہوگے۔

غالبؔ نے نثر اور نظم میں دونوں میں طبع آزمائی کی فارسی اور اُردو زبانوں میں تصانیف لکھیں۔ نثرمیں ان کی مکتوب نگاری کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔اُردو ادب میں بہت سے مکتوب نگار وں نے مکتوب نگاری کو فروغ دیا لیکن غالب کی طرز تحریر کو کوئی اپنا نہ سکا۔غالب کے خطوط میں سادگی، پرٰکاری ،دِ لکشی اور جذبات کی عکا سّی بہترین انداز میں موجود ہے۔اسی وجہ سے ان کے خطوط ان کی خود نوشت سوانح عمری معلوم ہوتی ہے۔

غالب ؔ کے اردو خطوط کی روشنی میں ان کی خط نویسی کا آغاز مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا پھر رفتہ رفتہ فارسی خطہ نویسی میں کمی آئی اور اردو خطوط میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۸۶۱ء تک غالبؔ نے فارسی میں خطوط لِکھنے ترک کردیئے۔ مولوی لغمان احمد کے نام ایک خط میں غالبؔ نے فارسی چھوڑ کر اُردو میں خط لکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھاہے۔

برسوں سے فارسی میں خطوط لکھنا چھوڑدیے ہیں سب شہزادہ بشیرالدین نبیرۂ ٹیپوسلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے۔ اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع۔" ۱۳ ؎

غالبؔکے خط نویسی کی ابتداء کے تقریباً دس گیارہ سال بعد ان کے خطوط کی طباعت واشاعت کا مسئلہ پیدا ہوا اور ۱۸۶۱ء میں عبدالغفوسرورمارہروی نے منشی محمد ممتاز علی خان کے مشورے سے مرزا غالبؔ کی اجازت حاصل کیے بغیر ان کے خطوط کی طباعت کاارادہ کرلیا۔ وہ خطوط مرزا غالبؔ نے سرور مارہروی کے نام سے لکھے تھے۔ انھوں نے ۳۱ خطوط کا مجموعہ مہر غالبؔ کے عنوان سے مرتب کیا۔ ۱۸۶۳ ء تک یہ مجموعہ مسودے کی شکل میں پڑا رہا۔ اس طرح سے غالبؔ کے خطو ط کے مجموعہ مختلف ناموں سے منظر عام پر آئے۔

عود ہندی

عودہندی غالبؔ کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپا جو کہ ۱۸۸

صفات پر مشتمل ہیں۔ منشی ممتاز علی خان جو مرزا غالبؔ کے دوست تھے انھوں نے غالبؔ کے خطوط کو مجموعی شکل دینے کا ارادہ کیا ۔ اس دوران خواجہ غلام غوث بے خبر نے غالبؔ کے خطوط کا مجموعہ ترتیب کرنا شروع کیا تھا۔ اور غالبؔ خود اس میں دلچسپی دکھارہے تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ مجموعہ جلد از جلد شائع ہوجائے۔

اردوئے معلی(اول، دوم(

اُردو خطوط کا یہ مجموعہ غالبؔ کی حیات میں مرتب ہو ا اوران کی وفات کے بعد مکمل ہوا۔ غالبؔ کے شاگرد منشی بہادری لال مشتاق نے غالبؔ کے خطوط چھپانے کا ادارہ کیا او ر ' 'اردو ئے معلی '' نام تجویز کیا۔ غالبؔ کے خطوط کا یہ مجموعہ اردوئے معلی (حصہ اول) مکمل المطابع دہلی میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو چھپ کر تیار ہوا جو چار سو چونسٹھ صحفات پر مشتمل ہے۔اس مجموعہ میں خطوط کی تعداد ۴۷۰ اور مکتوب الیہم کی تعداد ۵۱ ہے۔اُردوئے معلی (حصہ دوم) مولانہ الطاف حسین حالیؔ نے اردوئے معلی کا دوسرا حصہؔ ۱۸۹۹ء میں چھپایایہ حصہؔ ۵۶ صحفات پر مشتمل ہے اس میں کُل ۵۳ خطوط ہیں اور مکتوب الیہ کی تعداد ۱۰ ہے۔

مکاتب غالب

۱۹۳۷ء میں مولوی امتیاز علی عرشی نے غالبؔ کے خطوط کا مجموعہ مکاتیب غالبؔ کے نام سے شائع کردیا۔ اس مجموعے میں صرف وہ خطوط شامل ہے جو غالبؔ نے رام پور کے نواب فردوس مکاں، خلد آشیاں وابستگان دربار کو لکھے تھے اس کی تعدد ۱۲۹ ہے اور مکتوب الیہم کی تعدد ۷ ہے۔

نادارت غالبؔ

غالبؔ کے خطوط کا یہ مجموعہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا آفاق حسین آفاق نے اسکو مرتب کر ادارہ نادارت کراچی سے شائع کروایا۔ آفاق حسین آفاق میرن دہلوی صاحب کے نواسے تھے غالبؔ کے خطوط کا یہ مجموعہ ان کے مسودے کی شکل میں ملا تھا۔ اس مجموعہ میں ۷۴ خطوط موجود تھے جو منشی نبی بخش حقیر کے نام غالبؔ کے ۷۳ خطوط ہے اور منشی عبدالطیف کے نام ایک خط موجود ہے۔

خطوط غالبؔ

منشی مہیش پرساد نے" خطوط غالبؔ" کی ازسر نو تر تیب کی اس میں انھوں نے کچھ غیر مطبوعہ خطوط کو بھی شامل کیا۔ اس کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۴۶ء میں شائع کی۔ خطوط غالبؔ کے اس مجموعہ کو مزید افسانوں کے ساتھ مالک رام نے ۱۹۶۲ء میں چھپوایا۔

منشی مہیش پرشاد کے مرتب کردہ مجموعہ کے بعد غلام رسول نے اردوئے معلی اور عودہندی کی ترتیب توڑ کر غالبؔ کے منفرق خطوط کو یکجا کر کے اس مجموعے میں پیش کیا۔ تاریخوں کی تصیح کر کے ازسر نو تاریخ وار ترتیب دی۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ خطوط ذیادہ قابل قدر ہے۔

انتخاب غالبؔ

یہ خطوط کا مجموعہ ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خان کی فرمائش پر غالباً انگریزوں اور فوجیوں کو پڑھانے کے لیے ۱۸۶۶ء میں شائع ہو ۔ غالبؔ نے جو نسخہ مولوی ضیاا لدین صاحب کو لکھوایا وہ عبدالررزق راشد نے مرتب کر کے ۱۹۲۶ء میں چشتیہ پریس حیدرآباد سے شائع کروایا۔پھر دوسری مرتبہ ۱۹۴۳ ء میں دین محمدی پریس لاہور سے شائع ہوا۔

ادبی خطوط غالبؔ

یہ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اس مجموعے میں اسے خطوط کا انتخاب ہے جو غالبؔ نے نکات ادبیہ حل کیے ہے۔ یعنی اشعار کے معنی بتائے ہیں اور شعراء کے متعلق رائے بھی دی ہے۔یہ مجموعہ ۱۹۲۹ء میں نظامی پریس لکھنوء سے شائع ہوا۔

غالبؔ کی نادر تحریریں

اس مجموعہ میں وہ خطوط شامل ہے جو ''عودی ہندی '' اور '' اردوئے معلی '' میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ یہ مجموعہ خلیق انجم نے مرتب کر کے ۱۹۶۱ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شا ئع کروایا۔ اس کے بعد میں مختلف رسالوں کی صورت میں شائع کیا گیا۔ غالبؔ کے خطوط کی مقبولیت سے اُردو خطوط نگاری کو ایک خاص ادبی رتبہ حاصل ہو ا اگر وہ شاعری نہ کرتے تو بھی یہ خطوط کا سرمایہ اردو ادب کو منفرد مقام رکھتے ہیں۔

مرزا غالبؔ کے بارے میں کہاجاتا ہے کہ اگر وہ شاعری نہ کرتے اور اُردو ادب" کوصرف خطوط کا سرمایہ دے کر رخصت ہوجاتے تو بھی ان کا مقام نہ صرف ادب میں بلکہ دُنیائے ادب میں منفرد رہتا۔ اس لیے انھوں کے اردو میں خطوط نگاری کو فروغ ہی نہیں دیا، بلکہ وہ فرسودگی،اُکتا دینے والی یکسانیت، رسمی آداب و القاب اور پرانی روش سے نجات دلانے کا باعث بھی نبے۔انھوں نے ایسے نیا آب ورنگ دیا، اس میں اپنے محسوسات، خیالات اور دل کی دھڑکنوں کو اس طرح سمودیااور کاروباری تحریر کی نوک پلک کو اپنے فنکارانہ صلاحیت کی مددسے اس سلیقے کے ساتھ درست کیا کہ وہ دُنیائے ادب کی اچھی تحریروں سے ہاتھ ملانے کے لائق ہوگئی اور اگر ادب پر کوئی قلم اُٹھانے والا خط نگاروں کا تذکرہ کرے اور غالبؔ کا ذکر نہ کرے تو اس کے اس عمل سے غالبؔ کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ وہ خود اپنا نقصان کر ے گا۔ اس کا یہ عمل اس کی کم علمی، کم نگہی، اور کم مائیگی کے ثبوت میں ہمیشہ ہمیشہ پیش کیا جاتا رہے گا۔" ۴۱ ؎

سرسید احمد خان

سر سید احمد خان کی پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء دہلی میں ہوئی۔ ان کے ولد کا نام متقی محمد تھا۔ان کی والدہ عزیز النساء نہایت مہذیب خاتون تھیں۔سر سید کی ابتدائی زندگی پر ان کی تربیت کا بہت گہرا اثر ہے۔سرسید نے مغربی زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرنے کے مقصد کے تحت ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قیام کی۔ عام مسلمانوں کی ذہن سازی کے لیے ۱۸۷۰ء میں '' تہذیب

الا خلاق '' رسالہ جاری کیا ۔ اور ۱۸۵۷ء میں علی گڑھ میں مدرستہ العلوم محمڈن اورینٹل کالج کا قائم کیا۔آج وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

سرسید احمد خان کا شمار اُردو ادب کے بڑے ادیب ونثر نگاروں میں شامل ہوتا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے اُردو ادب میں اصلاح کرنے کا بہت ہی اہم کام انجام دیا۔ اور ُاردو ادب میں انقلابی تبدیلیاں لائیں۔ سرسیدکو جدیداُردوادب کا معمار بھی کہا جاتاہے۔ انھوں نے سیاسی، مذہبی تعلیمی، ادبی خدمات کے ہر پہلو پر تحقیقی و تنقیدی کام کیا۔ اگر سرسید کے عہد کی خطوط نویسی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واقفیت ہوتی ہے کہ سرسید اور ان کے ر فقاء نے تاریخ و سوانح، تحقیق و تنقید، ناول ، افسانہ ، طنزو مزاج، انشائیوں اور مضامین کو نیا طرز تحریر عطا کی اور مختلف موضوعات پر خطوط بھی لکھے ہے۔ چنانچے سرسید کے خطوط اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ خط تحریر کرتے و قت انھوں نے القاب و آداب کے علاہ عرض مدعّا کی ضرورت کو سب سے پہلے مدنظر رکھا۔

سرسید کے عہدکے مکتوب نگاروں کی اپنی شخصیت کے اثرات بھی ان کے خطوط سے ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ سرسید کے عہد کے خطوط میں فن نقطہ نظر سے عبارت آرائی کم ہوئی اور تکلف کی جگہ سادگی نے لی۔ ان کے خطوط میں بات کو براہ راست کہنے کی چھلکیاں زیادہ نظر آتی ہے۔ سرسید کے خطوط سے اُردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتاہے۔ غالبؔ کے بعد سرسید احمد خان پہلے شخص ہیں جن کے خطوط زبان و ادب اور علم وعمل کے نقطہ نظر سے دِلکشی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے خطوط نجی اور ذاتی نوعیت کے ہے اورقومی، ملکی، مذہبی معاملات کو بھی پیش کرتے ہیں۔ سرسید کے اخلاق کے نقوش ان کے خطوط میں جابجا ملتے ہیں۔ ان خطوط کے کئی مجموعے موجود ہیں ۔

۱۔ مجموعہ خطوط

مجموعے خطوط یہ احمد الدین نبیرہ سرسید نے مرتبہ کیا ہیں جس میں ۱۲۲ خطوط ہیں جو ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا ہیں

۲۔ تحریر فی اصول التفسیر

۱۸۸۲ء میں شائع ہوا اس میں سرسید احمد خان کے دو خطوط کو شامل کیا گیا ہے یہ ایک چھو ٹا سا رسالہ ہے اور جس میں اصول التفسیر سے مطلق خطوط لکھے گئے ہیں۔

۳۔ مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن

علی گڑھ سے یکم فرروی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوااس میں سرسید احمد خان کے تین خط شامل ہے عثمان مقبول مطبع احمدی نے اسے مرتب کیا ہے۔

۴۔ سرسید کے خطوط

یہ مجموعہ حالی پریس پانی پت سے شائع ہوا اسے مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی نے مرتب کیا ہے یہ مجموعہ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

۵۔ خطوط سرسید مرتبہ سرراس مسعود

یہ مجموعہ ۱۹۲۴ء میں نظامی بدایوں پریس میں شائع ہوا اس میں دو سوپینتالیس ۲۴۵ خطوط شامل ہے۔ اس مجموعہ کے ابتدائی صفحہ اول یہ سرسید احمد خان کی تصویر ہے اور اس کا مقدمہ مولوی عبداللہ خان وکیل سہارن پور کا لکھا ہوا ہے۔ ،مکتوب الیم کی تعداد اٹھائیس ہے اور ان کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے اس کہ علاوہ خطوط کے سرسید مرحوم کے خط کا عکس اس عنوان سے ایک تصدیق نامہ سرسیداحمد خان کے اپنے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ اس مجموعے کے دو ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

۶۔ انتخاب مکاتیب مرتبہ شیخ عطاء اللہ

یہ مجموعہ ۱۹۵۸ء میں لاہور سے شائع ہوا اس میں سرسید کے چالیس خطوط شامل ہیں سیر حاصل تبصرہ بھی درج ہے خطوط کو عنوانات کے تحت باٹنا گیا ہے۔ اور مکتوب الیم کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

۷۔ مکتوبات سرسید احمد خان۔ مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی

یہ مجموعہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا اس کو مجلس ترقی پسند ادب زرین آرٹ پریس لاہور سے شائع ہوا ۔ اس میں ۲۴۳ خطوط شامل ہے یہ خطوط ۱۸۴۹ء سے ۱۸۹۸ء کے درمیان تحریر کئے گئے ہیں ان میں چند خطوط فارسی کے بھی ہیں۔ اس کے ابتداء میں مکتوب الیم کے ساتھ سرسید کے تعلقات ان کی سوانح اوصاف کا ذکر ملتا ہے۔

۸۔ مکاتیب سرسید احمد خان۔ مرتبہ مشتاق حُسین

اکتوبر ۱۹۶۰ء کو دہلی کی پریس یونین پرینٹگ سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے حصّہ اوّل میں خطوط کی تعداد ۱۴۱ ہے جو ۳۴۲

صفحات پر مشتمل ہے اور مکتوب الیم کی تعداد ۵۸ ہے۔ حصّہ دوّم ۲۶۵ صفحات ہے اس میں مکتوب الیہم کی تعداد ۲۰ اور خطوط کی تعداد ۳۴ ہے یہ خطوط مختلف اخبارات ،رسائل اورکتابوں سے جمع کیے گئے ہیں۔ سوائے ایک غیر مبطوعہ خط کے جو عبداللہ مہرعلی کے نام ہے۔ خطوط کے اختتام پر ہر مکتوب الیہ کا مختصر تعارف اور خط کی نوعیت کے علاوہ اس کے ماخذ بھی درج کئے ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ خلیل الرحمن اعظمی اور تعارف عابدحسین نے لکھا ہے۔

۹۔ خطوط سرسید۔ مرتبہ نسرین ممتاز بصیر

یہ مجموعہ فروری ۱۹۹۵ء کو علی گڑھ سے نسرین ممتازبصیر نے مرتب کرکے مطبوعہ لیتھوکلر پر نٹرس علی گڑھ سے شائع کیا۔ حکیم احمد الدین نے یہ مجموعہ ترتیب دیا ۔اس مجموعہ میں سرسید احمد خان کے ذاتی خطوط شامل ہے۔ یہ مجموعہ ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔ سرسید کے خطوط کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خطوط نگاری کی تاریخ میں موضوع واسلوب دونوں اعتبار سے اضافہ ہوتا ہے ۔

غالبؔ کے خطوط کی مقبولیت سے اُردو خطوط نگاری میں نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد میں مکتوب نگاری عموماً ان کی ہی روش کی تقلید دکھائی دیتی ہے۔ لیکن سرسید احمد خان کا اپنا الگ ہی رنگ ومزاج تھا۔ سرسید احمدخان نے مقصد اور ضرورت کے تحت خطوط لکھئے اپنے مقصد و مشین کی ذہینی وقلبی فکرنے بھی سرسید کو خطوط لکھنے پر آمادہ کیا۔

انیسویں صدی میں غالبؔ کے بعد دوسری بڑی شخصیت سرسید ہے جن کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن ان کے ذیادہ خطوط سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور افسروں کو لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں وہ کیفیت، دلچسپی اثر آفرنیی ممکن نہیں ہے جو غالب کے خطوط میں پھر غالب، غالب ہیں اور سرسید، سرسید ایک شاعر دوسرا ادیب،ایک بیباک اور لاأبالی دوسر ا محتاط اور ڈپلومیٹ، ایک فنکار اور دوسرا معمار اور بھی بہت کچھ بدلا بدلا سا اس لیے فرق تو ہونا چاہئےلیکن اس فراق اور ایسے خطوط کو ہم کس طرح نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ یہ ایک بڑے معمار قوم اور تحریک کے بانی کے خطوط ہیں۔" ۵۱ ؎

سرسید احمد خان کے خطوں سے ایک نئے دبستان کی ابتداء ہوتی ہے ان کے مشن کو سمجھنے کیلے ان کے خطوط کا مطالعہ ضروری ہے ۔ تمام خطوں میں سادگی بے تکلفی اور برجستگی کا نمونے ملتے ہیں روزمرہ کی بول چال اور نثر کی جملہ خوبیاں ان میں موجود ہے ان خطوط کے مطالعے کی وجہہ سے ہم کو ایک بڑے مفکر مصلح ، ادیب سرسید احمد خان ماہر تعلیم کو بہت قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔

محمد حسین آزادؔ۔

محمد حسین کی پیدائش ۵ مئی ۱۸۳۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد باقر حسین تھا۔انھوں نے دہلی کالج سے تعلیم حاصل کیں۔لاہور میں جنرل پوسٹ آفس میں سر نوشت دار کے عہدے پر تین سال کام کرنے کے بعد ڈائرکڑ پبلک انسڑکشن کے دفتر میں انہیں ملازمت مل گئی۔اس کے بعد '' انجمن پنجاب '' کے سکر یڑی مقرر ہوئے۔ اور کچھ عرصے کے بعد گورنمٹ کالج لاہور میں عربی پروفیسر کے حیثیت سے کام انجام دیا۔محمد حسین آزادؔ نے اپنے سفر ناموں کے مشاہدات اور تجربات کو قلم بند کیا۔

محمد حسین آزادؔ اپنے تصنیفات کے ذریعہ اُردو ادب کو بیش قیمتی سرمایہ عطا کیا۔ان میں سخن داں فارسی، قصص ہند، دربارآکبری، نگارستان فارس، سیرایران، دیوان ذوقؔ ، اور نیرنگ خیال اور اس کے علاوہ نصابی کتابوں میں اُردو کی پہلی ،دوسری اور تیسری کتاب، قواعد اُردو اہمیت کے حامل ہیں۔ آزاد کی سب سے مشہور و مقبول کتاب '' آب حیات '' ہے۔ اس کتاب میں اُردو شاعری کی تاریخ، تذکرہ، اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء پربحث اور اُردوزبان کی اہم لسانی مباحث ہے۔

محمد حسین آزاد ایک شاعر ، نقاد، مورخ اور انشاپرداز تھے۔ نثر میں محمد حسین آزاد کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے خطوط کے مجموعہ ذیل میں ہے جو منظرعام پر آئے۔

۱۔ مکتوبات آزاد۔ مرتبہ سید جالب دہلوی۔جنوری ۱۹۰۷ء

۲۔مکتوبات آزاد۔ مرغوب بک ایجنسی طبع دوم۔ ۱۹۰۷ء

۳۔مکتوبات آزاد۔ طاہر بک ڈپو طبع دوم۔ ۲۰ ۱۹ء

۴۔مکتوبات آزاد۔ مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد۔ ۲۳ ۱۹ء

۵۔مکتوبات آزاد۔ مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد۔یکم فروری ۲۷ ۱۹ء

۶۔ مکاتیب آزاد۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ ۱۵ جون ۶۶ ۱۹ء

۷۔ مکاتیب آزاد۔ مرتبہ ساحل احمد۔ ۲۷نومبر ۹۷ ۱۹ء

محمد حسین آزاد کے خطوط کے مطالعے سے ان کی منفردشخصیت اُجاگر ہوتی ہے۔ دلکشی ان کے تحریر کی خاص خوبی ہے۔ ان کی طبعیت میں شگفتگی، لطافت، اور

جدت پسندی قدرت کی عطاکردہ صلاحیت ہیں۔آزاد کی طرز تحریر کی اور ایک خوبی یہ بھی ہیکہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں کو تشبیہ ، استعارہ ، الفاظ کی شیرنیی و لطافت اور فقروں کی موسیقیت سے ایسی دلچسپ اور منفرد عبارت بنادیتے ہیں۔بعض خطوط میں ذاتی حالات اور رشتہ داروں کا ذکر بھی ہے اور کچھ خطوط میں کالج اور یونیورسٹی کا ذکر ملتا ہے۔محمد حسین آزاد کے خطوط کے مطالعے سے ان کی ذاتی و نجی حیثیت عیاں ہوتی ہے جس کا ذکر ان کے دیگر تصانیف میں نہیں ملتا۔محمد حسین آزاد کے تحقیق نے تنقیدی شعور کو پروان چڑھایا۔مغربی ادب اور دلی کالج کے ماحول سے ان کے فکر اور فن کو گہرائی ملی ۔ یہی خصوصیت ان کے خطوط کو اعلیٰ درجہ عطا کرتی ہیں۔

ڈ پٹی مولوی نذیر احمد ۔

ڈپٹی مولوی نذیر احمد۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مولوی سعادت علی معلم تھے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم دِلی کالج سے حاصل کی۔۸ سالہ تعلیم کے بعد گجرات میں ملازمت ملی ۔اس کے بعد ترقی کرتے ہوئے وہ کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدراس ہوگئے۔۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دَلی واپس آنے کے بعد نظام دکن نے انہیں وہاں دفاتر کا معائنہ اور کارکردگی کی ذمہ داری دی گئی۔اور اگے ترقی کرکے صدر تعلقہ دار بن گئے۔اس دوران وہ نظام دکن کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔اس وقت انہیں بچوں کے کچھ کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی مگر وہ دستیاب نہ ہوسکی تو خود ڈپٹی نذیر احمد نے بچوں کے لیے کتابیں لکھنے کا کام شروع کیا۔

نذیر احمد نے بہت سے ناول بھی تحریر کیے۔ ان ناولوں کا مقصد اصلاحی ہے اور ان میں زیادہ زورلڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور امور خانہ داری ہے۔ان کے مشہور ناولوں میں'' مراۃ العروس''، '' بنات النعش ''، '' توبہ النصوح '' ، '' فسانہ مبتلا ''، '' ابن الوقت '' ، '' ایامی '' اور '' روئے صادقہ '' ہیں۔'' مراۃ العروس'' کو اُردو کا پہلا ناول کہا جاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد سرسید احمد خان کی تحریک سے متاثر تھے۔ تعلیم کی تبلیغ اور ترقی کے لیے ہمیشہ کوشا رہے۔ ان کے ادبی اور مغربی خدمات کی وجہہ سے ان کو حکومت سے ''شمس العلما '' کا خطاب ملا۔

نثر میں ان کی مکتوب نگاری کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ان کے خطوط کا مجموعہ '' مو عظ حسنہ '' کے نام سے ۱۸۸۸ء لکھنوء سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں پندو نصیحت ہے۔ ان مکتوبات سے نذیراحمد اپنے بیٹے کو

تربیت دینا چاہتے تھے۔ یہ خطوط انھوں نے اعظم گڑھ ، حیدرآباد اور دِلی سے اپنے بیٹے بشیرالدین احمد خان کو لکھے تھے۔ ان کا مقصد بیٹے کو تعلیم اور تربیت و ہدایت دینا تھا۔ ان خطوط کے ذریعہ مذہب، اخلاق، تعلیم و تربیت کے عمدہ اُصول بتائے ہیں۔ اور بیشتر خطوط درسی مسائل، تعمیرو اصلاحی کردار اور کچھ اپنے مشاغل ، مقامی سیاست کی الجھنوں اور خاندگی زندگی کے پیچیدہ مسائل پر مبنی ہیں۔چند خطوط میں انگریزی زبان کی تمام خوبیوں اور خامیوں کا ذکر ہے۔

مجموعہ ‘‘ موعظ حسنہ ’’ کے خطوط میں اپنے بیٹے کی تعلیمی اِصلاح اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق جو تلقین کی گئی ہے اس سے آج کل کے نوجوانوں کی تربیت میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

بقول محمد حسین آزاد۔

"باپ اپنی اولاد کی اصلاح خیالات و عقائدو خصائل کا بہت بڑا خواب وہ معلّم اور اتالیق ہے اور اپنی خدمت سے کبھی پہلوتہی نہیں کرسکتا۔ باوجود کثرتِ مشاغل اور اتنی تصانیف بلند و مشکل کے صاحب ’موعظ حسنہ‘ کو اس کر فرصت ملتی تھے کہ اپنے پیارے بیٹے کو ایسے مراسلات بھیجا کرتے کیونکہ ان کی اپنی یہ جواب دہی اور اپنے کلام کی قوتِ تاثیربخوبی معلوم تھایہ کتاب لڑکیوں اور بوڑھوں کے پڑھنے کے لائق ہے اور سوائے فائدہ کے اس سے کسی طرح کے ضررکا گمان نہیں ہے۔یہ مکتوبات گویہ ایک خاص لڑکے کے لیے لکھے گئے تھے، مگر خدا جانے کتنے ہزار نوجوان اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور کتنوں کے یہ کام آئیں گے۔ ۱۶ـــہ

‘‘موعظہ حسنہ ’’ کے خطوط ایسے ہیں جو ایک باپ نے اپنے بیٹے کو نہایت دل سوزی سے تحریر کیے ہیں۔لفظ لفظ سے محبت اور شفقت کی خوشبوں ملتی ہے۔ ان خطوط میں فکرمندی، ہمت افزائی، حوصلہ مندی، فیض و فیضان اور تعلیم و تربیت کے غیر معمولی جوش سے ابھرا ہیں۔نصیحت آمیز یا پندو نصائح اور تلقین کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

نواب محسن الملک (سیّد مہدی علی خاں) ۔

نواب محسن الملک ۱۸۳۷ءـــــہ اٹاوہ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہوئی۔اور۔ انہی دو زبانوں مہارت حاصل کرلی۔ محنت اور ذہانت سے کام کرکے تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ زمانے تحصیلداری میں قانون کی دو کتابیں، ‘‘قانونِ مال’’ اور‘‘ قانو نِ فوج داری ’’ لکھی، جنہیں انگریزحکام

نے مفید قرار دیا اور انھیں تحصیلدار سے ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ دیا۔ان کی کارکردگی کی شہرت حیدرآباد تک پہنچی اور سالار جنگ بہادر نے انہیں حیدرآباد میں مالیات کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا۔حسن خدمات کے اعتراف میں ریاست کی طرف سے ''محسن الدولہ، ''محسن الملک'' اور ''منیرنوازجنگ'' کے خطابات عطا ہوئے۔اس کے بعد کے خط و کتابت میں سید مہدی اپنے نام کے بجائے محسن الملک لکھنے لگئے تھے۔

سنہ۱۸۶۲ء میں جب محسن الملک کی ملاقات سرسیّد سے ہوئی تو وہ سرسید کے مذہبی افکار کے سخت خلاف تھے لیکن سر سیّد کی تحریر اوران کے جوش و خروش، خلوص و ہمداردی کو دیکھ کرمحسن الملک کی رائے بدل گئی اور وہ سر سیّد کے حامی اور مددگار بن گئے۔انہوں نے سرسیّد کے ہر قدم کے ساتھ تعاون کیااور علی گڑھ تحریک سے جُڑگئے۔ان مضامین اکثر تہذیب الاخلاق میں شائع ہوتے تھے۔

محسن الملک نے کثرت سے کتابیں تصنیف نہیں کیں لیکن زمانہ تحصلیداری کے دوران دو کتابچے '' قانون مال '' اور '' قانون فوج داری '' ہیں۔ ان کی دیگر تصنیفات میں '' میلادنامہ '' ، '' تقلیدبالحدیث '' ، ''کتاب المجت والنشوق'' (غزالی) مسلمانوں کی تہذیب، '' آیات بیتات''، مضامین تہذیب الا خلاق ، '' مجموعہ لکچرر '' مکاتیب '' باقیات الصالحات '' ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔

محسن الملک کے تیئس خطوط نقوش کے'' مکاتیب '' نمبر میں شائع ہوئے یہ خطوط سنہ۱۸۹۰ء سے سنہ۱۹۰۷ء کے درمیان لکھے گئے تھے۔اسلوب کے اعتبار سے ان خطوط میں سادہ بے تکلف اور محاروتی رنگ موجود ہے اور روزمرہ کے محاوارت کا استعمال اپنے فطری انداز میں موجود ہے۔ تمام خطوط مقصد کی ترسیل کے لیے لکھے گئے اس لیے ان میں القاب و آداب مختصر ہیں۔مکتوب الیہ کے مرتبہ اور علمی لیاقت کے علاوہ شخصیت کے پیش نظر القاب و آداب کا استعمال کیے گئے۔کچھ خطوط مختصر ہیں تو کچھ خطوط طویل بھی ہیں۔ کچھ خطوط میں اُردو کے علاوہ فارسی اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

مجموعہ '' مکاتیب '' کے دو حصّے ہے۔ اول میں حصّہ میں محسن الملک کے خطوط شائع کیے گئے ہیں اور دوسرے حصّے میں وقارالملک کے خطوط لکھے ہوئے ہیں۔محسن الملک کے اس مجموعہ میں ابتدائی خطوط حیدرآباد سے لکھے گئے ہیں۔ جس وجہ سے ان خطوط میں حیدرآبادی فضا اور دیگر معاصر انہ احوال وکوئف کے نقوش نظرآتے ہیں۔معاصرین کے فکرو کردار کی جھلکیاں اور دیگر افراد سے ان کے تعلقات کا اندازہ خطوط کے مطالعے سے آسانی لگایا جاسکتاہے۔

محسن الملک کے خطوط میں مختلف شہروں اور ممالک کے سفر اور قیام کا ذکر ملتا ہے۔مثلاً شملہ، اٹاوہ، علی گڑھ، مدارس، بمبئی اور بیرون ممالک میں پیرس، لندن وغیرہ ۔لندن کے قیام کے دوران محسن الملک نے مختلف سوسائٹیوں اور جلسوں میں شرکت کی۔ وہاں کے اعلیٰ طبقوں کی دعوتوں میں انھیں بلایا گیا اور کئی تعلم گاہوں کا مشاہدہ کیا۔ان تمام کا ذکر اُن کے خطوط میں ملتا ہے۔

نواب محسن الملک کے خطوط کے ذریعے اس دور کے سیاسی ، سماجی، تعلیمی اور خاص طورسے سرسید احمد خاں کے تحریک کے واقعیات مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان خطوط میں ایک طرف تو ان کی شخصیت کے خاموش خانے اپنے اسراو رموز کی جلوہ گری کرتے ہیں اور دوسری طرف اس عہد اور ماحول کی، چھوٹے بڑے حادثوں اور ہنگاموں کی نقاب کشی ملتی ہے۔ان کے خطوط میں عام بول چال کی زبان کے رنگ ہے ۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی ذاتی تعلقات کی نوعیت کو واضح طورپرنظر آتے ہے۔محسن الملک کے ان خطوط میں سوانحی عناصر کے کچھ ایسے اشارے بھی ملتے ہیں۔ بہر کیف ان کے خطوط ایسا مقدصہ ریکارڈ ہیں جن سے ان کی سیرت و شخصیت کی سچی تصویر بنائی جاسکتی ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ ۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ ۱۸۳۷ء پانی پت میں پیدا ہوئے۔ وہ نو برس کے تھے کے ان والد خواجہ ایزدبخش کا انتقال ہوگیا۔ان کی پرورش انکے بڑے بھائی خواجہ امدادحسین نے کی۔ابتدائی تعلیم پانی پت ہی میں قرآن خفظ کیا۔۱۷ برس کی عمر میں ان کی شادی ان کے ماموں میر باقر علی کی صاحبزادی اسلام النساء سے ہوئی۔ حالی کو باقاعدہ تعلیم کا موقع نہیں ملا۔بیوی کے میکہ جانے کے بعدوہ گھر والوں سے روپوش ہوکر دِلّی چلے گئے۔ وہاں انھوں نے کسی ترتیب و نظام کے بغیر فارسی، عربی، فلسفہ و منطق اور حدیث و تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ادب میں جو انھوں نے خاص بصیرت حاصل کی وہ ان کے شوق ، مطالعہ اور محنت کی بدولت تھی۔دہلی میں قیام کے دوران مرزا غالب کی خدمت میں رہے کرخود شعربھی کہنے لگے اورغالب نے اُن اشعار کی اصلاح بھی۔

خواجہ الطاف حسین حالی شاعر،نثر نگار، نقاد، سوانح نگار اور مصلح قوم تھے۔ان کی تین اہم کتابیں '' حیات سعدی '' ، '' یادگار غالب '' اور '' حیات جاوید '' سوانح عمریاں ہیں۔ '' مقدمہ شعروشاعری '' ان کی مشہور تنقیدی کتاب ہے ۔ جس کے ذریعہ اُردو میں با قاعدہ تنقید کی بنیاد رکھی۔مسدس حالی (مثنوی مدو جزراسلام) سے سارے

ملک میں شہرت و مقبولیت حاصل کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی نثر نگاری میں ان کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہے۔

حالیؔ کے خطوط اپنی سادگی اور پرْ خلوص انداز کی وجہہ سے خاص کشِش رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط میں سیدھے سچے انسان کی حیات کا عکس نظر آتاہے۔ ان کے خطوط میں سادگی اور خلوص کے ساتھ فن خطوط نگاری کی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث ان کے خطوط کوادبی شہ پارے کا درجہ حاصل ہیں۔

حالیؔ کے خطوط کے تین مجموعہ ہیں۔جو درج ذیل ہے۔

۱۔ مکتوبات حالیؔ (حصہّ اول) مرتبہ سجاد حسین

۲۔ مکتوبات حالیؔ (حصہّ دومّ) مرتبہ سجاد حسین

۳۔ مکتوبات حالیؔ مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مکتوبات حالیؔ (حصہّ اول) مرتبہ سجاد حسین

مکتوبات حالیؔ کو مرتب کرنے والے سجادحسین ہے جوحالیؔ کے چھوٹے فرزند تھے۔ اس مجموعہ میں دو سو بیس (۲۲۰) مکتوبات درج ہیں۔ یہ خطوط سنہ۱۹۰۲ء تا سنہ۱۹۱۲ء کے عرصہ پر محیط ہیں۔ یہ تمام خطوط نواب وقار الملک انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین کے نام ہیں۔

مکتوبات حالیؔ (حصہّ دوم) مرتبہ سجاد حسین

اس مجموعے میں کل پانچ سوبائیس (۵۲۲) خطوط شامل ہے اس مجموعے میں حالیؔ کے بھتیجے الصتدق حسین کے نام اکیاسی (۸۱) اور حالیؔ کے چھوٹے فرزند سجاؔد حسین کے نا م چار سو اکتالیس (۴۴۱) خطوط درج ہیں۔ جو سنہ۱۸۸۹ ء سے سنہ۱۸۹۳ ء کے عرصہ پر محیط ہیں۔

مکتوبات حالیؔ ۔ مرتبہ اسماعیل پانی پتی

یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے حصہّ اول میں اردو کے ۵۳ خطوط ہیں ۔ پہلے تین خط محمد حسین آذادی دہلوی کے نام اور آخری خط وجاہت حسین کے نام ہے۔ اردو خطوط کے کُل مکتوب الیہم کی تعداد ۳۸ہے۔حصہّ دوم میں فارسی کے خطوط درج میں ان کو تعداد ۸ ہے اور مکتوب الہیم کی تعداد بھی ۸ ہے۔ پہلا خط نواب کلب علی خان بہادر کے نام درج ہے۔حصہّ سوم اس میں کل ۷ عربی خطوط موجود ہے جو ۵

مکتوب الہیم کے نام ہیں اس میں غالبؔ کے نام ایک خط فارسی میں لکھا ہوا ہے اور عربی خطوط کا ترجمعہ بھی درج ہے۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۲۴ء میں مولانا الطاف حسین حالیؔ کے بیٹے سجاد حسین کی فرمائش پر اسماعیل پانی پتی نے خطوط کو دو جلدوں میں مرتب کیا۔ لیکن'' مکتوبات حالی''[۱۶] کی دونوں جلدوں میں اسماعیل پانی پتی کانام کہیں نہیں ملتا۔ حالیؔ نے'' مقدمہ شعر و شاعری'' لکھ کر اُردو تنقید کی بنیاد رکھی۔اُردو نقادوں نے'' مقدمہ شعر و شاعری ''کو اُردو تنقید کا اوّل اور آخر حرف کہا ہے۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے ذریعہ انھوں نے اردو شاعری پر بحث کرنے کا ارادہ کیا اور انھوں نے اس خیال کو ظاہر کرتے ہوئے ایک خط لکھا۔

" میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھنا چاہتا ہوں جس میں زمانہ جا ہلیت سے لے کر آج تک ان کی شاعری کی حقیقت لکھی جائیگی۔ اور عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں کی شاعری پر بحث کی جائیگی۔ مقصود اس سے یہ ہیکہ اُردو کی شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہوگئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بتائے جائیں اور ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اُصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم و وطن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔" ۱۷ے

حالیؔ کے خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو شاعری کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ حالیؔ کے خطوط میں موضوعات کافرق اور اسلوب کا حسن دونوں نظر آتے ہیں۔ لب و لہجہ پرُ خلوصاور واضح ہے ۔ مکتوبات حالیؔ میں تقریباّخطوط عزیزواقارب کے نام ہیں جس میں وہ ان کے حالات زندگی اور بیماری و مصیبت کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنی پوتی کے نام لکھےہوئے خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اس کو پڑھکر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا اور تمہاری پھوپھی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آ نسو ٹپک پڑے۔ تم نے اتنی دور جاکر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھا دی ہے۔ تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت اور سلامتی کی دُعا کرتی رہتی ہیں۔" ۱۸ے

اس خط سے اُن کے پرخلوص مزاج کی عکاسی نظرآتی ہے وہ اتنے بڑے شاعر ہونے کے باوجود اپنی ذاتی زندگیمیں بھی مطمئن و فر ض شناس نظر آتے ہیں۔ اور ان کی دِلی محبت جو اپنے عزیزوں سے ہیں خطوط میں عیاں ہوتی ہے۔ ایک خط جو انھوں نے اپنے نواسہ عبدالولی کے لاعلاج بیماری کاذکر کیا۔

" مجھے اپنے ایک نوجوان نواسے کی بیماری نے جو صرح اور کسی قدر جنون میں مبتلا ہے بالکل پاگل بنادیا ہے۔ اُس کا باپ مرگیا۔" ۱۹ ؎

خطوط میں سادگی اور مکتوب نگارکی شخصیت کی عکاسی نظر آتی ہیں۔ اس سے ان کی سیرت نگاری شخصیت کا ہر پہلوں نمایاں ہوتا ہے۔ حالیؔ اپنے ساتھیوں یعنی دوسرے مصنیفین سے بھی کتنی محبت و خلوص رکھتے تھے اس کا اندازہ حالیؔ کے خطوط کے مطالعے سے بخوبی لگایاجاسکتا ہے۔

حالیؔ کے خطوط کو حیات جاوید کے ا بتدائی ماخذ میں شمار کرسکتے ہیں، مکتوبات حالیؔ میں اکثر خطوط اس وقت کے ہیں جب وہ سرسید کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔اس کتاب کی لکھنے میں انھوں نے بے حد محنت اور کاوش سے کام لیا۔اپنی بیماری ، نواسے کی بیماری گھر کی پریشانیوں کے با وجود '' حیات جاوید'' مکمل کی۔ اس کے مکمل ہونے کے بعد حالیؔ نے حبیب الرحمن شروانی کو ایک خط لکھا۔ جس میں انھوں نے حیات جاوید کے شائع ہونے کی خبر دی اور یقین کیا کے شیروانی صاحب نے منگواکر پڑھی ہوگئی۔

حالی کے خطوط میں شرافت ہمدردی اور محبت خلوص کا رنگ ملتا ہے۔ ملکی قومی مسائل زمانے کے نشیب و فراز انسانی فطرت اور دُنیا کی رفتار قومی اتحاد، ضبط روا داری ایثار قربانی باہمی محبت وغیرہ باتیں ان کے خطوط کی خاص خصوصیات ہیں۔ علمی ادبی یا تاریخی نکات کا بیان بھی ''مکاتیب حالیؔ '' میں ہیں۔

شبلی نعمانی ۔

شبلی ؁۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے نزدیک بندول میں پیدا ہوئے۔شبلی امام ابوحنیفہ سے مزاجی قربت رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے نعمان بن ثابت کی نسبت سے نعمانی لکھنا شروع کیا۔ان کے والد اعظم گڑھ کے نامور وکیل تھے۔شبلی نے چند علماء سے فارسی ،عربی حدیث اور دیگر اسلامی علوم حاصل کئے۔تعلیم ختم کرنے کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے امین کے طورپر ملازمت کی۔پھر وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ کچھ دنوں مختلف مقامات پر ناکام وکالت کرنے کے بعد مولانا کو علی گڑھ میں سرسید کے کالج میں عربی اور فارسی کے معلم کی نوکری مل گئے۔یہیں سے شبلی کے کامیابی کا سفر شروع ہوا۔ اس ملازمت میں شبلی نے کئی سفر کیے اور دوران سفر دو کتابیں ''سیرت نعمانی '' اور ''الفاروق'' مرتب کیں۔سرسید کے انتقال کے بعد شبلی نے علی گڑھ چھوڑدیا۔اور اعظم گڑھ واپس آکر اپنے قائم کردہ '' نیشنل اسکول '' (جو اب شبلی کالج ہے)کی ترقی میں مصروف ہوگئے۔

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

علامہ شبلی نعمانی جدید اُردو کے بانی و معمار ہے اردو کے اعلیٰ نقاد اور سوانح نگار بھی ہے۔ اس طرح اُردو مکتوب نگاری میں بھی انھیں بلند مقام حاصل ہے۔ غالبؔ کی طرح شبلی کے خطوط کی خصوصیات بھی انفرادی مقام رکھتی ہے۔شبلی کے خطوط میں روانی سلاست دلکشی پائی جاتی ہے اور اختصار سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ چندسطروں میں لمبی بات کو بیان کرتے ہیں۔

ان کے خطوط کے تین مجموعے منظر عام پر آئے جو درج ذیل ہے۔

۔ مکاتیب شبلیؒ مرتبہ۔ سلمان ندوی۱

۔ مکاتیب شبلیؒ مرتبہ۔ سلمان ندوی۲

۔ خطوط شبلیؒ مرتبہ۔ محمد امین زبیری۳

مکاتیب شبلی۔ مرتبہ سلمان ندوی۔

مکاتیب شبلی حصہؔ اول سنہ۱۹۱۶ء لکھنوء سے شائع ہوا ۔ یہ مجموعہ ۳۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔مکتوب الیہم کی تعداد ۱۴۰ ہے اور خطوط کی تعداد ۳۹۸ ہے۔ پہلا خط سرسید احمد خان کے نام ہے۔ جو ۲۵ مئی سنہ۱۸۹۲ ء کو قسطنطنیہ سے لکھا گیا۔

مکاتیب شبلی۔ مرتبہ سلمان ندوی۔

مکاتب شبلی حصہؔ دوم سنہ۱۹۱۷ء میں مطبع معارف وعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۲۶۲ صفحات پر مشتمل ہے خطوط کی تعداد ۳۴۷ ہے اُس عربی اور فارسی کے خطوط بھی شامل ہے۔

خطوط شبلی ۔محمد امین زبیری۔

یہ خطوط کا مجموعہ لاہور سے سنہ۱۹۳۵ ء میں شائع ہوا۔ یہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ خطوط شبلی کو دوبار دوسری مرتبہ محمد امین زبیری نے مرتب کیا۔ ۱۹۶۶ سنہء میں یہ آگرہ سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے دو حصےؔ ہیں ۔ حصہؔ اول میں ۵۵ خطوط شامل ہے اور حصہؔ دوم میں ۴۷ خطو ط شامل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

شبلی کا اپنا ایک الگ اندازتحریر ہے غالبؔ کے خطوط کا دل آوارہ عکس شبلی کے یہاں نظر آتا ہے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں ، بزرگوں اور شاگردوں کو

لکھے ہیں ان اختصار اورخلو ص ہےشبلی کے ابتدائی خطوط میں کسی قدر طوالیت بھی ملتی ہے شروع کے خطوط سے ذہن مکمل طورپر علی گڑھ اوراس کے مخصوص فضاء کے طرف منتقل ہوجاتا ہےسرسید احمد خان اور علی گڑھ نے شبلی کی شخصیت کو نکھارا اور '' الفاروق'' کے بارے میں سرسید نے شبلی کو یہ کتاب نہ تحریر کرنے کی رائے دی۔ شبلی انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن وہ طلبہ کو مشرقی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلم حاصل کرنے کے حائل تھے۔ جدید تعلیم سے مسلمان اپنے مذہب سے دور نہ ہوجائے انھیں اس بات کا ڈر تھا لیکن جب علی گڑھ کے طلبہ کو نماز و روزہ کے پابند دیکھا توبہت خوش ہوئے۔ ایک خط میں اس خوشی کا اظہار کیا جو حکیم محمد عمر کے نام لکھا ہے۔

اِس وقت نہ مجھ سے میری طبعیت کا حال پو چھے نہ کوئی اور واقعہ آپ سے'' اور میں دل سے ا ُٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت شناوں یوں تو مدرسہ انعلوم کے قواعد میں داخل ہے۔ کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑ ھیں مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ نجت العلوۃ کہتے ہیں ایک بی اے سکریڑی ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں چار نجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خوں لوگوں کو اس پُراثر نقرے سے چونکادیتا ہے "الصلوۃ خیرمن النوم" پانچوں وقت نمازیں باجماعت ہوتی ہیں اور لطف ـیہ کہ محض اپنی خواہش سے بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں" ۲۰

علامہ شبلی کے خطو ط علمی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ انھیں مطالعہ کا بے انتہا شوق تھا ان کا دل ہندوستان کے کتب خانوں سے نہیں بھرا وہ قسطنطنیہ کے کتب خانے گئے۔ اس سے شبلی کا اصل مقصد قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا۔وہاں ہر کتب خانہ اور ہر نادر کتاب کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ وہاں کے طرز تعلیم اور مدارس سے متاثر ہوئے۔

علامہ شبلی کے خطوط علمی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں جب ہندوستان کے مشہور کتب خانوں سے ان کی پیاس نہ بجھی انھوں نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ وہاں کے کتب خانہ انھیں علوم و فنون کے عجائب خانہ لگے۔ مولانا شبلی کے ابتدائی خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں سرسید کا کس قدر ساتھ تھا اور انھوں نے مولانا کہ حوصلے بلند کئے ان کا مطالعہ گہرا ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ ان خطوط سے ان کی سیرت و شخصیت و جذبات و خیالات و احسا سات و رحجانات کا جوش اور جذبہ نمایاں ہے۔ مختصراً یہ کہ شبلی کا خطوط نگاری کوئی متعین اسلوب نہیں تھا بلکہ مخاطب کے معیار کے مطابق ان کا طرز بیان بدلتارہتا تھا۔ کبھی کبھی تو مفصّل خط لکھتے اور کبھی ایک دو جملوں پر ہی خاتمہ ہوجاتا تھا۔ اور کبھی القاب و آداب کی

پروا کئے بغیر مدّعا بیان کردیتے تھے۔ جن لوگوں سے بے تکلف ہوتے ان کے خطوط میں بے تکلفانہ تحریر ہوتی اور کچھ خطوط سے ان کی مایوسی خدمات اور طنز کا انداز ہوتاہے۔ خطوط شبلی میں عربی و فارسی کے محاورات بھی موجود ہیں۔

شبلی نے اپنے خط میں تعلیم نسواں کے نصاب پر بحث کی ہے ۔ان کے خطوط کے مطالعے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ تعلیم نسواں تعلیم یافتہ خواتین کی تکمیل کے لیے کن اُمور کی ضرورت خیال کرتے ہیں۔ عورتوں کے متعلق شبلی کے نظریات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ عورتوں کے لیے فکر مند تھے۔ اور انھیں تعلیم یافتہ زمانے کے اعتبار سے ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ خطوط شبلی میں ان کی شخصیت کا جمالیاتی پہلو اُجاگر ہوتا ہے ۔ مکاتب شبلی کے خطوط جو انھوں اپنے احباب و دیگر ہم عصروں کو لکھتے ہیں۔ ان میں ان کی شخصیت کے پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔

شبلی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جمال پسند اور حسن پر ست شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ان کے خطوط کی زبان اور ان کا انداز بیان ان کے خوش مزاجی اور طبعیت کا اظہار کرتی ہے ان کے اندر ایک ساتھ ہی عالم و ادیب، فلسفی اور ایک مورخ ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ مکاتیب شبلی کے خطوط جو انھوں نے اپنے احباب اور دیگر ہم عصروں کو لکھے ہیں ان کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں جو ان کی شخصی رویے، ذہنی کیفت روجحانات اور ان کے فکرو نظر کو سمجھنے میں ذیادہ معاون و مددگار ہیں۔ خطوط کے مطالعے سے ہمیں ان کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ خط میں مکتوب الیہ کے ہے اگر تلخی بھی ہو تو بھی لطف سے خالی نہیں۔

مولانہ ابولکلام آزادؔ

مولانا آزاد کا اصل نام محی الدین احمد تھا ۔ ستمبر ؁۱۸۸۸ء میں مکہّ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد انھیں فیروزبخت بھی پکارتے تھے۔ ان کا بچپن مکہّ اور مدینہ میں گزا۔ مدنیہ میں ان کے والد کا مکان دینی تعلیم کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور ۱۴ چودہ سال کی عمر میں مشرقی علوم کا تمام نصاب پورا کرلیا تھا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھے اور مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ ان کی ذہانت پر علمی تجزیہ پر لوگوں کو تعجب ہو تا تھا۔ ان کی ذوق مطالعہ جس کی بے پناہی خاندانی، وماحولی تعصبات پر غالب تھی۔ جس میں اعلیٰ پایہ کا عزم و استقلال اور دیانت داری و عقل درکار ہے وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس کی مذہبی قدامت پسندی ضرب المثل تھی۔ لیکن ان کی فطرت آذاد نے پرانے ڈھرے پر چلنا

گوارانہ نہ کیا اور انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کا نئے سرے سے جائزہ لینا شروع کردیا۔ اس انقلاب ذہنی کی پہلی جھلک ان کے خود نو شتہ سوانح عمری تذکرہ میں ملتی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے تیس برس کی عمر میں ا پنی نظر بندی کے ایام میں لکھی تھی۔

مولانا آذاد کے خطوط سے اُردو مکتوب نگاری میں نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے سرسید احمد خان کی وفات کے بعد نصف صدی ان کے خطوط کی تحریر ملتی ہے۔ ان کے خطوط میں مقصد او ر طرز بیان دونوں کو اہمیت حاصل ہے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ جن میں غبارہ خاطر، مکاتیب آزاد، کاروان خیال، نقش ،آزاد،میرا عقیدہ، تبرکات آزاد

ملفوظات آزاد، مولانا ابولکلام آزاد کے ادبی خطوط،مکاتیب ابولکلام آزاد شامل ہیں۔

غبار خاطر

اس مجموعہ پہلی مرتبہ مئی ؁۱۹۴۶ء میں چھپا محمد اجمل خاں اس کے مرتب ہیں اور اس کے شروع میں ان کاتحریرکردہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ تین مہینے بعد یہ کتاب دوسری مرتبہ اسی سال اگست میں شائع ہوئی۔ ان دونوں اشاعتوں کے ناشر حالی پبلشینگ ہاوس دہلی تھے۔ تیسری مرتبہ ؁۱۹۴۷ء میں آزاد ہند پبلی کیشز لمیٹیڈ لاہور نے اسے شائع کیا۔ اس مرتبہ اس میں ایک خط زائد تھا جو پہلی دو اشاعتوں میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ یہ خط موسیقی سے متعلق ہے۔ یہ مکتوبات قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران ۹؍ اگست ؁۱۹۴۳ء تا جون ۱۹۴۵ ؁ء کے زمانے میں تحریر ہوئے ہیں۔

غبارخاطر ’’ میں شامل خطوط ابوالکام آزاد نے اپنے عزیز دوست حبیب ‘‘ الرحمن خاں شروانی کے نام اس وقت لکھے جب وہ اگست ؁۱۹۴۲ء سے لے کر جون ۱۹۴۵ء ؁ تک قیدوبند کی زندگی جھیل رہے تھے۔ ابتدا میں احمد نگر کے قلعہ میں قیدرہے بعد میں بانکوڑہ جیل میں منتقل کردیے گئے۔ اس دوران قید خانے سے جو پہلا خط اپنے دوست حبیب الرحمن خاں شیروانی کو لکھا وہ ۱۰ اگست ؁۱۹۴۲ء کا ہے اور آخری خط ۱۶؍ ستمبر ؁۱۹۴۳ء کا ہے۔ اور یہی آخری خط سب سے طویل ہے۔ کسی دوسرے مجموعہ میں اتنے طویل خطوط نہیں ملتے جتنے غبار خاطر میں شامل ہیں۔ مولانا آزاد نے یہ خطوط اس لیے لکھے کہ رہائی کے بعد قید فرنگ عظیم تحفہ دنیائے ادب کو پیش کرسکیں۔ اس مجموعہ کے خطوط کے مطالعے سے نہ

صرف مولانا آزاد کی جیل کی زندگی سے پردہ اٹھتا ہے بلکہ ہمیں یہ علم بھی ہوتا ہے کہ فرنگی حکمراں کس قدر احتیاط ہوش جوش اور رازداری سے کام کرتے تھے اور ہمیشہ چاق و چوبند رہتے تھے۔

مکاتیب آزاد

دوسو صفحات پر مشتمل یہ مجموعے ۱۹۴۸ میں وابستان لاہور سے شائع ہوا۔
ان خطوط کے مکتوب الہیم سیدسلیمانندوی، مولاناالطاف حسین حالیؔ ، مولاناثناء اللہ، مولانا محی الدین، احمد غلام رسول مہر، سید سلیمان ندوی اوردوسرے افراد ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۱۵ سے ۱۹۳۷ کے درمیانی عرصہ کو محیط ہیں۔

کاراون خیال

اس مجموعہ میں مولاناابوالکام آزاد کے سترہ خطوط حبیب الرحمن خان شیروانی کے نام ہیں ۔ اس کے علاوہ نواب صاحب کے دس خطوط مولانا آزاد کے نام بھی موجود ہیں۔ یہ خطوط ۴, نومبر ۱۹۴۶ء کے درمیانی عرصے پر محیط ہیں۔ اس مجموعے کو محمد عبدالشاہدخاں شیروانی نے ۱۹۴۶ء میں بجنور سے شائع کیا۔

نقشِ آزاد

اس مجموعے میں مولانا ابوالکام آزاد کے ایک سو چھیانوے خطوط شامل ہیں اور یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ایک سواستی خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۱۴ء سے ۲۱, مئی ۱۹۵۷ء کے درمیان عرصے میں لکھے گئے۔ دوسرے حصے میں آزادکی دیگر تحریرات شامل ہیں۔ مجموعہ کا تیسرا حصہ سولہ خطوط پر مشتمل ہے۔یہ خطوط مکتوب الیہم کے نام ہیں۔ مجموعے کے مرتب غلام رسول مہر ہیں۔ تیسرے حصے کے خطوط زمانی اعتبار سے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۴ء تک کے عرصہ پر محیط ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۷ء میں عطیع علمی پرنٹیگ پریس لاہور سے شائع ہوا۔

میرا عقیدہ

یہ مجموعہ مکتبہ جامعہ سے فروری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ قاضی سیداحمد حسین کا تحریر کردہ ہے۔ان خطوط کے مکتوب الیہم مولانا غلام رسول مہر، مولانا ثناء اللہ امرتسری اورحکیم سعداللہ وغیرہ ہیں۔

تبرکات آزاد

یہ مجموعہ چارمجموعہ ہائے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ مرتب غلام رسول مہر ہیں۔
اس مجموعے میں کل ستانوے مکاتیب اور آٹھ مقالات ہیں۔ پہلا مجموعہ مکاتیب مولوی
محی الدین احمد تصوری اور ان کے والد کے نام ہیں۔ دوسرے مجموعے میں اٹھارہ
خطوط عبدالماجد دریابادی کے نام ہیں۔ تیسرے مجموعے میں اڑتیس خطوط سید سلیمان
ندوی کے نام اور چوتھے حصے '' میرا وعقیدہ '' میں شائع شدہ متفرق خطوط ہیں۔
مکتوب الیہم کی تعداد گیارہ ہے۔

ملفوظاتِ آزاد

یہ مجموعہ مولانا اجمل خاں نے سنہ١٩٥٩ء میں دہلی سے شائع کیا۔ اس
مجموعہ میں مولانا آزاد کے جوابات ہیں جو مولانا اجمل خاں نے قلم سے تحریر کیے
ہیں۔

مولا نا ابوالکلام آزاد کے ادبی خطوط

اس مجموعہ میں مولاناآزاد کے وہ جوابات ہیں جو انھوں نے زبانی طورپر دیے۔
ان میں ادبی سوالات کرنے والی

ہستیوں کے مکتوبات بھی موجود ہیں۔ اس کے مرتب مولانا اجمل خاں ہیں اور دہلی
سے اکتوبر سنہ١٩٦٢ء کو زیورطباعت سے آراستہ ہوا۔

مکاتیب ابوالکام آزاد

مکاتیب ابوالکاآزاد چار سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے جس کو ابوسلمان
شاہجہانپوری نے مرتب کیااور فروری سنہ١٩٦٨ء میں کراچی سے شائع کیا۔

جب ہم ابوالکام کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو ہم دو حصوں میں
تقسیم کرسکتے ہے۔ پہلے تو وہ خطوط جو قطعی

ذاتی اور نجی نوعیت کے ہیں۔ دوسرے وہ مکتوبات ہیں جو مکتوب الیہم کی ہستی کے
برعکس اپنی ذاتی توجہ کا مرکزہےیہ مکتوبات اپنے تحریری انداز کے اعتبار سے
انشائیات مضامین کے درجہ میں آتے ہیں۔ ذاتی اور نجی مکتوبات میں فلسفانہ ، سیاسی،
تاریخی اور عملی مسائل ومباحث ملتے ہیں وہی بے تکلفی اور اپنائیت کی جھلک بھی
ملتی ہےساتھ ہی ساتھ ان خطوط سے مصنف کے اصول اور نظریات کی وابستگی اور
کسی حد تک مخاطب سے نسبت کی بھی وضاحت ہوتی ہےمولاناابولکام آزاد کے ملنے
جلنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہوا کرتا تھا۔ یہ خطوط عمر کے طویل حصے کااحاطہ
محیط کرتے ہیں۔ اس کی مثال ہمیں '' غبارخاطر'' کے ایک خط سے ملتی ہے جو

انھوں نے موالانا عبدالرزاق کانپوری کو بارہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ اور وہ خطوط بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری زمانے میں لکھے تھے۔

میرے لیے نا ممکن ہے کہ میں کسی بات پر یقین لے آؤں جب تک میں'' اسے اپنی عقل کی کسوٹی پر نئے سرے سے نہ پرکھولوں '' ان کا پہلا ادبی کارنامہ '' لسان الصدق '' ہے جو ماہ وار جریدہ ہے جس کی مولانا الطاف حُسین حالیؔ مرحوم نے بہت تعریف کی انھوں نے چودہ سال کی عمر میں مولانا شبلیؔ سے خط و کتابت شروع کردی تھی۔ اور لاہور کے مشہور رسالہ '' مخزن '' میں مضمون بھی لکھے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں شبلی سے آزاد کی ملاقات ہوئی مولانا شبلی نے انھیں مولانا آزاد کا بیٹا سمجھا اور کہا کہ آپ کے والدکے فضل و کمال کے کیا کہنے ہیں۔

مولانا کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۴ء سے ہوتا ہے جب انھوں نے اپنے اخبار الہلال کا اجراء کیا۔ الہلال اس

وقت ہندوستان میں اپنی طرز واحد پرچہ تھا جو اپنی ترتیب اور مواد کے لحاظ سے انگریزی اخبارات سے ذیادہ بہترین تھا۔ اس میں مولانا کا تخیل اور انداز بیان دونوں میں ترقی اور جدت پسندی تھی اور پامال اور فرسودہ راہوں سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی آپ نے مسلمانوں کے قدیم تصورات میں انقلاب کی فوری ضرورت کو تکمیل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس اخبار الہلال کے زریعہ یہ کام کیا۔ سیاسی مضامین کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مسائل پرغور و فکر سے کام کرنے شروع کردیا اپنے تعلمات کے ذریعہ انھوں نے علامہ اقبالؔ کی طرح ہندوستان کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمان کو زندگی کے اہم بنیادی مسائل پرغور و فکر کرنے کا عادی بنایا۔

الہلال کو دو تین مہینوں میں ہندوستان کے مسلمانوں میں جو قبولیت حاصل ہوئی اس کوئی مثال نہیں ہے یہ ترقی پسند سیاسی تخیلات اور عقل پر پوری اُترنے والی مذہبی ہدایت اور بلندیہ ادب کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ حکومت نے ۱۹۱۷ء میں اس پر بندی عائد کردی اس کے بند ہوجانے کے بعد مولانا آزاد نے '' ابلاغ'' نامی اخبار جاری کیا ابھی کچھ مہنے ہوئے تھے کہ اپریل ۱۹۱۶ ء کو حکومت نے بنگال میں مولانا کو صوبہ بدر کردیا۔

۱۹۲۱ء میں گاندھی جی سے ملاقات کے بعد وہ پوری طرح سیاست سے جوڑ گئے اور سیاسی کاروائیوں میں ہمشہ پیش پیش رہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتے کی کو شش کی لیکن انھیں مایوسی حاصل ہوئی۔ ۱۵ ، فروری ۱۹۴۰ء کو کانگریس نے آپ کی صدارت میں سب سے پہلی انفرادی ستیہ گرہ شروع کی تھی۔

چنانچہ مولانا آزاد پوری طرح سیاسی خدمات میں شامل ہوگئے۔ سیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نثری صلاحیتوں سے مسلمانوں میں انقلاب کو بیدار کرتے رہے۔ مولانا آزاد کا طرز تحریر کے کئی ادوار ہیں لسان الصدق کے دور میں جو سادگی اور بے تکلفی ہے وہ الہلال کے دور میں جزات و شوکت میں تبدیل ہوجاتی ہے اس طرح ترجمان القرآن اور غبارہ خاطر کا دور سلاست ، نفاست کا نمونہ کمال کی حدپہنچ جاتا ہے۔ اور یہی مولانا کا حقیقی اسلوب ہے۔ جس میں انھوں نے اُردو کی بہترین نثر اسی معیار پر لکھی ان کے نثر میں ظرافت کی چاشنی سنجید گی کے ساتھ شگفتگی کے ساتھ ایک تجزباتی اسلوب جس میں ہر موضوع میں تمام مضمرات و اشارات کی تشریح ایک ترتیب کے ساتھ منظم طورپر منطقی انداز کی جاتی ہے اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ معافی و مفاہیم کی گرہوں پر گرہس کھلتی چلی جارہی ہیں پھر زورو بیان ایسا ہے کہ قاری کا ذہین اس روپر بہتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال مولانا کے نثر خطوط نگاری کی بات کی جائے تو، خطوط نگاری ایک موضوعی صنف آدب ہے یہ دوسری تمام صنفوں سے زیادہ شخصی ہے اس کو باواسطہ خود نوشت سوانح عمری بھی کہہ سکتے ہیں۔یہ پورے معنوں میں ادب کی ہیت ہے گرچہ اس میں رسمی طورپر ایک ضمیر حاضربھی ہوتی ہے۔ کچھ غائب کے تذکرے اور حوالے بھی ہوتے ہیں لیکن مرکز نظر صرف ضمیرمتکّلم واحد متکّلم ہوتی ہے بات من (دل) نو سے شروع ہوتی ہے لیکن آخر سوامن کے کچھ ذیادہ نہیں رہ جاتا ہے۔ من وہ تو ایک دوسرے میں شیر و شکر نہیں ہوتے بلکہ صرف من ، تو کو اندر جذب کرلیتا ہے اس لیے کہ تو شروع ہی سے آئینہ من کے لیے ایک زنگار مہیا کرنے کے لیے لایا جاتا ہے۔ اس طرح مخاطب خود کلامی پر ختم ہوجاتی ہے۔

لہذا شخصیت کی آن اور شان جو خط نگاری کا اصل سرمایہ ہے خطوط نگـاری شخصیت کا اظہار ہے ابوالکام آذاد عظیم شخصیت کے مالک جس میں وسعت عمق اور رفعت کے تنـوں ابعـاد موجـود تھے اور ایک صـحت مند و متـوازن ذہین رکھـتے تھے۔ اپـنے مقاصد کی محرومیـوں اور عـزائم کی تشـنہ کـامیوں کے بـاوجود وہ ایک آسـودہ طعبیت اور ہموار کرِدار کے مالک تھے۔ ان کی خطوط نگـاری کا محـرک نہ تو مظـاہر شخصیت ہے اور نہ تزکیہ نفس۔

۱۔ غالب کے خطوط (جلداوّل) .ڈاکٹر خلیق انجم ص۷۵۱،۸۵۱

۲۔ اطراف غالب ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص۷۹۲

۳۔ تاریخ نثر اُردو ۔احسن مارہروی ص۹۶

۴۔ داستان تاریخ اُردو ۔حامد حسین قادری ص ۴۷۲

۵۔ دور جدید کے اردو خطوط کا مجموعی جائزہ ۔عبدالطیف اعظمی ص۴۱

۶۔ مکتوب اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء غیر مطبوعہ ۔خواجہ احمد فاروقی ص۹۷

۷۔ انشائے بہار بے خزاں ۔غلام امام شہید ص۳۴، ۴۴

۸۔ ذوق وجستجو ۔خواجہ احمد فاروقی ص۹۴۱

۹۔ ذوق وجستجو ۔خواجہ احمد فاروقی ص۰۵۱

۱۰۔ نثری ادب کاارتقاء ۔ڈاکٹر شہنازانجم ص۲۹۲

۱۱۔ ذوق وجستجو ۔خواجہ احمد فاروقی ص۲۵۱

۱۲۔ انشاء بے خبر ۔خواجہ غلام غوث بے خبر ص۹۱

۱۳۔ مطالعہ خطوط غالب ۔عبدالقوی دسنوی ص۹

۱۴۔ مطالعہ خطوط غالب ۔عبدالقوی دسنوی ص۱،۲

۱۵۔ اُردو مکتوب نگاری ۔علی احمد قاصمی ص۸۶۱

۱۶۔ موعظہ حسنہ ۔مولوی نذیر احمد ص۴

۱۷۔ مکتوبا ت حالی (جلد اول) ۔سجادّ حسین ص۱۴۱

۱۸۔ مکتوبا ت حالی (جلد اول) ۔سجادّ حسین ص۱۶۱

۱۹۔ مکتوبا ت حالی (جلد اول) ۔سجادّ حسین ص۲۱۱

۲۰۔ مکتوبا ت شبلی ۔سید سعلمان ندوی ص۹۴

باب سوم
خطوط غالب کا سماجی ادبی پس منظر
(عہد غالب)

غالبؔ کے خطوط کے مطالعہ سے اُس عہد کے سماجی، ادبی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے خطوط سے نہ صرف اُس عہد کی سماجی کڑیو ں کی حقیقی تصویر ملتی ہے، بلکہ ہمیں اس عہد کی تہذ یبی، تاریخی، سیاسی، اور ادبی معاشرتی حالات سے

واقفیت بھی ہوتی ہے۔ غالب کے خطوط کی اہمیت اور مقبولیت اس کی سادگی، سلاست، اوربے تکلفی ظرافت و شوقی کہ ساتھ اپنے عہد کی عکاسی ان خطوط میں جان ڈالتی ہے۔ غالب کے خطوط ان کے عہد کے حقیقی مرقعے ہے اور ہمارے سامنے غالب کو اور اُن کے عہد کو مکمل طورپر لاکر کھڑا کردیتے ہیں۔

غالب کے عہد کا سماج:

غالبؔ کے عہدکی ابتدا ء میں مغلیہ سلطنت کا زوا ل شر وع ہوچکا تھا۔دہلی کے تخت پر شاہ عا لم تخت نشین تھے۔ غلام قادر کے چنگل سے نکلے تو مہادجی سند ھیا مراہٹہ نے دہلی پر قبضہ جمایا اور مغلیہ سلطنت کے مالک بن بیٹھے۔ انگریزوں کی مر ا ہٹوں سے جنگ چھڑی اور انگر یزی فوج ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء کو دہلی میں داخل ہو گی۔ شاہ عا لم نے مقا بلے پر آ نے کے بجا ے جنرل لیک کا شاہی دربار میں استقبال کیا ۔ جنرل آکٹرلونی (اخترلونی) دہلی میں انگریزی ر یذ یڈ نٹ مقرر ہواتواُسے شاہ عا لم نے بہادر شاہ ظفر جنگ کاخطا ب دیا۔ دہلی کے آس پاس کے علا قوں میں انگریزی سامراج کی گر فت مضبوط ہوگئی۔اب بھی سِکّے پر بادشاہ کا نام کندہ ہوتا تھا۔ تمام سرکاری اعلانوں میں یہ فقرے دہرا ئے جا تے تھے کہ '' خلق خدا کی ، ملک بادشاہ کا، اور حکم کمپنی بہادر کا ''تا کہ عوام کو سیا سی حقیقت کی اطلاع ہو تی رہے۔ جاگیرداروں کی وراثت کی تو ثیق کے لیے ابھی شاہی مہر استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن اب اسے استعمال کرنے والا بادشاہ نہیں بلکہ انگر یزی ریذ یڈ نٹ تھے ۔ دہلی کے شروع کے ریذیڈنٹ، آکٹرلونی اور سٹین نے اپنے مفاد اور فائدے کے واسطے جان بوجھ کر مغل بادشاہ کے اقتدار کو باقی رکھاتھا۔

شاہ عالم کے انتقا ل پر اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶میں تخت نشین ہوئے انہوں نے ۳۱ برس حکو مت کی ۔ ان کی حکومت میں لال قلعے میں انگریزی ریذیڈنٹ کا عمل دخل بڑھتا گیا۔ انگریزی گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ نے سِکّے پر سے بادشاہ کا نام ہٹا دیا ۔ انگریز جو مغل بادشاہ کی آڑ میں پہلے ہی سیاہ و سفید کے مالک بن گئے تھے ۔اب کھلم کھلا سامنے آگئے تاکہ ان کے اقتدار کے متعلق شمالی ہند کے لو گوں کو کسی شک وشبہ کی گنجائش با قی نہ رہے۔شروع میں یہ طریقہ تھا کہ دوسرے درباریوں کی طر ح ر یذ یڈ یٹ بھی شاہی دربار میں اس وقت تک کھڑا رہتا تھا جب تک بادشاہ دربار میں موجود رہتا تھا۔ ہا کنس نے پہلی مرتبہ اس رسم کو توڑا او ر شاہی دربار میں بیٹھنے کو کرسی طلب کی ۔ ہاکنس کے خود پسند انہ روّیے کی اطلاع جب گونر جنرل کو ہوئی تو اس نے اس کو دہلی واپس بلا لیا۔ اس کی جگہ ولیم فر یز ر کو ر یذ یڈنٹ مقرر کیا ۔جو نہایت معا ملہ فہم اور قا بل شخص تھا ۔وہ فارسی زبان جا نتا تھا۔ اس نے پنشن کے معا ملے میں نواب شمس الدین احمد خان کے مقا بلے میں غالب کی حوصلہ افزائی کی تھی ۔

دہلی کے امیروں کا انگریزی حکمرانوں کے ساتھ جو ربط و ضبط بڑھا اور راہ و رسم پیدا ہوئی ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود انگریز لوگ دیسی طور طریقے اختیار کرنے لگے اور دوسرے یہ کہ ہند وستا نیوں نے مغر بی انداز ِ فکر سے واقفیت حا صل کی۔ ان انگر یزحکام کو کلکتہ کے فورٹ ولیم کا لج میں فارسی اور اردو کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ ان زبانوں کے ذریعے مقامی حالات سے آگاہی حاصل کریں ۔ اہل ہند کی زندگی کو بہتر سمجھے بغیر اس ملک میں اچھا انتظام قائم کرنا ممکن نہ تھا کیوں کہ مغلیہ دربار کی زبا ن فارسی تھی اس لئے جو حکام دہلی سے بھیجے جاتے تھے وہ فارسی میں وقفیت رکھتے تھے ؎ ۱۸۱۰ء میں جب غالبؔ کی عمر تیرا برس کی تھی اُن کی شادی مرزا الہٰی بخش خان معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ چار پانچ سال آگرہ میں رہنے کے بعد وہ مستقل طورپر دہلی آگئے۔انھوں نے اپنے سسرال کے تعلقات سے دہلی کے اونچے طبقے میں راہ و رسم پیدا کرلی تھی۔ لیکن غالب کو یہ محسوس ہوا کہ یہاں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سوائے اس کے جو مرزا الہیٰ خان معروف کے داماد ہونے کے باعث انہیں عز ّت حاصل تھی۔غالب انگریزی سرکار اور مغلیہ دربار دونوں جگہ اپنا اثرو رسوخ بڑھنا چاہتے تھے۔

بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے جوڑنے اور بادشاہ کے اُستاد ہونے کے باوجودجو ّے کا اڈا چلانے کے جُرم میں قید بھی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ر ئیس زادوں کے جیسے شوق، شراب نوشی، جو ّے کی عاداتیں اپنالی تھی۔اس کے باوجود غالبؔ کے شعر و سخن کا چرچا بھی عام تھا۔مغل عہد کے اس دور میں دہلی کے اندر علماو فضلاء شعراء اور ادباء کا ایک مجموعہ تھا۔ اکثر مشاعرے لال قلعہ کے شہزاد وں کے ایوان خانوں میں ہوا کرتے تھے کیونکہ شہزادوں کو بھی شعر و سخن کا شوق تھا۔یہ مشاعروں کی محفلیں دیر رات چلتی تھی۔ اور کئی دن تک شعراء کے کلام کے چرچے ہوتے رہتے تھے۔ اس کا ذکر غالب نے نواب مصطفےٰ خان بہادرکے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

نواب مصطفےٰ خان بہادر کو لکھے خط کا اقتباس

نواب صاحب مشاعر ے میں تشریف نہیں لے گئے مجھے جانے کی رخصت دی۔ میں نے ریختہ“ گویوں کی انجمن میں بہت سے شاعروں کا مجموعہ دیکھا۔ لمبی لمبی غزلیں ان لوگوں نے پڑھیں۔ یہاں تک کہ جب میں گھر واپس آیا اور بستر پر لیٹا تو آدھی رات گزرچکی تھی۔“ ۱؎

لال قلعے میں اُس وقت کی ادبی انجمن میں غالب بھی برابر شریک رہتے تھے۔ مگر لال قلعے میں باقاعدہ اور مستقل تعلق اس وقت ہوا جب بہادُر شاہ ظفر کی جانب

سے انہیں خطاب دیا گیا اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ کی عوِض فارسی زبان میں خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے کی ذمہ داری دی گئی۔ذوقؔ کے انتقال کے بعد بادشاہ نے غالبؔ کو اپنا اُستاد بھی بنادیا تھا۔کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ کی مالی حالت کچھ کم ہوگئی تھی۔ جہاں تک ممکن تھا غالب کی قدرو عزت ہوتی رہی ۔ لیکن اس ہنگامے نے تیموری بزم کے آخری چراغ کو بھی بُجھا دیا۔ لال قلعے کی بزم کا خاتمہ ہونایہ ہنگامہ غالبؔ کے لیے معمولی سیاسی انقلاب نہیں تھابلکہ تہذیبی قدروں کی بربادی تھی جو غالب کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھیں۔

۱۸۵۷ء ہنگا مے کے دوران دِلی کچھ مہینے باغی سپاہیوں کے ہاتھوں میں رہی پھر دوبارہ انگریزی فو جوں کا قبضہ ہو گیااور پورا شہر فوجی چھاؤنی بن گیا۔ جگہ جگہ پہرے لگے۔ قتل عام ہوا اور لوٹ مار ہوئی خونی تاریخ دہرائی گئی۔ غالب اُس وقت جس مکان میں رہتے تھے وہ مکان شریفی خاندان کے مکانات میں سے تھا اس لیے غالب مہاراج پٹیالہ کے سپاہیوں کی حفاظت میں رہے۔ اس بات کا ذکر غالب نے مرزا ہر گوپال تفتہؔ کو لکھے خط میں کیا ۔اُس خط کا اقتباس ملا خطہ فرمائے۔

میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اوراس محلہ کا نام بھی بلی ماروں محلہ ہے لیکن ایک” دوست اس جنم کے دوست میں نہیں پایاجاتا۔واللہ ڈھونڈ نے کو مسلمان ملتا،کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ سہنودالبتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔ اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نودس برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیابلکہ دیوار بہ دیوارہیں گھر حکمیوں کے اور وہ نوکرہیں راجا نرندرسنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبان عالی شان سے عہدلے لیا تھاکہ بروقت غارِت دہلی، یہ لوگ بچ رہیں چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آبیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور شہرکہاں؟۔“ ۲؎

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ہمہ جہت تباہ کاریاں غالب نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور ان تمام حالات سے وہ خود گزرے تھے ۔ جس کا ذِکر انھوں نے اپنے خطوط میں شدّت سے کیا اور اپنے دوستوں کو خطوط کے ذریعہ احساس دِ لاتے رہے کہ غالبؔ اس ناگہانی انقلاب کے عذاب سے گزر رہے ہیں۔اس بات کا ذکر اپنے دوست علائی کو لکھے خط میں کرتے ہیں۔ اقتباس ملا خطہ فرمایا۔

اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم ” تحصیل کیا۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے

پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آ تا جا تا ہوں۔وہ دلی نہیں جس میں میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ایک کیمپ ہے۔" ۳؎

اس خط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ غالبؔ نے اپنے دوست علائی کو اُس وقت کے دِلی کی یاد دِلائی جس وقت غالبؔ اور علائی علم کو پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے دِلی کا نقشہ بدل دیاجہاں غالبؔ اکیاون برس سے رہتے تھے وہ دِلی آج فوجی کیمپ میں تبدیل ہوگیا ہے۔

غالبؔ کے خطوط میں ان کی زندگی کے تمام ترحالات و کیفیات ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے جو تباہی و بربادی دلی اور دلی والوں کی ہوئی تھی ۔ مکانات و دوکان ڈھائے گئے۔مالی نقصانات کے ساتھ جانی نقصان بھی ہوا۔ غالبؔ کے کئی عزیزوں ، دوستوں اور شاگردوں کی جان بھی گئی ۔دِلی کی عظیم الشان عمارتیں ڈھائی گئی۔جامع مسجد سے راج گھاٹ تک کا علاقہ ویران میدان میں تبدیل ہوگیا۔جس کا ذِکر غالبؔ نے میرمہدی مجروحؔ کو لکھے خط میں کیا۔

" جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا ذُکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔"دارالبقا فنا ہوجائے گی"۔رہے نام اللہ کا۔خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑتک ڈہے گا۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیرو عافیت ہے۔" ۴؎

''رہے نام اللہ کا اور باقی خیرو عافیت'' اس خط میں غالب نے دو جملے بیان کرتے ہوئے اپنی ذہنی کرب کا اظہارکیا ہے۔ مسجد جہانی جو مغل حکومت کی رونق کی گواہی دیتی تھی وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہونے سے نمازیوں اذانوں اور مسجد سے محروم ہوگئے تھے۔

دلّی کے علاوہ دوسرے شہروں مثلاً لکھنو ء میں جو فساد ہوئے وہ جلدی ختم ہوگیا۔ ٹوٹی ہوئی عمارتوں کی جگہ نئی تعمیرات نے لی۔ لیکن دلی میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ اس بات کا غالب کو بہت افسوس تھا اگردلی کی تبا ئی کے بعد پھر سے تعمیرات ہوجاتی اور دِلی میں ایسا امن ہوجاتا جس سے لوگ اپنی عزت اورعافیت کو محفوظ سمجھ کر چین سے رہتے۔ اس بات کا ذِکر غالبؔ نے اپنے کئی خطوں میں کیا ہے۔ میر مہدی مجروحؔ کو لِکھے خط میں اس بات کا ذکر ملتا ہے۔

بھائی لکھنوء میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عمل داری میں ایسا امن و امان ہوگا نہ اس فتنہ " وفساد سے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہوگا۔ٗامراء اور شرفا کی حکام سے ملا قاتیں۔بہ قدر رتبہ تعظیم و توقیر نہیں پنشن کی تقسیم علی العموم آبادی کا حکم عام لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔" ۵؎

اس خط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غالبؔ شہر لکھنوء کی تعمیر نو کے خیال اور اُمید سے خوش ہیں وہ ایک نئے معاشرے نئے نظام کا دل سے اِستقبال کرتے ہیں۔ ایسا معاشرہ جو امن وعافیت اور انسانی زندگی و وقار کی حفاظت کا ذمہ دار ہو۔ لہٰذا مکاتیبِ غالب کے حوالے سے اُس عہد کی زندگی اور معاشرت کے جن پہلو ؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالب نے تہذیب و تمدن، علوم و ادب، فرد کی آزادی سماجی حالات عوام کے شوق و ذوق تفریح حکومت کے نظم اور اس کے مختلف شعبوں کی کارکردگی اور معاشرت کے کچھ پہلوؤں کے بارے میں اپنے خطوط میں اشارے کرتے ہیں۔ جس سے ہمیں آج بھی اُس گذرے ہوئے زمانہ کے ماحول سے آگاہی ہوجاتی ہے۔

عہد غالبؔ میں رقص و سرور کی محفلیں بھی آراستہ کی جاتی تھیں اور ناچ گانے کا رواج عام تھا۔ عوام اور امیرو اُمراء ان محفلوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس محفل میں امیر وامراء اپنے پسند کے شاعر کا کلام کسی قوال یا گویے سے پڑھواکر سنتے تھے ۔غالبؔ کا کلام بھی اس محفل میں پڑھاجاتا۔ غالبؔ کے سسرال کے ایک رشتے دار نواب صاحب امین الدین احمد خان غالب کا کلام بے حد پسند کرتے اور غالبؔ سے اچھے اور تازہ کلام کی ہر وقت فرماش کرتے تھے۔ان محفلوں سے ہمیں اُس دور کے لوگوں کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزلوں میں فارسی اور اُردو کلام شامل ہوتا تھا۔جس کا ذکر غالب نے علائی کو لکھے خط کی ایک عبارت میں کیا۔

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں اور فارسی عزلیں دو اُردو غزلیں اپنے حافظے کی" تحویل میں بھیجتا ہوں بھائی صاحب کی نذر۔" ۶ـہ

اس خط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے اُس دِورمحفلوں میں قوال اور گویے گانے میں غزل کے اشعار استعمال کرتے تھے۔ غالب کی اُردو اور فارسی کی غزلیں بھی اس محفل میں پڑھی جاتی تھیں۔

غالب کے خطوط میں گویوں کے علاوہ دوسرے پیشے کے لوگوں کا ذکر بھی ملتاہے ۔اُس معاشرے میں حُقّہ کااستعمال خاص طورپر اُمراوشرفا کے یہاں ہوتا تھا۔ حقہؔ کی نلیاں بنا نے والے پیشہ ور بھی بازار میں موجود تھے۔ان کو نیچہ بند کہا جاتا تھا۔ اس کا ذکر غالب کے خط سے ملتا ہے جو انھوں نے تفتہؔ کو لکھا۔

خط کا اقتباس۔

مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو، دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتابلکہ تم اُس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں " نیچہ بندتو میسّر نہیں صحاف اور نقاش کہاں۔" ۷ـہ

اس خط کے اقتباس میں غالبؔ نے تفتہؔ سے یہ بات کہی کہ دلّی کی بربادی کی وجہہ سے دلّی میں پیشہ وروں کی کمی ہوگئی ہیں نیچہ بند یعنی حُقّے کی نالیاں بنانے والے لوگ نہیں ملتے تونقاش اور صحاف کہاں سے ملے گے

غالبؔ کے خطوط میں اُس عہد کے پیشہ وروں میں کا ایک پیشہ ‘‘بھاٹ ’’ کا بھی تھا ،جو گیت سناتا اور دردر جاکرجھوٹی بازاری تعریف کر کے لوگوں سے پیسے وصول کرتا ۔ اس پیشہ کا ذکر غالب نے اپنے خط میں کیا اس کے علاوہ پھیری والے جو کتابیں لے کر گھومتے رہتے اہل ذوق ان سے کتابیں خرید تے۔ اُس عہد میں ایک پیشہ ‘‘ ہر کارہ ’’ بھی ہوا کرتا تھا جو گھر کے کاموں کے لیے رکھاجاتاتھا۔جو گھر کے ہر کام کرنے کو تیار رہتا تھا۔ غالب کے یہاں بھی ہرکار تھا جو اُن کے ذاتی کام کرتا تھا۔

‘‘کہا ر’’ خدمتی پیشہ ہے جس کا ذکر غالبؔ کے خط میں ملتا ہے۔ ‘‘ کہار ’’ جس کا کام پانی بھرنا، پالکی اُٹھاکر سفر کے ساتھ چلتے رہنا وغیرہ کام کرتا تھا۔ ان تمام پیشوں کا ذکرغالب کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔عہدِ غالب میں کم دوری کا سفر پیدل طے کیا جاتا تھا۔ مگر امرا ء و شرفاء جب سفر کرتے تو ان کے ساتھ بڑے لوازمات ہوتے تھے۔ غالب نے بھی ایک سفر کا ذکر اپنے ایک خط میں کیا جو علائی کو لکھا تھا۔

ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کرایہ کروں، کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں۔ آٹھ” کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں، دو یہاں چھوڑ وں،دو ساتھ لوں، چل دوں۔رامپور سے جو لفافہ آیا کرے گا، لڑکوں کا حافظ لوہاربھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہوسکتی ہے شراب مل سکتی ہے”کہار“ بہم پہنچ سکتے ہیں طاقت کہاں سے لاؤں۔“۸ـہ

غالبؔ نے اپنے عہد میں سفر میں استعمال ہونے والی سواریوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے

کہ سفر میں سانڈنی، اوٹنی ، اونٹ ٹٹو اور گاڑیاں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ پالکی اور ڈولی کا بھی ذِکر ملتا ہے۔ بارش کے دنوں میں گاڑیوں کا ذیادہ استعمال ہوتا تھاسفر کے دوران کہار بھی ساتھ رکھے جاتے تھے۔

عہدغالب کے لوگ کھانے کے شوقین تھے ۔ اُس معاشرے میں کھانے کی مختلف چیزیں استعمال ہوتی تھی ۔ غالب بھی کھانے کے شوقین تھے۔ اُن کے دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے کی چیزیں ہوتی تھیں۔ اس کا ذِکر غالب نے اپنے خط میں کیا جو علائی کے نام ہے۔ اقتباس۔

خصی ؔ بکروں کے گوشت کے قلیے، دوپیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھارہے ہو مجھ کو" خداکی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آیا ہو، خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو مّیسر نہ آیا ہو، کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اُس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تویہاں میں رشک سے اپنا کلیجا چابنے لگتا ہوں۔"
۹ے

اس خط کے اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُس عہد کے لوگ مختلف قسم کے کھانے پسند کرتے تھے۔لیکن دِلّی کے ہنگامے کے بعدغالبؔ کو اعلیٰ قسم کے کھانے تک میسّر نہ ہوئے۔

غالبؔ کے اس عہد میں آم ، انگور، املی اور کریلے کا ذکر بھی ہیں جو اس عہد میں استعمال ہونے والی خاص چیزیں تھی۔ نشہ آوار اشیاء میں افیون کا استعمال خاص طورپر ہوتا تھا ۔ امراء اور نوا بین اس کا استعمال کرتے تھے اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوتے تھے۔ عہد غالب میں علاج کا جو طریقہ رائج تھا آج وہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ جو نکیں لگوائی جاتی تھیں اور اس سے فاسد خون باہر نکالاجاتا تھا اُس کے ساتھ دست آوار دوا بھی استعمال کرائی جاتی تھی تاکہ معدے کا فاسدباہر نکل جا ئے۔ اس عہد میں طب یونانی کا چلن بھی عام تھا۔

دسہرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقر ر ہوئی ہوگی، کہیں دیوالی کی تعطیل تک نوبت نہ پہنچ جائے۔۱۰ے

غالب ؔ کے خطوط میں موجود میلوں ٹھیلوں کی کیفیت اس عہد کے معاشرے کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ اُس عہد کے تہواروں میں دسہرا ،دیوالی، ہولی اور ڈھلینڈی کے جشن کا ذِکر بھی ملتا ہے۔اس کاذِکر غالبؔ نے تفتہؔ کو لکھے خط میں کیا ہے۔

خط کا اقتباس ملاخطہ فرمائے۔ غالب تفتہؔ کو لکھتے ہیں۔

غالب کے خطوط میں پارسیوں کے جشن کوسہ برنشین کا ذکر بھی ملتا ہے۔ پارسیوں میں یہ جشن بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتاتھا۔غالب نے اس کا ذکر علائی ؔکو لکھے خط میں کیا۔ اِس ماہ مبارک میں امضاے حکم سرکا ر کا وہ ہنگامہ گرم ہوکہ پارسیوں کی "عیدِ کوسہ برنشیں"کا گماں گزرے دور کیوں جاؤ۔ ہولی کی دھلینڈی کا سماں لوہارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑی دھوم سے نکلے۔حسن اتفاق یہ کہ یہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور"عید کوسہ برنشین" کا زمانہ باہم ہے۔" ۱۱ے

اُس اقتباس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اُس عہد کے لوگ اپنے سماج کے تہوار مناتے تھے۔پارسی سماج اور ہندو سماج کے تہوار کوسہ بر نشین اور ہولی کا ذِکرکیا ہے۔ حسنِ اتفاق یہ ہوا کے ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو یہ دو تہوار با ہم منائے گے۔

جس طرح تہوار اورجشن پر اس عہد کے معاشرے کے لوگوں کو یقین تھا اُس طرح تو ہمات یعنی وہم پرستی کا رواج بھی تھا ۔لوگ جادوٹونے پر یقین رکھتے تھے۔ اُس عہد میں جادوگری کا پیشہ بھی تھا۔جادوگر جادو وسحرسے اِنسان کی بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔ سحر و دفعِ بلا کو دور کرنے کے لیے جادو کا استعمال کرتے تھے۔ جس کا ذِکر غالبؔ کے خط میں ملتا ہے جب علائیؔ نے اپنے والد نواب امین الدین خان کے بیماری کی وجہہ سحر و جادو بتایا تو غالب نے اس خط کے جواب میں لکھا۔

خط کا اقتباس۔

اسما و آیات شفا بخش مقرر ہیں۔ درِ سحر و دفع بلا ان کے ذریعے سے متصورہے۔ لیکن ان ملآوں" اور عزائم خوانوں نے تہہ توڑدی ہے۔ کچھ نہیں جانتے اور با تیں بکھا نتے ہیں۔ تمہارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرئے گا، بے چارہ الگ ایک ایسے گوشے میں رہتاہے کہ جب تک خاص وہاں کا قصد نہ کرئے،کبھی کوئی وہاں نہ جائے۔ یہ خیال عبث۔" ۲۱ے

اس اقتباس میں غالب نے علائیؔ کویہ بات بتائی ہے کہ بیماروں کے لیے آیات شفاء مقرر ہے جس سے سحر دفع بلا دور ہوجاتی ہے۔

غالب کے عہد میں اُ مراء و شرفاء کی معاشرت پر نظر ڈاتے ہیں تو اُس عہد کے طور طریقوں کا پتا چلتا ہے۔اُس معاشرے میں شرفاء کی زندگی عام عوام سے مختلف تھی۔ ان کے رہن سہن، میل جول، اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ جُدا تھا۔ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جب کوئی اعلیٰ مرتبہ شخص ان کے گھر مہمان بنا کر بازدید(ملنے آتا) تومیزبان اُسے لینے جاتا۔ غالبؔ کے ساتھ بھی اس طرح کا ایک واقعہ پیش آیا جب رائے اُمید سنگھ بہادر جو سیکریڑی مغرب وشمال کے دفتر میں فارسی کے مُترجّم تھے وہ غالبؔ کے یہاں تشریف لائے توغالب اپنی بیماری کے وجہہ سے ان کی بازدید کو نہیں جا سکے۔ جس کا ذِکر اُنھوں نے تفتہؔ کے نام خط میں کیا۔

اقتباس

بہ ہر حال، میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں بازدید کو نہیں گیا۔ شاید وہ آج گئے ہوں یا جاویں، پھرا" کبر آباد کو جائیں گے۔ میں آج آدمی اُن کے پاس بھیجوں گا۔" ۱۳ے

اسی طرح اور ایک معمول تھا کہ کوئی بھی شخص اطلاع کیے بغیر نہیں جاتا اگر چلا بھی جائے تویہ بات خلاف معمول ہوتی۔ اس با ت کااندازہ بھی غالب کے خط سے ہوتاہے ۔ ایک دن راجا امید سنگھ غالب کے یہاں اچانک تشریف لے گئے۔ اس بات کو غالب نے تفتہؔ کے نام خط میں لکھا۔ اقتباس

آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن، کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ راجا امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔“ ۱۴ ؎

عہد غالب کے آداب معاشرے میں ایک بات یہ بھی تھی کہ شرفاء کو اپنی عزت و آبرو کا بہت خیال رہتا تھا۔ کوئی ایسی بات جو اُن کے یا اہل خانہ کے شان و عزت کے خلاف ہوتی تو وہ اس سے احتراز کرتے تھے۔ مثال کے طورپر بازار میں یا راستے پر گفتگو کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ ان کے ملازمہ بھی اگر راستے میں کسی سے ہم کلام ہوتی تو اسے بھی عیب سمجھاجاتا۔ غالب کی ایک ملازمہ جس کا نام و فادار تھا۔اس کی حرکت کا بیان غالب نے علائی کو نہایت دلچسپ انداز میں لکھا ہیں۔

بی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمہاری پھوپھی نے ا نھیں وفاداربیگ بنادیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سود توکیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔“ ۱۵ ؎

غالب کے عہد میں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ چھوٹوں اور بڑوں کے مرتبہ کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔اگر کوئی عمر میں چھوٹا ہوتا تو اس کودعا دینے کا رواج تھا۔ اگر کوئی بڑا یا دوست ہوتا یا عمر میں برابر ہوتاتو اُسے سلام اور اُستاد کے لیے بندگی کئی جاتی اور کوئی سید ہوتا تو اس کے لیے غالب دورد کا لفظ استعمال کرتے تھے۔اس کا ذکر غالبؔ نے علائیؔ کے نام لکھے خط میں کیا۔اقتباس

اُستاد میرجان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی اُن کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے” ہیں۔ دعا، اور اِس رُد سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کم و بیشی سن وسال کی رعایت نہیں کرتے سلام اور اس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں بندگی اور اِس نظر سے کہ یہ سیّد ہیں درود۔“ ۱۶ ؎

عہد غالب میں غریب غُربا و مسکن کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ دولت مند لوگ اِن کے لیے وجہ معاش مقرر کرتے تھے اور ان سے دُعائے خیر کے طالب رہتے تھے۔ اُمرا ء و شرفاء ، غریبوں کے لیے وظیفے مقرر کیا کرتے تھے۔

غالبؔ کے عہدمیں گھروں میں مختلف کاموں کے لیے نوکرانیاں رکھی جاتی تھیں اورنوکرانیوں کو مختلف کاموں کی مناسبت سے مختلف ناموں سے جانی جاتی تھیں۔ایک

لونڈی جومتعدد کام کرتی، دوسری چھن یہ گھر کی ترئیں کاری کے کام کرتی تھی، تیلن اور تنبولن جن کا کام تیل اور پان بیچنا ہوتاتھا،پنساری جو آٹا پیسنے کے کام کے لیے ہوتی تھی۔ ان پیشہ وار اور خادماؤں سے بھی اس عہد کی معاشرت کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔غالب نے ان تمام پیشوں کا ذِکر اپنی اس حویلی کے لیے کیا جو علائیؔ کے توسط سے غالب کو ملی تھی۔وہ علائیؔ کولکھتے ہیں۔ اقتباس

یہ سمجھ کو خلوت خانے کو محل سرابنایا چاہتا تھا کہ گاڈی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پسنہاری، ان فرقوں کا ممر وہ دروازہ رہے گا۔“ ۱۷ـہ

عہد غالب میں بچوں کو درس دینے کے لیے مولوی رکھے جاتے تھے۔اُس دور کی معاشرت میں گھروں کے اندر مکتب کے لیے ایک جگہ مخصوص ہوتی تھی اور مولوی صاحب گھر کے مالک اور نوکرانیوں کے بچوں کو وہاں پڑھاتے تھے۔ شرفاء میں علم کاذوق تھا اور اس کہ ساتھ اپنی نوکرانیوں کے ذمہ داری کا بھی احساس تھا۔ غالب کے ایک خط میں یہ مثال ملتی ہیں جس میں غالب نے اپنے اسی مکان کے اندرونی حصّے جو علائیؔ کے توسط سے ملا تھا اس کاذکر علائیؔ کو لکھے خط میں کیا۔ خط کا اقتباس ملا خط فامائے۔

معہذا اُس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے مکتب کے لیے ہر گز کافی نہ جانا۔“ ۱۸ـہ”

عہد غالبؔ میں مکان کو عام طورپر دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ پہلا حصّہ دیوان خانہ جس میں گھر کے مرد رہتے اور دوسرا حصّہ محل سرا ہوتا جوعورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ امرا وشرفا کے مکانات بڑی حویلیوں کی شکل میں ہوتے تھے۔ نوکرنیوں کی اور خادماؤں کی ضرورت ہوتی تھی اِس لیے ان کو رہنے کے لیے مکان میں علا حدہ گزرگاہ دیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ مکان میں ایک حصّہ بالا خانے کے نام سے ہوتا تھا جس میں ایک دالان ہوتاتھا۔ غالبؔ دالان میں ہی قیام کرتے تھے۔

مکان میں ایک توشہ خانہ ہوتا تھا جس میں خانہ داری کے سامان اور لباس رکھا جاتا تھا۔کرایہ کے مکان اس طرز کے نہیں ہوتے تھے ۔کرایہ کے مکان میں کبھی دیوان خانہ ہے تو کبھی محل سرا نہیں کبھی توشہ خانہ ہے تو کبھی بلا خانہ نہیں۔ اس بات کا ذِکر غالبؔ نے علائیؔ کو لکھے خط میں کیا ہے۔

خط کااقتباس

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے” مول لے لی۔آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کردو۔ اب مجھے

فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہمدگر ایسی ملیں کہ ایک محل سرا اور ایک دیوان خانہ ہو، نہ ملیں۔" ۱۹؎

غالبؔ کے اس خط سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غالبؔ دس بارہ سال سے حکیم صاحب کی حویلی لیکن وہ حویلی اب غلام خاں نے خریدی اور غالبؔ حویلی خالی کرنے ہو کہا۔ غالبؔ اس بات کی فکر میں ہیں کہ غالب کو ایسی ہی حویلی کرِایہ پر کہاں ملے گی جہاں ایک محل سرا اور دیوان خانہ موجود ہو۔

عہدغالبؔ کے سماجی پس منظر کی وقفیت اُن کے خطوط کے مطالعے سے واضح ہوتی ہے اور ہمیں اُس زمانے کی معا شرت ،اجتماعی زندگی اور سماج کے مختلف پہلوں کی تمام معلومات حاصل ہوجاتی ہے جو دوسرے ذرائع سے نہیں ہو سکتی۔ غالب ؔ نے ان خطوط کے ذریعہ اپنے عہد کے تہذیبی اور معاشرتی کوائف کو ہمشہ کے لیے محفوظ کردیا ہیں۔اسی وجہہ سے غالبؔ کے خطو ط اُردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔

غالب کے عہد کا ادبی پس منظر

قدیم زمانے میں لوگ پڑھنا لکھنانہیں جاتے تھے۔وہ اپنے زندگی کے واقعات اور تجربات کو دوہراتے رہتے تھے آپس میں ان واقعات اور تجربات کو سننے سنانے کے عمل سے داستانیں اور کہانیاں وجود میں آئی۔ جب انسان نے لکھنا شروع کیااور سوچے سمجھے انداز میں بات کہنے کی کوشش کی جس کہ نتیجہ میں ادب وجود میں آیا۔ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں زندگی کے تجربات و مشاہدات،انسانی جذبات، احساسات اور خیالات کو موثر اور دلکش انداز میں پیش کرنے کا نام ادب ہیں۔

ادب کی تعریف ایک جملے میں آسانی سے نہیں کی جاسکتی ۔ کوئی کہتاہے کہ '' ادب زندگی کا ترجمہ ہے۔'' کوئی کہتا ہے کہ '' ادب زندگی کی صرف ترجمانی ہی نہیں کرتا بلکہ زندگی کی تنقید بھی پیش کرتا ہے۔ '' ادب میں روزمرہّ کے خیالات سے بہترین خیالات، روز مرہّ کے زبان سے بہترین زبان کا اظہار ہوتا ہے۔ادب انسانی تجربات کانچوڑ پیش کرتا ہے۔ انسان دُنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے جو تجربات حاصل کرتاہے، جو سوچتا اور سمجھتا ہے اُس کے ردعمل کا اظہار ادب کی شکل میں کرتا ہے۔

ادب ہماری زندگی کی تصویرکشی اور ترجمانی کا کام انجام دیتا ہے۔ انسانی زندگی سے ادب کی دلچسپی داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ادب ہی کے ذریعے ہم ہر طرح کے خیالات، جذبات، احساسات اور زندگی کی مختلف پہلوں، جیسے دوستی، دشمنی، غربت، پستی، بلندی، بدی کی ترجمانی کرسکتے ہیں۔ ادب میں ہمارے سماجی،

معاشرتی، مذہبی اور سیاسی ہر قسم کے رْجحانات اظہار ممکن ہے۔ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک نظم اور دوسرے نثر ۔نظم یا شاعری کومختلف قسمیوں میں تقسیم کیا گیا ہے جیسے کہ غزل، قصیدہ، رْباعی، مثنوی،مرثیہ وغیرہ۔اسی طرح نثر کو داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ،انشائیہ مکتوب نگاری وغیرہ میں تقسیم کیا گیا۔

مکتوب نگاری زمانہ قدیم سے انسانی جذبات ، واقعات اور حالات کی ترسیل کا ذریعہ رہی ہے۔فارسی میں مکاتیب اور رقعات میں انشاپردازی کے اعلیٰ نمونہ ملتے ہیں۔ انشاپردازی میں جذبات اور احساسات کا دخل بہت کم تھا۔مرصع و مسجع عبارت آرائی ہوتی تھی۔یہی روایت اُردو خطوط میں بھی موجود تھی۔ لیکن مرزا غالبؔ نے اس قدیم طرز تحریر کو ترک کرکے اُردو خطوط نویسی میں انقلاب لایا۔ غالب نے خطوط میں سادگی، سلاست، ظرافت کو اہمیت دی اور خطوط کو مکالمہ سے مراسلہ بنادیا۔غالب کو اُردو نثری ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے اس کی وجہہ یہ ہے کہ انھوں نے نہایت سلیقے سے سہل اُردو میں رقعات لکھ کر سادہ و سلیس اُردو کا رواج عام کیا۔

غالب کے خطوط نہ صرف ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں بلکہ ان کے عہد اور ماحول کی عکاسی بھی کرتے ہے۔ ہم ان کے خطوط کے مطالعہ سے ان کے عہد کی سیاسی ، معاشرتی ، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے بخوبی واقف ہوجاتے ہے۔

خطوط غالب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جتنی زیادہ معلومات ان خطوط سے حاصل ہوجاتی ہے دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہوتی ۔ غالب نے اپنے عہد کے تہذیبی اداروں اور معاشرتی پہلو کو اپنے خطوط میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے۔ جہاں تک علم وفن کی ترقی اور شعرء سخن سے خصوصی ذوق و شوق کا پتہ ان کے خطوط سے ملتا ہے اسکے علاوہ یہ خطوط اُس عہدکے دہلی کے بہترین زمانوں کی یا د دلاتے ہیں۔

عہد غالب میں دِلی کی ادبی محفلیں ،مشاعرے، امراء کی محفلیں، صوفیا خانقا موجود تھے۔شاہ عالم اور بہادرشاہ ظفر کا دربار ان ارباب فصل و کمال سے آراستہ رہتا تھا۔ مختلف علمی و ادبی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ شعرء سخن کا رنگ جمتا۔ قلعہ معلی اس وقت ادبی دلچسپیوں اور شعرء و سخن کی محفلوں کا خاص مرکز تھا۔ لیکن ریختہ گوئی اور شاعری سے یہ شوق صرف قلعہ تک ہی محدودنہ تھا بلکہ اہل شہر،ارباب ذوق ، عالم وعامی ،امیرو غریب اس میں شامل رہتے تھے۔ شیدائیاں سخن ان محفلوں میں ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ قلعے کے مشاعرے خاص اہمیت رکھتے تھے۔

شاہ عالم کے زمانے سے شاہی دربار نے اپنی گئی گزری حالت میں بھی اہل کمال کی سرپرستی کی ۔شاہ عالم خود شعر کہتا تھا اور آفتاب تخلص کر تا تھا اس کا یہ قطعہ بہت مشہور ہواجس میں لذت پرستی اور غیرذمہ داری کا عکس نظر اتاہے۔

شب دل آرام سے گزرتی ہے

صبح اُٹھ جام سے گزرتی ہے

اب تو آرام سے گزرتی ہے

عافیت کی خبر خدا جانے

شاہ عالم کے دربار میں شاعروں کی عزت قدر اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی ۔ جب بادشاہ شاہ عالم کی مالی معاشی حالت کمزور ہوئی تو شعرو سخن کی محفلیں بھی بکھر گئیں اور شاہ نصیر دکن چلے گئے۔ لکھنو کے نواب اس زمانے میں انگریزوں کے منظورنظر تھے اور وہ اہل ہنروں کو اپنی سرپرستی میں لے رہے تھے۔ مرزا صاحب نے بھی لکھنوکا رُخ کیا۔ اور وہاں جاکر دہلی کی ویرانی بربادی کو بڑے دردناک لہجے میں بیان کیا۔ جس کا پتہ ان اشعار سے چلتا ہے۔

کیا بودوباش پوچھے ہو پورب کے ساکنو

ہم کو غریب جان کر ہنس ہنس پکار کے دہلی

جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگارکے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا

ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑئے دیارکے

اکبر شاہ ثانی کے سب سے بڑے فرزند ابوظفر بھی شعر و سخن کا شوق رکھتے تھے۔ شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے ۔ ان کے زمانے میں دہلی کے اکثرشعراء کا ان کے یہاں قیام تھا۔ابو ظفرولی عہد کے زمانے میں ادبی شعر و سخن کی محفلوں کا خاص مرکز قلعہ معلّیٰ تھا۔اہل شہر امیر غریب، عالم، ارباب ذوق وغیرہ اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے اور شعر و سخن کے شیدائی داد دیا کرتے تھے۔ شعرو سخن کے چرچے بھی ہوتے تھے۔ بانی مجلس کی طرف سے شعراء اور ادباء کی قدردانی اور خاطر تواضع کی جاتی تھی۔ ان میں فراقؔ، احسانؔ، قاسیمؔ، حکم عزتؔ اللہ خان عشقؔ، میاں شکیباؔ، ممنونؔ اور شاہ نصیرؔ وغیرہ قابل ذکر ہے۔ اس زمانے

میں بادشاہ کے یہاں ان شعراء کو ماہواری تنخواہ مقررتھیں۔ خطاب سے بھی سرفراز کیا جاتا تھا ۔ذوق ؔکو اکبر شاہ ثانی نے خاقانی ہند کے خطاب سے نوازا تھا۔

دہلی میں شاہ نصیر ؔکا چرچا تھا۔ شہر میں ان کے بہت سے شاگرد موجود تھے۔ دہلی کے گلی کوچوں اور بازاروں میں ان کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔ابوظفر بھی شاہ نصیرؔ کے کلام کوپسند کرتے تھے۔ ذوقؔ اور بے قرارؔ دونوں شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے۔ ان دونوں کی رسائی بھی قلعہ معلّیٰ میں ہوئی۔ذوقؔ کے کلام میں محاروں کے استعمال کا خاص سلیقہ تھا۔ وہ صاف اور سلیس لکھتے تھے۔ذوقؔ کے قصیدوں کو لوگ بہت پسند کرتے تھے۔شہزادے کے دربار میں ذوقؔ نے آہستہ آہستہ اپنا مقام بنالیا۔ شہزادے نے ان کی تنخواہ چار روپیہ ماہوارہ مقرر کی۔اسطرح ذوق ؔ ترقی کرتے ہوئے اکبر شاہ ثانی کے دربار تک پنہچ گئے۔ذوقؔ نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک زوردار قصیدہ پیش کیا۔بادشاہ نے انہیں ‘‘خاقانی ہند ’’ کے خطاب سے نوازہ۔

بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی ذوقؔ کو اپنااُستاد بنایا اور ان کی تنخواہ سو روپیہ ماہوارہ کردی اور ‘‘ سلطان الشعراء’’ کےخطاب سے نوازہ۔ذوقؔ کے لیے یہ زمانہ انتہائی عروج کا تھا۔ذوقؔ چاہتے تھے کہ بادشاہ ان سے خوش رہے اورعوام ان کے محاوروں پر واہ واہ کریں۔

مرزا غالبؔ جب آگرہ سے دہلی آئے تواس وقت غالب عمر میں ذوقؔ سے نو سال چھوٹے تھے۔ذوقؔ شہزادہ ابوظفر کے دربار میں اپنا مقام حاصل کرچکے تھے۔ذوقؔ کو دربار سے بے دخل کرنا نہ ممکن تھا۔غالبؔ نے اپنے سسرال کے ذریعہ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں اپنی رسائی حاصل کرلی تھی۔ شہزادے ابو ظفر نے غالب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔غالب دربار مقام بنانے کے لیے ہمشہ کوشہ رہے۔غالبؔ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں قصیدے پڑھتے رہے۔

سنہ۱۸۴۷ء میں غالب ؔ نے میاں کالے صاحب جوبہادر شاہ ظفر کے پیر تھے ان کی شفارش سے شاہی دربار میں داخلہ حاصل کرلیا اور دربار کے مشاعروں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ سنہ۱۸۵۰ء میں حکیم احسن اللہ خان کی کوشش سے غالب کو بادشاہ نے ‘‘نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ ’’ کے خطاب سے نوازا گیا۔ غالب ؔ کوتیموری خان کی تاریخ لکھنے کے لیے پچاس روپے ماہوار پر مقرر کیا ۔ انہوں نے اس تاریخ کا نام ‘‘پرتوستاں’’ رکھا جس کا ایک حصہؔ ‘‘مہر نیمروز’’ میں شائع ہوا۔دوسرے حصہؔ جس کا نام ‘‘ ماہِ نیم ماہ ’’ رکھا تھا۔غدرکی وجہ سے لکھا ہی نہیں گیا۔ شہزاد فتح الملک نے غالب کی شاگردی قبول کی۔ شاہی دربار سے تعلق قائم ہونے کے بعد غالب نے فارسی کو چھوڑکر اُردو میں غزل گوئی شروع کی اور وہاں ان کی شہرت عام ہوگئی۔

شاہی دربار میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد بھی غالبؔ کی اور ذوقؔ کی مخالفت جاری رہی۔ غالب اپنے آپ کو ذوقؔ کے مقابلے میں بہت اونچا سمجھتے تھے۔ان کے تخیل کی بلندی تک ذوق کی پنہچ نا ممکن تھی۔ غالب کواپنی خاندانی وجاہت پر بھی ناز تھا۔غالب نے اپنے کلام کی متعلق پشین گوئی کی تھی کہ جتنا زمانہ گز رے گاان کی قدر بڑھتی جائے گی جس طرح شراب جتنی پْرانی ہو اتنی ہی کیف آور ہوتی ہے۔ آج اگر میں تنہا ہوں تو افسوس کی بات نہیں ایک زمانہ آئے گا جب میرے قدردان اتنے ہوں گے کہ ان کا شمار مشکل ہوگا۔

غالبؔ کے خطوط میں تین طرح کے خطابات کا ذکر بھی ملتا ہے ۔بادشاہ وقت سے ملنے والے خطابات کا ذکر غالب مخصوص انداز میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ پہلا خطاب '' خانی'' تھا اس کی اہمیت اور درجہ کم سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا خطاب '' بہادری '' کا تھا۔ یہ ''خانی'' سے ا علیٰ درجہ کا تھا۔ تیسرا خطاب جو دونوں خطابات سے افضل تھا وہ ''دولگی '' کا خطاب تھا۔ غالب نے ان تینوں خطابات کا ذکر تفتہ کو لکھے خط میں کیاہیں۔

اقتباس۔

سنو، خطاب کے مراتب میں پہلے تو "خانی" کا خطاب ہے اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے" مثلاً ایک شخص کا نام "میر محمدعلی" یا"شیخ محمد علی" یا "محمدعلی بیگ" اور اس کو خاندانی بھی "خانی" نہیں حاصل۔پس جب اْس کو بادشاہ وقت "محمد علی خاں" کہہ دے تو گویا اْس کو "خانی" کا خطاب ملا اور جو شخص کہ ْاس نام اصلی "محمدعلی خاں" ہے یا وہ قوم افغان سے ہے یا "خانی" اْس کی خاندانی ہے۔ بادشاہ نے اس کو "محمد علی خاں بہادر" کا خطاب کہتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر خطاب "دولگی" کا ہے یعنی مثلاً "محمدعلی خاں بہادر" اْس کو "منیرالدولہ محمد علی خاں بہادر" کہا۔ اب یہ خطاب "دو لگی" کا ہو۔" ۲۰ ؎

یہ خطابات عہد مغلیاں میں بادشاہوں کی طرف سے امراء کو دیے جاتے تھے۔اس کے علاوہ شعراء اور ادبا کو بھی انعام و اکرام سے نوازہ جاتا تھا۔اگرصاحب اپنے لڑکے کی تاریخ ولادت کسی شاعر سے لکھواتے تواس کے بدلے میں اسے انعام دیتے تھے۔ اکثر شاگرد اپنے اْستاد شاعر کو بطور نذرانہ پیش کرتے۔

عہد غالب میں کتابوں کی چھپائی کے وقت بڑا اہتمام کیا جاتا تھا ۔ کتابوں کے آخر میں قطعہ تاریخ بھی ہوتا تھا۔ غالب نے '' دستنبو '' کے لیے مرزا حاتمؔ اور تفتہؔ کے پاس ایک قطعہ لکھوایا۔غالب کے خطوط سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عہد میں کاغذکے مختلف قسمیں ہوا کرتی تھیں ۔فرنچ کاغذ سب سے اعلیٰ قسم کا ہوتا تھا۔ اس کی اہمیت کا

ذکر غالب نے '' دستنبو '' کی چھپائی کے وقت تفتہؔ سے کیا کہ فرنچ کاغذ پر ''دستنبو ''کی کاپیوں کو چھاپا جائے۔ جو حکام اور عہد یداران کے لیے ہوگی۔ باقی یشورام پوری کاغذ نیلے کاغذ پر چھاپنے کو کہا تھا۔ کتابوں کی فروخت کے لیے عہد غالب میں اشتہار اخباروں میں چھاپاجاتا تھا۔ غالب نے اپنی کتاب '' دستنبو '' کے فروخت کے لئے شیونرائن کے اخبار آفتاب عالمتاب میں اس کا اشتہار چھاپا۔

شاعروں کااُمرا اور بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھنا شاہی تہذیب کا حصّہ ہوا کرتا تھا۔مدح کرنے والا صلے کی غرض سے لکھتاتھا۔ ممدوح بھی قصائد کو سچی تعریف نہیں بلکہ صلے کی غر ضی سمجھتے تھے۔ غالب نے بھی یہی کیا تھا۔ اہل سروت بادشاہ کی جو بھی تعریفیں کیں، قصائد لکھے وہ سب اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے لکھے۔ قصائد کی زبان میں مبالغہ آرائیوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے

غالبؔ کے ادبی خطوط اُس عہد کے ادبی پس منظر کو عیاں کرتے ہیں۔ غالبؔکے ادبی خطوط ''اُردو معلی '' اور '' عود ہندی '' میں موجودہیں۔غالب کے ادبی خطوط کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے ان خطوط میں غالب نے اپنے اور دوسروں کے اشعار کے معانی اور مطلب سمجھائے اور ان پر تنقید بھی کی۔ فارسی اور اُردو شاعری یا مصنفین پر اور ان کے کلام اور تصانیف پر رائے پیش کیں۔

غالبؔ نے اپنے خطوط میں اپنے اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔غالبؔ نے چھبیس ۲۶ اشعار کی تشریح پیش کی ہیں جن میں سے ۱۳ اُردو کے اور ۱۳ فارسی کے اشعار کی تشریح موجود ہے۔غالبؔ نے اردو اشعار میں سات شعر کی تشریح مولوی عبدالرزاق شاکرؔ کے نام تحریر کردہ خطوط میں پیش کی ہے۔ پانچ اشعار کی تشریح قاضی عبدالجمیل جنوں بریلوی کے نام خطوط میں پیش کی اور ایک شعر کی تشریح میر مہدی مجروحؔ کے نام تحریر کردہ خط میں ملتی ہے۔

غالب نے ا پنا شعر جو ''یوان غالب'' کا پہلا شعر ہے جس کی تشریح غالب نے عبدالرزاق شاکر کے نام لکھے خط میں کیشعر

نقش فریادی ہے کس کی شوقی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے غالب نے یہ خط عبدالرزاق شاکرؔ کو لکھاخط کا اقتباس ملا خطہ فرمائے۔

ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔ جیسے" مشعل دِن کو جلا نا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔پس شاعر خیال

کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اُس کا پیرہن کاغذی ہے؟ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصایر اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال و آزارہے۔"   ۲۱ ؎

غالبؔ نے اپنے اُردو کے پانچ اشعار کی تشریح عبدالجمیل جنونؔ بریلوی کے نام تحریر کردہ خطوط میں کی ہیں۔ جن میں سے ایک خط میں شعر کی تشریح اس طرح سے ہے۔

ملنا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے

دشوار تو یہی کہ دشوار بھی نہیں

مذکورہ بالا شعر کی تشریح کرتے ہوئے غالبؔ تحریر کرتے ہیں۔

ملنا ترا اگر نہیں" الخ۔ یعنی اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان" نہیں،نہ سہی۔ نہ ہم مل سکیں گے۔ نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں، یعنی جس سے تو چاہتا ہے،مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا مگر رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کرسکتے۔" ۲۲؎

غالبؔ نے مہدی مجروحؔ کے نام ایک خط میں شعر کی تشریح اس طرح کی ہیں۔

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے؟ قداس کا کتنا لمبا ہے؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟ جب" یہ نہ بتا سکو گے تو جانو کہ قسم جسم و جسمانیات میں سے نہیں ہے۔ ایک اعتبار محض ہے۔ وجود اس کا صرف یعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اُس کا وجود ہے۔ یعنی کہنے کو ہے،دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہوگئے توگویا اس صورت میں ہمارا ہونا،ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے۔" ۲۳؎

غالبؔ نے اپنے خطوط میں اپنے شاگردوں اور دوستوں کے کلام کی اصلاح بھی کی ہے۔ اس سے ہمیں اصلاح کی بنیادی اُصول معلوم ہوتے ہیں۔

گھات میں مدّعا برآری کی

ہم نے غیروں کی غم گساری کی

اس شعر کی اصلاح غالبؔ نے جنوں بریلویؔ کے نام تحریر کردہ خط میں کی ہے۔

خط کااقتباس۔

” تقدیم وتاخیر مصرعین کر کے رہنے دو۔ اس میں کو ئی سُقم نہیں۔ ”مدّعا برآری“ کاتھیوں کا لفظ ہے۔میں اس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہوں مگر چوں کہ من حیث المعنی یہ لفظ صحیح ہے، مضائقہ نہیں۔“ ۲۴ـہ

عہد غالب کی تہذیبی پش منظر کی بات کی جائے تو اُس وقت کا دور انیسویں (۹۱) صدی کا دور تھا۔ اور یہ دور بے شک مذہب، تعلیم، معاشرت، زندگی کے بدلتے ہوئے سرگرم اصلاحات کی صدی تھی۔ اس پس منظر میں عہد وسطی کی عظیم الشان مغلیہ تہذیب کا سایہ تھا۔ اور یہ انیسوی صدی کے ہندوستان میں صرف مغلوں کے زوال اور مغربی اقیدار کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا۔مغربی تمدن کی نمود ہمارے یہاں اُس تہذیب کے پس منظر میں ہوئی۔ جو مغلو ں کی سیاسی شکست کے باعث اب اپنے آپ کو قائم رکھنے سے قاصر تھی۔

غالب کے عہد کی بنیادی الجھن اور اُن کی کشمکش کے اسباب ان کے خطوط کے ذریعہ عیاں ہوتے ہیں۔ ان کا زمانہ انسان کے احساس سے بھرا ہوا ایک مشکل ترین زمانہ تھا۔ اس وقت انسان کو زندگی کے دو مختلف حالات سے گزرنا پڑا ایک تو وہ اپنی خوشی کو ترک کرنے پر آمادہ تھے اور نہ دوسرے کو قبول کرنے پر جونہ تو اپنے روحانی وجود سے دست بردار ہوسکتے تھے اور نہ گردو پیش کے حقیقوں سے بے تعلق رہ سکتے تھے۔ کیا کریں والی کیفیت اس وقت لوگوں پر طاری تھی۔ اور اسی وجہہ ہے کہ غالب کے عہد کو اُمید اور مایوسی اورتجسوس کے ایک دور پر لا کھڑا کیا تھا۔ اسی وقت جب تہذیبی بساط کے اجڑنے اور بکھرنے کا ہنگامہ تھا۔ مغلوں کے سیاسی اقیدار کی بربادی کا دور تھا۔ اسی فضاء میں غالب نے دلی کی بربادی کا سوگ منایا۔اس مغلیاں دور کی تہذیب کا وقار قائم نہ رہا حالانکہ اُس وقت ان کے زوال کا عمل شروع ہوچکاتھا۔ لیکن پھر بھی وہ اُس معاشرے میں پیدا ہوئے عالموں فن کاروں اور ہنرمندوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھے۔ یعنی وہ معاشرہ اپنی علمی روایت اور تہذیبی روایت کی قدر وقیمت سے آگاہ تھا۔

خط کی اہمیت اور افادیت کے کئی روشن پہلو ہیں ان میں ایسے ایسے نکات ہمارے سامنے آتے ہین جو تاریخ کی اہم کتابوں میں بھی نہیں ملتے۔ خط نجی حالات کے

ساتھ ساتھ معاشرتی روّیوں اور تہذیبی آثار و کوائف کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں ۔ان میں اُس زمانے اور ماحول کی تصویریں جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس اعتبار سے خط تاریخی معلومات کا خزانہ ہوتے ہیں۔ ہم خطوط کے ذریعے کسی بھی عہد کی تاریخ مرتب کرسکتے ان میں تاریخی واقعات کی عکاسی ہوتی ہے کون ساواقعہ کب اور کہاں واقع ہوا خطوط میں اس بات کی طرف واضح طورپر اشارہ یا نشان دہی ہوتی ہے۔ تاریخ کی ضخیم کتا بیں کسی زمانے کی عکاسی نہیں کرسکتی جو خطوط کا مختصر مجموعہ کرسکتا ہے۔ خط میں جب کسی واقعے کا ذکر ہوتاہے یا اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو تو اس کی تاریخی حیثیت واہمیت مسلم ہوجاتی ہے۔

غالب ایک عظیم ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ خطوط ان کی ادبی شخصیت کا آئینہ ہیں اور ان میں شخصیت کے ہر پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ یہی وجہہ ہے کہ غالب کی شاعری کی طرح، ان کے خطوط ان کی ادبی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے اور غالب کو ایک عظیم ادبی شخصیت بنانے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

۱۔ غالبؔ کی مکتوب نگاری ۔پروفیسر نذیر احمد ص ۱۷

۲۔ اُردو ئے معلی ۔مرز اسد ا للہ ا غالب ص ۲۷

۳۔ اُردو ئے معلی ۔مرز اسد ا للہ ا غالب ص۴۱۴

۴۔ اُردو ئے معلی ۔مرز اسد ا للہ ا غالب ص۷۴۱

۵۔ غالبؔ کے خطوط (جلددوم) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۴۰۵

۶۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۲۶۳

۷۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص۹۸۲

۸۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۶۷۳

۹۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۹۷۳

۰۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۰۰۳

۱۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۱۴

۲۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۸۳

۳۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۴۱۳

۴۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۱۳

۵۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۹۹۳

۶۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۹۹۳

۸۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۰۰۴

۹۱۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۷۶۳

۰۲۔ غالبؔ کے خطوط (جلد اول) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۳۲

۱۲۔ غالبؔ کے خطوط (جلددوم) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۳۸

۲۲۔ غالبؔ کے خطوط (جلدچہارم) ۔ڈاکٹرخلیق انجم ص ۴۱۵۱

باب چہارم
خطوط غالب کالسانی مطالعہ

انسانی سماج میں زبان کو بُنیادی حیثیت حاصل ہے ۔زبان ابلاغ و ترسیل کابنیادی وسیلہ ہے۔ زبان کا تصوّر اعضاء نطق سے ادا کر جانے والی آوازوں سے ہے۔ اعضائے نطق سے اداکی جانے والی آوازیں بے معنی بھی ہوسکتی ہیں اور ہوتی بھی ہیں لیکن جب یہی آوازیں ایک ترتیب کے ساتھ ادا ہوکر با معنی لفظ بن جاتی ہیں تو یہ خیالات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہیں۔ زبان کے سائنسی مطالعے اور تجزیے کا نام ہی لسانیات ہے۔

تعلیمی نظام میں لسانیات کی سب بڑی دین یہ ہے کہ اس نے زبان کی ماہیت کے شعور کو عام کیا یعنی یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زبان کیا ہے؟ زبان کو استطور کی دنیا سے نکال کر معروفیت کی روشنی میں پیش کیا۔

لسانیات کی تاریخ ، آغاز و ارتقاء

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ۲۷ ستمبر علم لسانیات کی سالگرہ کا دن ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ انسان نے زبان کا آغاز تمدّن سے بہت پہلے بولنا شروع کردی تھی۔

انیسویں صدی سے پہلے لسانیات صرف فلسفیوں کی دلچسپی کا میدان ہو اکرتی تھی کہا جاتا ہے کہ زبان کو ایک فلسفیانہ موضوع کے طورپر سب سے پہلے افلاطون اور پھر ارسطو نے اختیار کیا۔ کہاجاتا ہے کہ افلاطون وہ پہلا شخض ہے جس نے اسم و افعال یعنی ناؤنز اور وربز کو الگ الگ کیا لیکن خود مغربی مفکرین کی تحقیق کے مطابق یہ بات درست نہیں ہے۔ درست بات یہ ہیکہ لسانیات یونانیوں سے شروع نہیں بلکہ ہندوستان سے شروع ہوتی ہے۔

تاریخ انسانی کا سب پہلا ‘‘ ماہر لسانیات ’’ جیسے بجا طورپر ‘‘ بابائے لسانیات ’’ کہا جاتا ہے وہ ‘‘ پانینی ’’ ہے۔ ‘‘پانینی ’’ چوتھی صدی قبل مسیح میں ‘‘ پش کالاؤتی ’’ میں پیدا ہوا ۔ پانینی نے سنکرت گرامر کے لیے تین ہزار نوسو اُنسٹھ قوانین وضع کیے۔ پانینی کی کتاب کو ‘‘ استادھیائی ’’ کہا جاتا ہے جس کہ معنی ہے آٹھ ابواب۔ پانینی نے ہی سب سے پہلے علم الاشکال، علم الاصوات ، علم العلامات،اور گرائمر کی سائنس کا مطالعہ شروع کیا۔

البتہ ایک باقاعدہ طورپردیکھا جائے تو واقعی لسانیات کا آغاز ۲۷ء ستمبر ۱۷۸۶ء سے ہوا۔ ۲۷ء ستمبر ۱۷۸۶ء کے روز ‘‘ سرولیم جونس (Sir William Jones) نے رائل ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ کو ایک ریسرچ پیپر کے ذریعے بتایا کہ سنسکرت یونانی، کیلٹک اور جرمینک زبانوں میں حیران کن مماثتیں اور مشاہتیں پائی جاتی ہیں اس بات نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو چونکا دیا سوال یہ تھا کہ کیا یہ تمام زبانیں بنیادی طورپر کسی ایک ہی زبان سے شروع ہوئی ہیں۔

اس کے بعد ‘‘ پروٹوانڈو یوروپین ’’ کے نام سے زبانوں کے ایک مشترکہ خاندان کا اعلان کیا گیا انڈویوروپین خاندان میں موجودہ یورپ کی زیادہ تر جدید زبانیں شامل ہیں جبکہ وسطی مغربی اور جنوبی ایشاء کے بعض حصّوں کی آبادیاں بھی انڈو یوروپین زبانیں بولتی ہیں۔

قدیم اناطولیہ یعنی موجودہ ترکی میں ایک زمانے میں انڈویورپین زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اسی طرح دور قدیم میں شمالی مغربی چائینہ میں بھی انڈویوروپین زبانیں بولی جاتی رہیں۔وسطی ایشیاء کا زیادہ ترحصّہ منگولوں کے حملوں تک انڈویورپین زبانیں بولتا تھا۔ فی زمانہ چارسو پینتالیس انڈویوروپین زبایں دُنیا میں بولی جاتی ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں زبانوں کی تبدیلی کے مطالعہ کہ بجائے زبانوں کی ساخت کا مطالعہ ذیادہ اہمیت اختیار کرنے لگا۔ چنانچہ بین السانی تغیر کے مطالعہ کہ بجائے فرداً فرداً ہر زبان کا الگ الگ مطالعہ شروع ہوگیا۔دراصل محقیقین کی توجہات کا رُخ اس نئے موضوع کی طرف موڑنے کا سہرا ایک ماہر لسانیات '' فرڈیننڈڈی ساسیور '' ۔ فرڈیننڈڈی ساسیور کو فادر آف کے سر جاتا ہے (Ferdinanad de Saussure) مارڈن لنگوِسٹکس ، '' بابائے جدید لسانیات '' بھی کہا جاتا ہے۔

' فرڈیننڈڈی ساسیور نے کہا ہے کہ۔

'' زبان شطرنج کے کھیل کی طرح ہوتی ہے جس میں ہر عنصر دراصل دوسرے عناصر کے اشتراک اور ان کے مقام کے ٹھیک یقین کی وجہہ سے قائم رہ سکتا ہے۔

۱۹۵۷ ء میں لسانیات نے ایک نئی کروٹ لی، نوم چومسکی

(Noam Chomsky) نے ایک کتاب لکھی جسکا نام ''مخوی ساختیں

(Syntactic Structure) ان کی یہ کتاب نے لسانیات کو ایک بارپھر نئے راستوں پر ڈال دیا۔

گرامر کیا ہے؟ گرامر یہ طے کرتی ہے کسی زبان میں مختلف الفاظ ، جملوں اور اصولوں کی ترتیب کیا ہونی چاہیے کسی زبان کی مخوی ترکیب ممکن ہے تو کہاں تک؟ چومسکی نے گرامر کی ایسی ترتیبیں جو ناممکن تھی۔ '' جیز یٹوگرامر '' کے نام سے الگ کردیں یوں چومسکی نے لسانیات میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا جیسے جنرلیوزم کہا جاتا ہے۔

لسانیات معنی و مفہوم

'' لسانیات '' عربی لفظ '' لسان '' سے ماخوز ہے اس کی معنی زبان کا علم ہے۔ لسانیاب علم کی وہ قسم ہے جو زبان کی بنیاد، اصلیت اور اسکی ماہیت کا مطالعہ کرتی ہے۔ لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے زبان کی ماہیت ، تشکیل ، ارتقا زندگی اور موت کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

زبان کے بارے میں منظم علم کو لسانیات کہا جاتا ہے یہ ایسی سائنس ہے جو زبان کو اس کی داخلی ساخت کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ان میں اصوات ، خیالات ، سماجی صورت احوال اور معنی وغیرہ شامل ہیں۔

ماہر لسانیات نے لسانیات کی تعریف کی ہے جو درجہ ذیل ہیں۔

ماہر لسانیات محی الدین قادری کے مطابق۔

'' لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقاء زندگی اور موت کے متعلق آگائی ہوتی ہے۔ ''۱ے

پروفیسر گیان چند جین کے مطابق لسانیات۔

'' لسانیات روایتی قواعد کے اصطلاحوں کو نہیں اپنا سکتی کیونکہ لسانیات کی اصطلاحیں بالکل وہی مفہوم پیش نہیں کرتیں، تکنیکی مطالعے میں اصطلاحیں ناگزیز ہیں۔''۲ے

ابوالا عجاز حفیظ صدیقی کے مطابق لسانیات۔

'' لسانیات (Linguistics) کا اُردو ترجمہ ہے فلالوجی (Philology) کی اصطلاح بھی لسانیات کے مترادف کے طوپرہ استعمال ہوتی رہی ہے لیکن فلالوجی نسبتاً ایک وسیع ترا اصطلاح ہے جس کے مفہوم میں زبان کے سائنسی مطالعہ کے علاوہ ادبیات کا سائنسی مطالعہ بھی شامل ہے۔ ''۳ے

درجہ ذیل تعریفوں سے بات واضح ہوتی ہے کہ لسانیات ایک ایسا مضمون ہے جس میں انسانی زبانوں کا ، زبانوں کی موجودہ صورت کا اور زبانوں میں وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والے تبدیلیوں کا مطالعہ کیاجاتا ہے اس علم میں مختلف زبانوں کی آپس میں مشابہت کے بارے میں مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس چیز کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے کہ زبانوں کا اس دنیا کی دیگر چیزوں کے ساتھ کیا تعلق ہے گویا لسانیات دراصل وہ علم ہے جس میں صرف انسانی زبان پر بحث کی جاتی ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسری نظام کا مطالعہ نہیں کیا جاتا۔

لسانیات کے اقسام

لسانیات کے مندرجہ ذیل اقسام ہیں۔

۱) تاریخی لسانیات ۲) توضیحی لسانیات ۳) عمومی لسانیات ۴)تقابل لسانیات ۵)تشریح لسانیات

۶) اطلاقی لسانیات ۷) نسلی لسانیات ۸) سماجی لسانیات ۹) اعدادی لسانیات

مندرجہ بالا اقسام میں سے سب سے اہم اقسام لسانیات میں زبان کے مطالعے کے دو طریقے کار ہیں ۱) تاریخی لسانیات ۲) توضیحی لسانیات

:تاریخی لسانیات

(Historical linguistics)

تاریخی لسانیات میں زبانوں کی تاریخ کا تفصیل مطالعہ پیش کیا جاتا ہے ان کی عہد بہ عہدتبدیلیوں کا کھوج لگایا جاتا ہے یہاں ان اصولوں اور قواعد کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کے سبب زبانوں میں مختلف قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں یہ تبدیلیاں تلفظ کے اعتبار سے بھی ہوسکتی ہے معنی کے اعتبار سے بھی ہوسکتی ہیں۔

:توضیحی لسانیات

(Discreptive linguistics)

توضیحی لسانیات میں زبان کی توضیح اس کی درج ذیل سطحوں پر کی جاتی ہے۔

صویتات

(Phonetics)

اس لسانیات کو کلید بھی کہا جاتا ہے۔ زبان آوازوں کے علامتی اورتصّوراتی نظام کا نام ہے انسانی ذہن مختلف قسم کی آوازوں کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا ہے ایک آواز دوسری آوازوں سے مل کر زبانوں کو جنم دیتی ہیں۔صویتات لسانیات کا وہ علمی شعبہ ہے جس میں انسانی اعضائے تکلم سے پیدا ہونے والی ان آوازوں کا مطالعہ کیا جاتاہے جو مختلف زبانوں میں استعمال ہوتی ہے اس مطالعوں میں آوازوں کی تشکیل ، ترسیل، نیز آوازوں کی ان مخارج اور دیگراعتبار سے درجہ بندی کی جاتی ہے۔۱) سماجی صویتات ۲) تلفیظی صوتیات۔

فونیمیات یا تجز صوتیات

(Phonemes)

لسانیات کی یہ شاخ کسی زبان میں کام آنے والی اہم اور تفاعی آوازوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ ایک زبان میں استعمال ہونے والی آوازوں کی تعدادزیادہ بھی

ہوسکتی ہے لیکن فونیمیات کی تعداد محدود اور مقررّ ہوتی ہیں۔ اُردو میں فونیمیات کی صحیح تعداد کے بارے میں بھی علمائے لسانیات کے مابین میں زراسا اختلاف رائے پایا جاتا ہے ، کوئی ان کی تعداد ۵۷ کوئی ۴۸ اور کوئی ۴۴ قرارد دیتا ہے۔

صرفیات

(Morphology)

صرفیات کو اُردو میں مارفیمیات بھی کہتے ہیں۔ یہاں الفاظ کی ساخت اس کے اصول و قواعد اور اس کے استعمال سے بحث ہوتی ہے زبان کی چھوٹی سے چھوٹی بامعنی اکائیوں جیسے الفاظ کی تذکیر و تانیث ان کی تعداد حالات و کیفیات زمانہ اور وغیرہ کا مطالعہ کیاجاتا ہے۔

نحویات

(Syntax)

کسی زبان میں الفاظ کی محفوص اور با معنی ترتیب کو کہتے یں زبان میں جملوں کی ساخت اورجملوں میں لفظوں کی ترتیب کے قاعدوں کا مطالعہ نحویات کے ذیل میں آتا ہے مثلاً ‘‘احمد نے کھانا کھایا’’ یہ اُردو نحو کے اعتبار سے الفاظ کی صیح ترتیب ہے اگر اس کے بدلے یوں کہا جائے کہ ‘‘ کھانا کھاتا احمد نے ’’ تو اس کے معنی کی ترسیل پیچیدگی کا باعث بنے گی صرف و نحو کو ملا کر زبان کی قواعد کہا جاتاہے۔

معنیات

(Semenatics)

لفظوں اور جملوں کے مطالب اور معانی کا مطالعہ معنیات کہلاتا ہے ان مطالب کا زبانوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ لفظ اور معنی کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ منطقی ہے یا علامتی ان سب حقائق کا کھوج علم معنیات سے لگایا جاتا ہے۔

لسانیات میں چنانچہ تقریر کو تحریر پر تقدم یعنی صوت (آواز) کی حرف پر اولیت حاصل ہے اس لیے پہلے اُردو زبان کی صوتیات کے بارے میں جانکاری حاصل کر نا نا گریز بن جاتا ہے۔

لسانیات الفاظ و معنی میں عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں کا علم ہے یہ بات با آسانی کہی جاسکتی ہے کہ لسانیات کا علم سائنٹیفک طریقے سے زبان کا

مطالعہ کرتاہے ۔ اس علم کا موضوع زبان ہے علا العمو م ایک زبان اور بالخصوص کئی زبانیں۔

"زبان کے باقاعدہ مطالعے کو لسانیات یا علم زبان کہتے ہیں علم زبان کا ایک طویل نام ہے اس پر لسانیات کو ترجیح دی جاتی ہے۔'' ۴ے

غالبؔ کے خطوط میں ایک طرف جہاں ان کے عہد کی تاریخی ، سماجی ، سیاسی اور معاشی حالات ، ان کی شخصیت اور ان کے عہد کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں وہی دوسری طرف ان کے خطوط میں لسانی و ادبی مباحث بھی بکثرت ملتے ہیں۔جہاں تک لسانی مباحث کا تعلق ہے تو اس ضمن میں غالبؔنے بیشتر فارسی الفاظ و محاورات پر گفتگو کی ہے۔اس کے علاوہ بعض اُردو الفاظ ان کے خطوط میں زیر بحث آئے ہیں۔

لسانی مطالعہ

غالبؔ نے اپنے خطوط میں بعض لسانی اور لغوی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے جن میں مفرادت، مرکبات، تذکیر و تانیث اور متفرقات شامل ہیں۔اس کے علاوہ بعض امور ایسے ہیں جن کا تعلق ادبی ولغوی مسائل سے ہے ۔یہاں غالبؔ کے خطو ط میں زیر بحث آئے ہوئے لسانی اور لغوی مسائل کو بیان کرے گے۔

مفردات:

''بلاریاے'

مرزا تفتہؔ کے نام تحریر کیا ہوا ایک خط میں لفظ '' بلاریاے '' تحریر کیا جس پر تفتہؔ نے ان سے پوچھا۔ '' بلاربائے '' اس میں کیا شامل ہے لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے ' رُبا ' اس کا مخفف ہے۔ ۵ے

جس پر تفتہؔ ان سے پوچھا ''بلا رباے '' میں 'ے ' کا اضافہ درست ہے یا نہیں اس کا اجواب دیتے ہوئے غالبؔ تحریر کرتے ہیں کہ صحیح اور پورا لفظ یہی ہے اور ' رُبا ' تو مخفف ہے۔ اس کے علاوہ چند الفاظ اور اُن کے معنی اور استعمال کرنے کی وجہہ غالبؔ نے خود اپنے خطوط میں کی ہے۔

بے پیر

لفظ ''بے پیر '' تو رانی بچہ بائے ہندی نژ اد کا تراشا ہوا ہے۔ جب میں اشعارِ اُردو میں شاگردوں کو نہیں باندھے دیتا تو تم کو شعرِ فارسی میں کیوں کراجازت دوں گا۔''

مرزا جلال اسیرؔ علیہ الرحمتہ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے میری کیا مجال ہے کہ اُن کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھتے۔ '' بے پیر '' ایک لفظ ٹکسال باہر ہے۔''ے۶

یہ خط تفتہؔ کو لکھا تھااور غالبؔ نے لفظ '' بے پیر'' پر گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ اہل ایران کا بنایا ہو ا لفظ نہیں ہے بلکہ اسے تورانیوں نے بنایا ہے اور میرے نزدیک اس کا استعمال فارسی میں نہیں بلکہ اُردو میں بھی مناسب نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا استعمال اُردو میں تو جا ئزہے لیکن فارسی میں ان کا کوئی میل نہیں۔

خم وچم

یہ لفظ غالبؔ نے تفتہؔ کے نام لکھے ایک خط میں استعمال کیا۔ تفتہؔ نے اس لفظ ''خم و چم '' کے بارے میں پوچھاتو اس کا جواب دیتے ہوئے غالبؔ نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ یہ لفظ میں نے آج تک فارسی نظم و نثر میں نہیں دیکھا۔ ہاں ''چمیدن اور خمیدن '' صحیح میں معلوم ہو ا کہ الفاظ کا استعمال اہل زبان کے مطابق ہونا چایئے۔

مہر جواں

تفتہؔ کے نام خط میں یہ لفظ استعمال کیا ۔ اس خط میں انھوں نے مہر جواں کے معنی بتائے ہیں کہ اس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک '' خطاب '' جو سلاطین کر طرف سے امراء کو ملتے تھے۔ اور دوسرے معنی '' عرف'' کے ہیں یعنی وہ نام جولڑکوں کا پیار سے رکھاجائے۔

بھائی مہرجواں کے دو معنی ہیں ایک '' خطاب '' کہ جو سلاطین امراء کو دیں اور دوسرے سے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھتے یعنی ''عرف'' حاشیے پر شوق سے لکھوا دو۔ ے۷

اس طرح غالبؔ کے تفتہؔ کو لکھے ہوئے خطوط میں خود تفتہؔ نے غالبؔ سے ان الفاظوں کے معنی دریافت کے اور غالبؔ اس کو جواب دیتے ہیں۔

جواد

جوذ '' لغت عربی سے بہ معنی بخشش '' جواد '' صیفہ ہے صفتِ مشبہؔ کا بے تشدید۔'' ے۸

تفتہؔ کے نام اس خط میں غالبؔ نے لفظ ''جواد'' سے متعلق بحث کی ہے ۔خط سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تفتہؔ کو اس بات کا شک ہوا کے یہ لفظ جواد '' داد '' کی

تشدید کے ساتھ ہے اس کے جواب میں غالبؔ نے تحریر کیا یہ لفظ بے تشدید ہے یعنی ''جواد'' اور مادہ اس کا جود ہے جو دعربی لغت ہے اور جس کے معنی بخشش کے ہیں۔

درّاعہ ، جادّہ

'' درّاعہ '' کو یہ نہ کہوکہ تشد ید نہیں ہے۔ اصل لغت مشدّد ہے ۔شعر اُس کو مخفف بھی باندھتے ہیں۔ سعدؔ ی کے مصرع سے اتنا مقصود حاصل ہوا کہ '' دْرّاعہ '' بے یشدید بھی جائز ہے۔ یا درر ہے '' جادّہ '' اور '' دْرّاعہ '' دونوں عربی لغت ہیں۔ وہ دال کی تشدید سے اور یہ '' رے '' کی تشدید سے۔ مگر چیز '' جادّہ '' اور ''دْراعہ '' بھی لکھتے ہیں۔ یہ نہ کہوکہ '' دْراعہ '' ہر گز نہیں ہے۔ یہ کہوکہ '' دْراعہ '' بے تشدید بھی جائز ہے۔'' ؎۹

تفتہؔ کا خیال ہے کہ لفظ دْرّاعہ ' ' ر ' ' کی تخفیف کے ساتھ ہی درست ہے اس میں '' ر '' کی تشدید بالکل نا جائز ہے۔ اس کو جواب غالبؔ نے لکھا کہ ''جادّہ'' اور '' دْرّاعہ'' دونوں عربی لفظ ہے اور دونوں میں باترتیب '' د '' اور '' ر '' اوپر تشددیں فارسی میں یہ ان دونوں لفظوں کو بہ تخفیف بھی استعمال کرتے ہیں۔

یک زمان

غالبؔ نے یہ خط تفتہؔ کے نام تحریر کیا ہے۔ جس میں ''یک زمان '' لفظ کو عربی ''ازمنہ '' جمع اور دونوں طرح فارسی میں مستعمل یعنی ''زمانے '' کے معنی ''یک زمان'' ، ''ہر زمان زمان'' ، ''دریں زما ن '' ، ''وراّں زمان''، سب صحیح اور فصیح ہیں۔اس کے ساتھ غالبؔ نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ اہل ایران بعض عربی الفاظ کے آخر میں ہائے زائدہ کا اضافہ کرکے لکھتے تھے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ مثلاً ' موج ' سے ' موجہ '

نیم

''نیم گناہ '' ، '' ونیم نگاہ '' ، ''ونیم ناز '' یہ روزمرۂ اہل زبان ہے۔ ''نیم '' نہ معنی اندک ورنہ گناہ کاآدھا اور نگاہ کی ادھواڑ اور ناز آدھا ؛ یہ مہملات میں ہے، ان چیزوں کا منا صفہ کیا؟ اگر تم ''نیم گناہ '' پسند نہیں '' تازہ گناہ '' رہنے دو۔'' ؎۱۰

یہ خط غالبؔ بھی تفتہؔ کے نام تحریر کیا۔ غالبؔ کے اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تفتہؔ نے اپنی تحریر میں '' نیم گناہ '' لفظ استعمال کیا تھا پھر انہیں لفظ نیم پر شبہہ ہوا کہ نیم تو آدھے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تو غالبؔ نے اس کا جواب

دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے میں نقطہ نیم اپنے لغوی معنی آدھا میں استعمال ہیں ہو بلکہ یہاں اس کے معنی تھوڑے کے ہے اس بات کو سمجھتے ہوئے غالبؔ کے کچھ مثالیں پیش کی ہے۔ مثال کی طورپر۔ نیم ناز اور نیم گناہ وغیرہ اور یہ بھی کہا کہ اس کا استعمال روزمرہّ کی زبان کے مطابق ہے۔

انگشتری ،خاتم

'' انگشتری '' اور '' خاتم '' دونوں ایک ہیں۔ تم نے '' حاتم '' بہ معنی ''نگین '' باندھا،یہ غلط ہے[۱۱]

یہ خط بھی تفتہؔ کے نام لکھا گیا ہے اس خط میں غالبؔ نے تفتہؔ کو ان کی ایک غلطی کے طرف متوجہ کیا ہے تفتہؔ کے '' خاتم '' بہ معنی '' نگین '' استعمال کیا تھا۔ غالبؔ نے یہ خط کہ خاتم نگین کے معنی میں استعمال نہیں کیاہے ۔ '' خاتم انگشتری '' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مولانہ امتیاز علی عرشی نے فر ہنگ غالب میں غالبؔکا یہی بیان نقل کیا ہے۔

ریمیا ، ہمیبا

''ریمیا و ہمیےا '' خرافات ہے۔ اگر ان کی اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاتون اوربوعلی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ ''کمیا '' او ر '' سمیبا '' دو علم شریف ہیں۔ جو اشیاء کی تاثر سے تعلق رکھے وہ ''کیمیا '' اور جو اسما سے متعلق ہو وہ ''سمیبا'' ۔ یہ خط بھی تفتہؔ کے نام تحریر کیاگیا ہے۔ا س خط میں چار الفاظ '' ریمیا '' ، ''ہمیبا'' ، ''کمیبا'' اور'' سمیبا'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے کے دو لفظوں کے بارے میں غالبؔ کا خیال ہے کہ یہ لغو ہیں اور اصل سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہر حال مذکورہ دونوں لفظوں کا علوم سے تعلق ہے پھر غالبؔ نے اس کی وضاحت کی ہے کہ علم کمیبا میں اشیاء کی تاثر سے بحث کی جاتی ہے۔ مولانہ امتیاز علی خان عرشیؔ نے فرینگ غالب میں ان دولفظوں کو شامل کرکے غالبؔ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔

نا شتا

'' ناشتا '' اس کو کہتے ہیں جس نے کچھ نہ کھایا ہو ۔ روح رانا شتا فرستادی ، یعنی روح کو تونے بھوکا بھیجا۔

'' ناشتا '' اس کو کہتے ہیں جس نے کچھ نہ کھایا ہو ۔ ہندی میں اس کو '' نہا رمنہ '' تم لکھتے ہو:

کہ عجب ناشتا فرستادی

یعنی غذائے صبح، جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے: اُس نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں؟ واقف کہتا ہے: ؎[۱۲]

غالبؔ نے یہ خط بھی تفتہؔ کے نام لکھا ہے اس خط میں '' ناشتا '' سے متعلق یہ بتایا ہے کہ تفتہؔ نے اپنے فارسی مصرعے میں لفظ ''ناشتا '' غذائے صبح کے معنی میں استعمال کیا تھا۔غالبؔ نے جواب میں تحریر کیافارسی ''ناشتا '' اس آدمی کو کہتے ہیں۔ جس نے کچھ نہ کھایا ہو۔ غذائے صبح اُردو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عرشیؔ صاحب نے فرہنگ غالبؔ میں غالبؔ کا یہی بیان نقل کیا ہے۔

ارغنون

دو باتیں سُنو: ایک تو یہ کہ ''ارغنوں'' کو بہ عینِ مضموم میں نے سہو سے لکھا۔دراصل ''ارغنوں'' بہ غینِ مفتوح اور مخفف اُس کا '' ارغن'' اور مبدل منہ ''ارگن '' ہے۔ ؎[۱۳]

غالبؔ نے یہ خط بھی تفتہؔ کے نام لکھا ہے۔ اس میں غالبؔ نے لفظ ''ارغنون'' سے متعلق گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ ''ارغنون'' سے ''ارغن'' اور اس ''ارگن'' کی تخلق ہوتی۔ عرشیؔ صاحب نے فرہنگ غالبؔ میں غالبؔ کا مذکورہ بالا بیان تحریر کیا ہے۔

رائے ثقیلہ

رائے ثقیلہ ، ہائے مخلوط ، تشدیدیہ تینوں تقا لتیں مٹادیں۔ ؎[۱۴]

یہ خط بھی تفتہؔ کے نام تحریر کیا گیا ہے۔ اس خط میں غالبؔ نے رائے ثقیلہ (ڑ) ہائے مخلوط (ھ) اور تشدید پر اپنے حیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل زبان رائے ثقیلہ (ڑ) کے بجائے رائے قرشت (ر) لکھا کرتے ہیں ۔ مثال کے طورپر ایک گاؤں کانام ''گڑگاؤں'' ہے تو اسے '' گرگاؤں'' کہیں گے۔ اسی طرح بائے مخلوط سے بھی اجتناب برتتے ہیں جیسے '' لکھنؤ '' کو '' لکنؤ '' لکھتے ہیں اور تشدید پربحث کرتے ہوئے غالبؔ نے لکھا ہے کہ عرفیؔ '' جھکّڑ '' کو ''جکر '' بولتا ہے یہ اہل زبان کے اصول ہیں اور یہی مناسب ہے۔

تن تن، تننا

تم نے ''تن تن'' کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اِس باب میں کچھ لکھانہ تھا ۔'' تن تن'' اور ''تننا '' اصوات ہیں تارکے۔ ہندی و فارسی میں مشتر ک۔ ؎[۱۵]

تفتہؔ کے نام لکھے گئے اس خط میں غالبؔ نے صرف اتنا بتایا ہے کہ ‘‘تن تن’’ اور ‘‘تننا ’’ ساز کے تاروں سے نکلنے والی آوز وں کو کہتے ہیں۔ ان لفظوں کا استعمال اُردو اور فارسی دونوں میں مشترک ہے۔ مولانہ امتیاز علی عرشیؔ نے بھی فرہنگ غالبؔ میں غالبؔ کے یہی الفاظ لکھے ہیں۔

خالق معنی

‘‘ خالق معنی ’’ ‘‘بہ معنیِ’’ ‘‘معنی آفریں’’ صحیح او ر مسلّم اور جائز۔ لیکن جس طرح ‘‘اللہ’’ میں مشدّ دلام کو دولام کے قائم مقام قرار دیا ہے، ‘‘ الہٰ ’’ اور ‘‘الہیٰ’’ میں الف ممد ودہ کو دوسرا الف کیوں کر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا ، اتفاقِ سلف شرط ہے۔ جب اور کسی نے ‘‘الہی’’ میں دو الف نہیں مانے، تو ہم کیوں کر مانیں؟ ۱۶

تفتہؔ کے نام لکھے گئے اِ س خط میں غالبؔ نے اولاً یہ بتایا کہ ــــ‘‘ خالق معنی ’’ کے معنی ‘‘ معنی آفریں ’’ جائز اور صحیح ہے۔ دوسری بات یہ بتائی کہ اللہ اور الہٰ اور الہٰی ان الفاظ میں کافی فرق ہے ۔اللہ میں مشد و لام کو دو لام قرار دیا جاتا ہے لیکن الہٰ اور الہٰ میں الف ممد وہ یعنی والا الیف جسے کھینچ کر پڑھا جائے تو دوسرا الف نہیں سمجھنا چاہئے کیوں کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔فر ہنگ غالبؔ میں غالبؔ کے یہی بیان کو نقل کیا گیا ہے۔

نبیاء امامن

‘‘ نبَیا ’’ اور ‘‘امامن’’ کے لکھنے کو میں نے منع ہر گز نہیں کیا ، شوق سے لکھو۔ یہ تم کو سمجھایا تھاکہ ‘‘نبیا’’ ‘‘ مخفف ’’ ‘‘بنی بخش ’’ اور ‘‘ امامن’’ متعلق بہ ‘‘امام’’ ہے مشتقات میں سے اِس کو تصورنہ کرو۔ ۱۷

غالبؔ نے یہ خط بھی تفتہؔ کے نام تحریر کیا ہے۔ اس خط میں غالبؔ نے مشتقات اور مخفف سے متعلق بعض باتیں تحریر کی ہیں۔ ددنوں الگ الگ چیزیں ہیں پھر ‘‘بنیا ’’ اور ‘‘ امامن’’ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ‘‘ نبیا’’ ‘‘بنی بخش’’ کامخفف ہے اور ‘‘ امامن’’ ‘‘امام’’ کا مخفف ہے۔ انھیں مشتقات میں شمار کرنا غلط ہے۔

دویم

‘‘ دویم ’’ بروزنِ ‘‘جویم’’ غلط ‘‘ذْوم’’ ہے، بغیر تحتانی ،بالفرض تحتانی بھی لکھیں، تو ‘‘دیم’’ پڑھیں گے، گرچہ لکھیں گے ‘‘دویم’’ و او کا علان ٹکسال باہر ہے۔

ہاں ‘‘ دومی ’’ درست ہے مگرنہ بہ حدفِ تحتانی مثلِ ‘‘ زصلٰی ’’ نہ بہ حـذفِ نـون بلکہ بہ طریقِ قلبِ بعض ‘‘ دویم’’ کا ‘‘دومی ’’ ہوگیا ۔ ؎۱۸

تفتہؔ کے نام لکھے گئے اس خط میں غالبؔ نے لفظ ‘‘دویم’’ سے متعلـق بحث کی ہے کہ اصـل لفظ بغیر ‘‘ ی ’’ کے ہے یعنی ‘ ‘ دوم ’’ دوسری جـانب یہ بتایـا کہ اگـر تحتانی کے ساتھ لکھا بھی جائے تو واو کو ظاہر نہیں کیا جـائے گـا بلکہ ‘‘ دیم ’’ پڑھـا جائے گا۔ واو کا اعلان تو اہل زبان کے یہاں مستعمل نہیں ہے۔

مولانہ امتیاز علی خان عرشیؔ نے فرہنگ غالب ؔمیں غالبؔ کا یہی بیان نقـل کیـا ہے۔

نشتن، زیدن

معلوم رہے کہ لوطیوں کے منطـق میں خصوصـاً اور اہـلِ پـارس کے روزمـرہ میں عموماً ‘‘ نشتن ’’ استعار ہے ‘‘ ریدن ’’ کا چنـانچہ ایـک تـذکرے میں مرقـوم ہے کہ اصفہان میں ایک امیر نے شعرا کی دعوت اپنے باغ میں کی۔ ؎۱۹

غالبؔ نے یہ خط علاء الدین علائیؔ کو تحریر کیا ہے اس خط میں انھوں نے لفظ ‘‘نشتن’’ اور ‘‘ریدن’’ سے متعلـق گفتگو کی ہے غـالبؔ کـا خیـال ہے کہ اہـل ایـران میں روز مرہ میں یہ دونوں الفاظ اشعارہ کے طورپر استعمال ہوتے ہیں۔

ضمیران ، بروزن

‘‘ ضــمیران’’ ‘‘بـروزن’’ ‘‘دْرگـران’’ لغت عـربی ہے نہ مغـربِ میں یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ یہ پْھول ہندوستان میں ہوتـا ہے یـا نہیں ۔اسـکی تحققیـات ازروئے ‘‘الفـاظ الادویہ’’ ممکن ہے۔ ’’ ؎۲۰

علائی کے نـام لکھے ہـوئے خـط میں غـالبؔ نے لفـظ ‘‘ضـمیران ’’ ‘‘بـروزن’’ ‘‘دڑگـران’’ کے بـارے میں بحث کی اور یہ بتایـا کہ یہ ایـک پھول ہے جـو ہندوستان میں ہوتا ہے یا نہیں اس بات کی تحقیق کرنا ہوگا۔ غالبؔ کے خیال میں یہ لفـظ عربی نہیں ہے اورنہ ہی کسـی زبـان سے لے کـر اس کی عـربی بنـائی گئی ہے۔اُردو معلی میں بھی یہ لفظ ضمیران ہی لکھا ہوا ہے۔

خسر

‘‘خسر’’ لغت فارسی نہیں۔ سسرے کی تفرلیس سے ‘‘خسر ’’ پیدا ہواتو کیـا عجب ہے تم سے اس کی تحقیق چاہی تھی کہ یہ لغت عـربی الاصـل نہ ہـو، وہ معلـوم ہـوا کہ عربی نہیں لغت ہِندی ہے مفرس ،اور یہی تھا میرا عقیدہ۔ ؎۲۱

یہ خط بھی علاء الدین خان علائیؔ کے نام لکھا گیا ہے اس میں ''خسر '' سے متعلق بحث کی گئی ہے غالبؔ کاشبہ تھاکہ کہیں یہ لفظ عربی الاصل نہ ہواس وجہ سے انھوں نے علائیؔ سے اس کی تحقیق چاہی تھی چنانچہ علائیؔ نے اس تو ضیح کی یہ لفظ ہندی ، اُردو ہے۔ اس خط سے مزید بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ ''سسرے'' ہے جو کہ ہندوستانی ہے اور اس سے فارسی میں '' خسر'' بنایا گیا ہے۔

پر

'' پر '' بہ معنی لیکن لفظ مشہور ہے اور ''پہ'' اُس کا مخفف ہے۔ اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہو۔ کوئی اور لکھے یا نہ لکھے میرے اردو کے دیوان میں سو دوسو جگہ یہ لفظ آیا ہوگا۔ ۲۲

غالبؔ نے یہ خط میاں داد خاں سیاحؔ کے نام تحریر کیا ہے اس خط میں غالبؔ نے '' پر '' کے بارے میں میں گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اس کے معنی ''لیکن '' کے ہیں اور اس کا مخفف '' پہ '' ہے مزید یہ بھی تحریر کیا ہے کہ میر ے اُردو دیوان میں لفظ کثرت استعمال ہوا ہے۔'' پر'' بہ معنی '' لیکن'' لفظ مشہور ہے اوریہ اس کا مخفف ہے اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہو کوئی اور لکھے یا نہ لکھے میرے اُردو کے دیوان میں سو دوسو جگہ یہ لفظ آیا ہوگا۔

فہائش

'' فہمایش '' کا لفظ میاں بدّھا ولد میان جماّ اور لال گنیشی داس ولد لالہ بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے۔ میر زبان سے کبھی تم نے سنا ہے؟ اب تفصیل سنو۔ امر کے صیغے کے آگے ''شین '' آتا ہے، تو وہ امر معنی مصدری دیتا ہے اور اس کو '' حاصل بالمصدر '' کہتے ہیں۔ ۲۳

میر مہدی محروحؔ کے نام لکھے گئے اس خط میں غالبؔ نے یہ لفظ ''فہائش'' سے متعلق گفتگو کی ہے انھوں نے بتایا اس کا استعمال فارسی میں درست نہیں ہے یہ لفظ ہندوستانی کالیتھوں کا گڑھا ہوا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

کم

'' کم '' یہ لفظ اہل فارس کی منطق میں کہیں افادہ معنی سلب کلی بھی کرتا ہے جیسے ''کم آزار'' یعنی ''نیا زارندہ'' نہ یہ کہ '' کم آزارندہ '' ''کم ہمتا'' یعنی ''بے ہمتا '' بلکہ ''اندک'' کا لفظ بھی اس طرح آتا ہے، جیسا کہ میرا خداوند نعمت نظامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتا ہے۔ ۲۴

غالبؔ نے چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام لکھے گئے ایک خط میں لفظ ''کم''سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس کا استعمال کبھی کبھی مکمل نفی معنی میں ہوتا ہے۔ اس لئے ''کم آزار'' کے معنی نہ ستانے والا ''کم ہمتا'' کے معنی ''بہ ہمتا '' کے ہیں۔ آخری میں یہ بتایا کہ ''کمیاب'' اور ''نایاب'' ایک یہی چیز ہے۔

طرح

'' طرح '' فتح اول وسکونِ ثانی بہ معنی قریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بہ معنیِ آسائشِ دینا بھی مجاز ہے۔مرادف طرزورَوش بھی ''طرح'' ہے بفتحن ۔ اس کا تفرقہ منظور رہا کرئے۔ ۲۵

غالبؔ نے یہ خط چودھری عبدالغفورسروؔر کے نام تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے لفظ '' طرْح'' اور ''طرَح'' سے متعلق گفتگوکی ہے اور ان کے معنی بھی بتائے ہیں کہ اول الذکرکے معنی '' فریب اور مجازا '' آسائش دینا بھی مراد ہے۔ اور ثانی الذ کر بہ معنی ۔''طرزوروش '' کے ہیں۔

وارکرے

'' وارکرے '' یہ معنی حملہ کرے کے ہے اور وہ آپ کا مقصود ہے اُن معنوں میں ''وارنا'' اور ''وارے'' آیا ہے ۔ نہ '' نہ وارکرنا ''وارکرے'' ۔ ۲۶

عبدالغفورسرورؔ کے نام لکھے ہوئے غالبؔ کے خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرورؔ نے اپنی کسی تحریر میں '' وارکرے'' کو ''وارنا'' اور ''وارے'' کے معنی سے استعمال کیا۔ غالبؔ نے بتایا کہ اس کا استعمال غلط ہے کیوں کہ ''وارے'' کے معنی ہیں '' نچھاور ہونا '' اور ''وارکرے'' کے معنی ہوتے ہے حملہ کرنا۔

عین

ایک قاعدہ تم کو معلوم رہے، '' عین '' کا حرف فارسی میں نہیں آتا جس لغت میں '' عین '' ہواُس کو سمجھنا کے عربی ہے۔ ۲۷

یہ خط سیاحؔ کو لکھا گیا ہے۔ غالبؔ کہتے ہے کہ '' عین '' کا حرف فارسی میں نہیں آتا جس لفظ میں یہ حرف آئے تواسے عربی سمجھنا۔

کدہ

'' یہ اُلّو کا پٹھا قتیل '' صفوت کدہ وشفقت کدہ'' و '' نشترکدہ'' کو اور '' ہمہ عالم '' و '' ہمہ جا'' غلط کہتا ہے''۔ ۲۸

مذکورہ بالا خطوط میں غالب نے لفظ ''کد ہ'' سے متعلق گفتگو کی ہے۔ انھوں نے یہی مضمون اپنی کتاب ''قاطع برہان'' میں بھی تحریر کیا ہے کہ کلکتہ میں مجھے قتیل ؔکے شاگرد نے یہ بتا یا کہ استاد فرماتے ہیں کہ کدہ کا لفظ سوائے پانچ چار اسما کے دوسرے اسما کے ساتھ ترکیب پاتا۔

:مرکبات

غالبؔ کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے ہمیں ان کے خطوط میں جو لسانی مرکبات کا استعمال ہوا ہیں ان کا مطالعہ کرکے کچھ مرکبات پر بحث کرنے ہوگی۔ ایسے مرکب الفاظ کا استعمال غالبؔ نے کیا ہے جو ان کی تحریر کو حسین عطا کرتے ہیں۔ اورا سی مرکب الفاظ کا تحریر میں بیان مناسب اور غیر مناسب صحیح اور غلط پر بھی بحث کی ہے ۔ غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اس بات کو واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

بیش و بیشتر

یہ لفظ روزمرہ کی بول چال کا ہے کچھ خطوط جو غالبؔ نے تفتہؔ کے نام لکھے ہیں غالبؔ نے ان میں ''بیش و بیشتر'' کے متعلق گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ ترکیب صحیح نہیں ہے انھوں نے تفتہؔ کو اس کے استعمال سے منع کیا ہے لکھتے ہیں کہ

دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی ''بیش و بیشتر '' کا قصہ نکلا۔ غلطی میں جمہورکی پیروی کیا فرض ہے۔[۲۹]

بیش از بیش

''بیش از بیش'' و ''کم از کم'' ، اس ترکیب کو فصیح بتاتے ہے۔ اس کے علا وہ اور تو '' مہر اور وفا '' ''بیش از بیش'' اور ''کم از کم'' کو حسب معنی جائز بتاتے ہے۔ لیکن صفاحت اس میں کم ہے یہ بات غالبؔ نے تفتہؔ کے نام لکھے ہوئے خط میں بتایا ہیں کہ یہ ترکیب بہت فصیح ہے ۔ غالبؔ نے ''بیش از بیش'' اور ''کم از کم'' کی ترکیب کو بھی معنی کے لحاظ سے جائزٹھرایا ہے لیکن یہ بھی لکھا کے اس کی فصاحت کم ہے۔

جواں مرد

‘‘جواں مرد’’ ‘‘جواں بخت’’ ‘‘ جواں دولت’’ ‘‘جواں عمر ’’ ‘‘جواں سال’’ ‘‘جواں خرد’’ ‘‘جواں مرگ’’ یہ الفاظ مقررۂ اہل زبان میں کبھی مقلوب و معکوس نہیں آتے۔ ؎۳۰

غالبؔنے مذکورہ بالا خط مہدی مجروحؔ کے نام تحریر کیا ہے۔اس خط میں انہوں نے ‘‘جواں مر د’’ ‘‘جواں بخت’’ ‘‘ جواں دولت’’ ‘‘جواں عمر ’’ ‘‘جواں سال’’ ‘‘جواں خرد’’ ‘‘جواں مرگ’’ جیسی ترکیبوں کودرست ٹھہرایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ الفاظ اہل زبان کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔

مولانا امیتاز علی عرشیؔ نے ‘‘فرہنگ غالبؔ ’’ میں غالب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

لب بام

‘‘ لب ِ بام’’ ‘‘لب ِفرش ’’ ‘‘لب ِگور ’’ ‘‘لب ِچاہ’’ ‘‘ لب ِدریا’’ ‘‘لب ِساحل’’ بہ معنی کنارے کے ہے۔ مستعمل اہل ایران ۔ ‘‘لب ِبام’’ اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں ایک قدم آگے بڑھائے تو دھم سے انگنائی میں آئے۔ پس ‘‘لب ِدریا’’ اسے سمجھے، جہاں سے قدم بڑھائے تو پانی میں جائے اور ‘‘ لب ِساحل’’ وہ ہوا جہاں سے آگے بڑھے تو دریا میں گرے۔؎۳۱

غالبؔ نے یہ خط منشی ہیرا سنگھ کو تحریر کیا ۔اس خط میں انہوں نے ‘‘لب ِبام’’ ‘‘لب ِفرش’’ ‘‘لب ِگور’’ ‘‘لب ِچاہ’’ ‘‘لب ِدریا’’ ‘‘لب ساحل’’ جیسی ترکیبوں سے متعلق گفتگو کی ہے کہ اوران الفاظ کے معنی بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

لب ِبام۔ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں ایک قدم آگے بڑھائے تو دھم سے انگنانی میں آئے۔

لب ِدریا ۔ جہاں سے قدم بڑھائے تو پانی میں جائے

لب ِساحل ۔ وہ جہاں سے آگے بڑھے تو دریا میں گرے۔

فرہنگ غالبؔ میں عرشیؔ صاحب نے غالبؔ کا یہی بیان نقل کیا ہے۔

سیلاب چی

‘‘سیلاب چی’’ ایک لفظ ہے ہندیانِ فارسی دان کا اصل لغت ‘‘ چلمچی ’’ اور یہ لغت ترکی ہے۔ معہذا ‘‘حباب آسماں’’ جب تک کہ آسماں کو بحریا دریا نہ کہیں ‘‘ حباب آسماں ’’ نہ مقبول نہ مسموع ۔؎۳۲

یہ لفظ ''سیلاب چی'' کے بارے میں غالبؒ نے مولوی عبدالزراق شاکرؒ کے نام لکھا ایک خط جس میں بتایا ہے کہ یہ ہندوستانی فارسی دونوں کا وصنع کیا ہوا لغت ہے۔ اہل زبان ''چلمچی '' کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ لفظ ''حباب آسماں'' بحردریا کے مناسبات کے ساتھ استعمال ہوسکتا ہے۔

قبلہ و کعبہ

غالبؒ نے قبلہ و کعبہ کی ترکیب سے متعلق گفتگو اپنے خط سیّد احمد حسن مودودی کے نام تحریر کردہ خط میں غالبؒ نے قبلہ ع کعبہ کی ترکیب سے متعلق گفتگو کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ ترکیبیں درست نہیں ہیں اور کہا کہ یہ ادب کے خلاف ہے قبلہ قبلہ اور کعبہ کعبہ کبھی نہ لکھیں۔

"پہلے التماس یہ ہے کہ آپ سید صحیح النسب، تمام امتِ مرحومہئ محمد ؑعلیہ اسلام کے قبلہ و کعبہ،جب آپ مجھ کو قبلہ و کعبہ لکھیں تو پھر میں آپ کو کیا لکھوں؟ خدا کے واسطے غور کیجیے کہ "قبلہ قبلہ" اور "کعبہ کعبہ" یہ کیا ترکیب ہے؟ چوں کہ آپ نے سمجھے استاد گر دانا ہے۔ اس التماس کو بھی از قسمِ اصلاح تصور کیجیے۔ زنہار "قبلہ قبلہ" کبھی نہ لکھے گا۔ یہ سوء ادب ہے بہ نسبت قبلہ عیاذاً باللہ۔" ۳۳ے

آب حرام اشتیاق

غالبؔنے خط غلام حسین قدر بلگرامیؒ کے نام تحریر کیا ہے۔ اس خط میں انھوں نے '' آب حرام اشتیاق '' ، ''آب حرام'' اور ''شراب'' کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کا استعمال مناسب موقع پر کیا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ ''نبیذ '' ، '' بادہ ' ' ، ''رحیق '' '' مے '' ''مترقف'' اور ''رارق'' کی طرح اسم نہیں ہے ۔مزید لکھا ہے کہ ''اشتیاق'' کی جگہ ''شوق'' مناسب ہے۔ اس لیے ''شراب شوق'' یا ''بادۂ شوق '' لکھنا چاہتے۔ وہ خط درج ذیل ہے۔

''آب حرام اشتیاق'' '' آب حرام '' ''شراب'' کومحل مناسب پر کہیں تو کہیں ورنہ ''نبیذ '' اور ''بادہ'' اور ''رحیق '' اور ''مے'' اور ''قرقف'' اور ''رادق'' کی طرح اسم نہیں، نا چار '' شرابِ شوق'' یا ''بادۂ شوق'' لکھنا چاہیے۔ ''اشتیاق'' سے ''شوق'' بہتر ہے۔ے[۳۴]

ذیل میں منددجہ بالا الفاظ کے معنی لغات کشوری سے تحریر کیے گئے ہیں ۔

نبیذ ۔ وہ شراب جو خرما اور جو سے بنائی جائے

بادہ - شراب ، دارد ، مدھ

رحیق - شراب خالص اور صاف

مے - شراب

قرقف - بمعنی شراب

راوق - شراب کی صافی مگر فارسی کے ستعمال میں مجازا بمعنی شراب صاف کے

رب کبریا

اس لفظ کی وضاحت غالبؔ نے اپنے ایک خط میں جو قدر بلگرامیؔ کے نام تحریر کیا ہے ۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں غالبؔ نے لکھا کہ یہ غلط ہے ۔اورکہا کے ‘‘ربّ کبریا’’ میں ‘‘کبریائے الٰہی ’’ یعنی خدا کی بزرگی صحیح ہے۔لیکن قدرؔ بلگرمی کا مقصد ‘‘کبریائے الٰہی’’ سے نہیں پورا ہورہا ہے۔ اس لیے غالبؔ نے انھیں ‘‘رب کبیر ’’ یعنی خدائے بزرگ لکھنے کا مشورہ دیا اور خط کے دوسرے حصےؔ میں غالبؔ نے یہ بتایا کہ اگرصفت سے موصوف مراد لیا جائے کو ‘‘جناب کبریا ’’ کی جگہ ‘‘جناب الٰہی’’ لیا جاسکتا ہے۔

خط کا اقتباس۔

”آج تک سنا نہیں کہ ”ربّ کبریا“ کسی نے لکھا ہو۔ ہاں ”کبریائے الٰہی“ یعنی خدا کی بزرگی اس نظر پر ”رب کبیر“ لکھیں گے۔نہ ”ربّ کبریا“۔ ”کبریا“ صفت واقعی ہے لیکن اگر صفت سے موصوف مراد رکھیں تو ممکن ہے۔ جیسا کہ زید عدل کے ”بجائے“ ”زید عال“ ”جناب کبریا“ بجائے ”جناب الٰہی“ جائز۔“ ۳۵ ؎

خستہ کام و اندیشہ کام

یہ دونوں لفظ کی ترکیب کا ذکر غالبؔ نے اپنے تحریر کردہ خط قاضی عبدالجمیل جنون بریلویؔ کے نام لکھا ہے۔

‘‘ خستہ کام و اندیشہ کام’’ دونوں لفظ ٹکسال باہر ہیں۔ہاں ‘‘نا کام’’ اور ‘‘دشمن کام ’’ و ‘‘دوست کام’’ لکھتے ہیں اور ‘‘تشنہ کام’’ اور ترکیب ہے۔ کام یہ معنی ‘‘تا لو’’ کے ہے نہ بہ معنی ‘‘مقصد ’’ و ‘‘مدعا’’ کاغذ لفافے میں اس طرح لپٹیا کیجیے کہ کھُلنے کی جگہ باقی رہے۔ ؎۳۶

غالبؔ نے ‘‘خستہ کام و اند یشہ کام’’ کی ترکیب کو ٹکسال کے باہر بتایا اور ‘‘نا کام ’’ اور ‘‘دشمن کام’’ اور ‘‘دوست کام ’’ جیسی ترکیبوں کو درست ٹھرایا۔ اور ‘‘تشنہ کام’’ کے معنی مقصد و مدعا بتایا ہے۔

تذکیرو تانیث:

جنس کے لحاظ سے اِسم کی اقسام مذکر، مونث ہے ۔ مذکر ایسا اسم جو نر کے معنوں استعمال ہو جیسے لڑکا ، مرد اور مونث ایسا اِسم جو مادہ کو معنوں میں بولا جائے جیسے لڑکی ، عورت اس کے علاوہ تذکیر و تانیث حقیقی انسانی تذکر وتانیث ہوتے ہیں۔

غالبؔ کے نثری تحریر وں میں تذکرو تانیث پر بھی گفتگو کی ہے۔ قواعد ، املا کے علاوہ تذکرو تانیث کا خاص طورپر خیال رکھا ہے وہ اُصول کے سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اور اپنے خطوط میں اپنے شاگردوں اور عزیر واقادب کو تحریری اُصول کے ساتھ تذکیروتانیث پر بھی بحث کرتے تھے۔غالبؔ نے خطوط میں ایسے الفاظ بیان کیے اور ان الفاظوں کے لیے مذکر و مونث کا استعمال بھی بتایا ہے۔

غالبؔ نے میر مہدی مجروحؔ کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں غالبؔ نے لفظ مقدر اور تقدیر کی تذکیر وتانیث سے متعلق بحث کی ہے اور مجروحؔ کو لفظ مقدر مونث ہے اور تصویر مذکر ہے اس بات کی توصیح کرتے ہوئے غالبؔنے صاف طورپر یہ بتایا کے مقدر مذکر ہے اور تقدیر مونث ہے

۔خط کا اقتباس۔

”مقدر“ مذکر اور ”تقد یر“ مونث ہے۔کو ن کہے گا فلانے کی مقدر اچھی ہے؟ کون کہے گا کہ ڈھمکے کاتقدیربُرا ہے؟یہ مئسلہ صاف ہے۔مذ بذب نہیں، کوئی بھی مقدار کو مونث نہ کہتا ہوگا۔ تم کو تردو کیوں ہوا۔“ ۳۷ ؎

غالبؔ کے اس بات کی تصدیق ہمیں سید احمد دہلوی کی ‘‘فرہنگ آصیفہ’’ اور نورالحسن کی نوراللغات سے ہوتی ہے۔ دونوں میں مقدر کو مذکر اور لفظ تقدیر کو مونث مانا گیا ہے۔

غالبؔ نے ایک خط میر مہدی مجروحؔ کے نام تحریر کیا ہے اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجروحؔ نے غالبؔ سے تذکیر و تانیث سے متعلق کچھ تفصیلات جاننی چاہے۔ تو غالبؔ نے اس کے جواب میں ان کو یہ تحریر کیا کہ اس کا کوئی

قاعدہ نہیں ہے بلکہ لوگوں نے اس کے اصول و ضوابط بنالیے ہیں۔ پھر کچھ الفاظ کے بارے میں بتایا کہ میرے نزدیک ان کی حیثیت ہے۔

خط کا اقتباس۔

تذکیروتانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے جو جس کے کانوں کو" لگے، جس کو جس کا دل قبول کرے اس طرح کہے "رتھ" میر نزدیک مذکر ہے۔ یعنی رتھ آیا لیکن جمع میں کیا کروں گا۔ ناچار مونث بولنا پڑے گا یعنی "رتھیں آئیں"۔ خبر مونث ہے۔ یہ اتفاق، مگر کاغذ اخبار اس کو جو سمجھ لو کہ تمہارا دل کیا قبول کرتا ہے"۔میں تو مذکر کہوں گا یعنی "اخبار آیا" پیر ہوئی یا ہوا؟ یہ منطق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ "دو شنبہ ہوا" "پیر کا دن ہوا" "نری پیر ہوئی" یا "پیر ہوا"۔ ہم کہوں بولیں گے؟ "بلبل" میر نزدیک مونث ہے جمع اس کی "بلبلیں"، "طوطی بولتا ہے" "بلبل بولتی ہے"۔ بھائی اس امر میں مفتی و مجتہد بن نہیں سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتا ہوں، جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔" ۳۸ے

اس طرح غالبؔ نے مذکورہ خط میں کچھ الفاظ نجات کا طالب ان کے نزدیک تذکیروتانیث ہے بنایا ہے جیسے الفاظ ''رتھ'' ان کے نزدیک مذکر ہے لیکن جمع کے صیفہ میں یہ تانیث ہوجائیگا۔ ''خبر'' اپنے آپ میں مونث ہے لیکن مرکبات میں یا جمع کے صیفہ میں یہ مذکر ہوجائے گا۔ لفظ ''پیر'' کو لوگ مذکر مانتے ہیں اور کچھ لوگ مونث مانتے۔ اور اپنی ذاتی رائے پیش کرتے ہوئے غالبؔ تحریر کرتے ہیں۔ کہ نری پیر ہوئی یا ہوا، غلط ہے بلکہ پیر کا دن ہوا۔ یہ جملہ صحیح ہے۔ اور بلبل اور طوطے کے بارے میں بتایا ہے کہ بلبل میرے نزدیک مونث ہے اور طوطی مذکر ہے۔

یہاں یہ بات واضح ہو نا ضروری ہے کہ '' رتھ'' کو صاحب نوار لغت نے بھی غالبؔ کی طرح مذکر لکھا ہے اس کے علاوہ صاحب فرہنگ آصیفہ نے اسے مذکر و مونث دونوں مانا ہے۔اور لفظ ''خبر'' اور ''پیر'' کو دونوں لغت نگادوں نے غالبؔ کی رائے سے اتفاق کیا ہے یعنی ''خبر'' مونث اور ''پیر'' مذکر ہے مانا ہے۔ اور لفظ بلبل بذکیر وتانیث دونوں جائز قرار دیا ہے۔

فرینگ آصفیہ نے بھی غالبؔ کے لفظ طوطی کو مذکر تحریر کیا ہے اور بعض شعرا جیسے نظیرؔنے مونث کہا ہے اور عوام بھی مونث ہی مانتے ہیں اس کہ ہر عکس صاحب نوراللغات نے لکھا ہے اس کی تذکیرو تانیث میں اختلاف ہے۔

قلم ، دہی ، خلعت

غالبؔ نے منشی صاحب کو لکھا ہوئے خط میں لفظ قلم، دہی ، خلعت کی تذکیر و تانیث کو بیان کیا ہے لکھتے ہیں کہ ،

"گلشن" بعض کے نزدیک مونث اور بعض کہ نزدیک مذکر ہے۔ "قلم" "دہی" "خلعت ان کا یہی حال ہے کوئی مؤنث کوئی مذکر بولتا ہے۔ میرے نزدیک "دہی" اور "خلعت" مذکر ہے۔ اور "قلم" مشترک۔چاہو مذکر کہو چاہو مونث "گلشن" البتہ مذکر مناسب ہے۔" ۳۹ے

اس کے علاوہ یہی لفظ دہی قلم اور شنگرف کی تذکیرو تانیث کا ذکر غالبؔ نے مولانا محمدنعیم الحق آذادؔ کو تحریر کیے خط میں بھی کیا۔

'' تذکیروتانیث کا دائرہ بہت وسیع ہے "دہی" بعض کہتے ہیں "دہی اچھا"، بعض کہتے ہیں کہ "دہی اچھی" "قلم" کوئی کہتا ہیں "قلم ٹوٹ" گیا۔ کوئی کہتا ہے "قلم ٹوٹ گئی" ہے۔ فقیر دہی کو مذکر بولتا ہے اور "قلم" کو بھی مذکر جانتا ہے۔علی ہذا القیاس۔"شنگرف"۔ بھی مذبدب ہے۔ کوئی مذکر اور کوئی مونّث کہتا ہے۔ میں تو شنگرف کو مونث کہوں گا۔" ۴۰ے

نقاب، قلم ، دہی ، فریاد، فکر

قدر بگرامی ؔسید غلام حسین کو غالبؔ نے ۲۲ خطوط لکھے۔ اور ۱۷ ویں خط میں اور لفظ '' نقاب'' ''قلم'' ''دہی'' '' فریاد'' '' فکر'' کے مونث پر روشنی ڈالی۔ ملا خط فرمایائے۔

فقیر کے نزدیک "نقاب" اور "قلم" اور "دہی" ترجمہ جغرات،یہ تینوں اسم مذّکر ہیں" منکر سے مجھے بحث نہیں۔مجیب کا میں احسان مند نہیں۔ لغت فارسی اور روزمرہ فارسی ہوتو اہل زبان کے کلام سے سند کریں۔ منطق فارسی میں تذکروتانیث کہاں؟ ---"فریاد" مونث ہے۔"فریاد کرنی" چاہئے۔ "فریاد کرنا" انگریزی بولی ہے۔"فکر" مونث ہے۔" ۱۴ے

مذکورہ خطوط سے ہمیں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ تذکیروتانیث کا کوئی قاعدہ نہیں ہے جس کے کانوں کو جو اچھالگے وہ استعمال کرلیتے ہیں۔

غالبؔ نے میاں داد خان سیاحؔ اور مولانا نعیم الحق آذادؔ اور غلام حسین قدربلگرامی ؔکے نام تحریر کیے گئے خطوط میں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ان تینوں خطوط میں '' قلم'' ''دہی'' مشترک ہے ان کے بارے میں غالبؔ نے اپنی رائے بیان کی ہے کہ ''دہی'' مذکر ہے اور ''قلم '' مشترکہ لفظ ہے اسے مذکر اور مونث

دونوں کہا جاسکتا ہے۔ لیکن غالبؔ بذات خودقلم کو مذکر ہی بولتے تھے۔'' شنگرف'' کے بارے میں غالبؔ کا خیال ہے کہ کوئی مذکر بولتا ہے اور کوئی مونث لیکن غالبؔ خود مونث ہی بولتے تھے۔ اس طرح ''نقاب'' کو مذکر اور ''فریاد'' اور ''فکر'' کو مونث بولتے تھے۔

نسیم ، سانس،سانس جفا

غالبؔ نے چودھری عبد الغفورسرورؔ کے نام تحریر کیا خط میں ''نیم'' تخلص کے بارے میں دریافت کیا تو غالبؔ نے جواب میں لکھا کے ''نیم '' تخلص اچھا ہے حالانکہ یہ مونث ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور اس بات کی واضح کرتے ہوئے لفظ جراتؔ و حشتؔ وغیرہ تخلص ایسے ہے جو مونث ہیں اور لوگوں نے اسے استعمال کیا ہے۔ غالبؔ کا چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام لکھا خط۔

خط کا اقتباس۔

نسیم" تخلص اچھا ہے۔اگر کوئی کہے کہ "نسیم" مونث ہے، جواب اس کا یہ ہے کہ" جراتؔ اور وحشتؔ اور ایسے بہت تخلص ہیں کہ وہ مونث ہیں۔ بہ ایں ہمہ اگر بدلا چاہیے تو اس کا ہم وزن "سلام" "وسلیم" اور "خیال" بھی ہے اس میں جو پسند آئے۔" ۴۲ ؎

سانس جفا'' اس لفظ کے بارے میں غالبؔ نے کہا کہ یورپ تذکیروتانیث کا جھگڑا'' نظر آئے گا۔ کو ئی مونث اور کوئی مذکر بولے گا لیکن غالبؔ کے نزدیک ''سانس مذکر'' ہے اور کہا کہ اگر کوئی اس مونث بولے گا تو وہ اس منع نہیں کرسکتے۔ لیکن وہ مذکر ہی کہے گے۔ غالبؔ نے یوسف علی خان عزیز کے نام تحریرکیا خط ملا خطہ فرمائے۔

خط کا اقتباس۔

یورپ کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکیروتانیث جھگڑا بہت پاؤگے" "سانس" میرے نزدیک مذکر ّہے لیکن اگر کوئی مؤنث بولے گا تو بس اس کو منع نہیں کرسکتا خود "سانس" کو مؤنث نہ کہوں گا۔" ۴۳ ؎

جفا کے بارے میں کہتے ہیں کہ جفا مونث ہونے میں اہل دہلی و لکھنو کو با ہم اتفاق ہے لکھتے ہیں کہ مذکورہ غالبؔ نے مولانا محمد حسین مینامرزا پوری کو تحریر کیا ہے۔

بندہ پرور! لکھنؤ اور دہلی میں تذکیروتانیث کا بہت اختلاف پائیے گا۔"سانس" میرے" نزدیک مذکر ّہے لیکن اگر اہل لکھنؤ اُسے مونث کہیں تو میں ان کو منع نہیں کرسکتا۔ خود "سانس" کو مونث نہ کہوں گا۔ آپ کو اختیار ہے جو چاہیے کہیے مگر جفا کے مونث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے کبھی کوئی نہ کہے گا "جفا کیا"۔" ۴۴ ؎

جفا، ستم ، ظلم، بیداد

غالبؔ نے مردان علی خان رعناؔ کے نام تحریر کیا خط ہے جس میں ''جفا '' ''ستم'' ''ظلم'' اور ''بیداد'' کے تذکیروتانیث کا ذکر کیا ہے۔

بھائی "جفا" کے مؤنث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ" کہے گا "جفا کیا" ہاں بنگالے میں جہاں بولتے ہیں کہ "ہتھنی آیا"۔ اگر "جفا" کو مذکر کہیں تو کہیں ورنہ "ستم" و "ظلم" و "بیداد" مذکر ّ ا ور "جفا" مؤنث ہے بے شبہہ و شک۔" ۴۵ ؎

غالبؔ نے یہ تحریر کیا ہے کہ یور پ کے ملک یعنی لکھنؤ اور دہلی میں تذکیر وتانیث کا جھگڑا بہت ہے ۔جس کی وجہہ سے اختلاف پایا جاتا ہے۔''جفا'' کے بارے میں غالبؔ نے یہ لکھا ہے کہ اس میں لکھنؤ و دہلی کا باہم اتفاق ہے اور خود غالبؔ نے بھی لفظ کو مونث کہا ہے غالبؔ کے نزدیک '' ستم'' '' ظلم'' اور ''بیداد'' مذکر ہیں '' سانس '' کو غالبؔ نے مذکر لکھا ہے تو صاحب نوراللغات نے اس کو مونث ہی لکھا ہے۔ اور اہل دہلی بھی لفظ ''سانس'' مذکر بھی بولتے ہیں۔ لیکن

صاحب فرہنگ آصیفہ اور نوراللغات میں مونث ہی لکھا گیا ہے۔ ''ستم'' اور ''ظلم '' کو لغت نگاروں نے غالبؔ کی طرح مذکر ہی کہا لیکن لفظ ''بیداد '' کو غالبؔ مذکر مانتے ہیں تو ان لغت نگاروں نے اس لفظ ''بیداد '' کو مونث مانا ہے۔

حروف تہجی کے حروفوں جو درج کیے گئے ہیں۔

الف ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س
ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل
م ن و ہ ء ی ے

ان حروفوں میں غالبؔ نے تذکیروتانیث اپنے طورپر کی ہے ملا خط فرمائے۔ غالبؔ کے نزدیک حرف

الف - مذکر

مرکب لفظ ہے لیکن بولنے میں مذکر ہے۔

ب ت ث ۔ مونث

ج ۔ مذکر

ح خ ۔ مونث

د ذ ۔ مونث

ر ز ۔ مونث

س ش ۔ مذکر

ص ض ط ظ ۔ مونث

ع غ ۔ مذکر

ف ۔ مونث

ک ق م ل م ن و ۔ مذکر

ہ ی ے ۔ مونث

ء ۔ مذکر

ان حرفوں کی تذکیروتانیث کا ذکر غالبؔ نے یوسف علی خان عزیز کے نا م تحریر کیے خط میں لکھا۔اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکیروتانیث کا مسلہ عوام کا مشترک مسئلہ نہیں اس میں بہت اختلاف ہے اور کہا کہ اس کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں ہے۔ اس خط میں انھوں نے اُردو حروف تہجی کی تفصیل لکھ کر بتایا کہ کون سا حرف مذکر ہے اور کونسا مونث ہے۔

غالبؔ کے تحریر کردہ ان حروف کی بات کرتے ہیں جن کو لغت نگاروں کو اختلاف ہے۔

ج غالبؔ نے مذکر لکھا ہے اور فرہنگ آصیفہ نے مونث تحریر کیا ہے۔

د ذ غالبؔ نے مونث لکھا ہے اور فرینگ آصیفہ نے غالب کی طرح مونث لیکن صاحب نوراللغات نے ان کو مذکر لکھا ہے۔

ص کو غالبؔ نے مونث لکھا ہے فرہنگ آصیفہ نے اسے مذکر تحریر کیا ہے اور نورللغات نے مذکر لکھا ہے۔ یعنی غالبؔ صرف ضاد کو مونث لکھتے ہیں لیکن فرہنگ آصیفہ اور نوراللغات دونوں اسے مذکر لکھا ہے۔

و غالبؔ نے مونث تحریر کیا ہیں صاحب نوراللغات نے مذکر لکھا ہے۔

مردم ، خرام ، رفتار

غالبؔ نے تذکیروتانیث کی وضاحت اپنے تحریر کردہ خط جو مولوی عبدالرزاق شاکرؔ کے نام اس میں لکھا ہے کہ۔

'' مردم '' یعنی آنکھ کی پتلی مذکر نہیں معشوق کی قید کیا ضرور۔'' [۴۶]

''مردم'' یعنی آنکھ کی پتلی مونث ہے اس میں معشوق کی قید کی ضرورت نہیں ہے۔ فرہنگ آصیفہ میں اس لفظ کو آنکھ کی پتلی کے معنی میں مونث ہی لکھا گیا ہے اور صاحب نوراللغات نے اسے مذکر لکھا ہے۔

غالبؔ نے سیدغلام حسین قدرؔ بیگرامی کے نام تحریر کردہ خط میں لفظ ''خرام'' اور ''رفتار'' کی تذکیروتانیث کے بارے میں بتا یا ہے غالبؔ کے نزدیک ''خرام'' مذکرہے اور ''رفتار'' مؤنث ہے۔خط ملاخطہ فرمائیے۔

خرام" کو کون مونث بولے گا، مگروہ کہ دعوالے فصاحت سے ہاتھ دھوے گا؟ "رفتار"" مونث اور "خرام" مذکر ہے۔ "رفتار" کی تانیث کو "خرام" کی تانیث کی سند ٹھہرانا قیاس مع الفارق ہے۔" [۴۷]

غالبؔ کے اِملا کی خصوصیات

جب ہم غالبؔکے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے اپنے خطوط میں جہاں دیگر مسائل پر بحث کی ہے اسی کے ساتھ قواعد زبان تلفظ اور اِملا کا بھی بطور خاص خیال رکھتے تھے اور اپنے احباب اور شاگردوں کو اس طرف متوجہ کراتے رہتے تھے۔

غالبؔ کے آخری زمانے میں اردو اِملا میں بعض اہم بنیادی تبدیلیاں ہوئی۔ مثلاً معکوسی اورہاکار آوازوں کی علامتوں میں باقاعدگی پیدا کی گئی۔اسی زمانے میں یائے مجہول اور یائے معروف میں باقاعدہ فرق بتایا گیا۔ غالبؔ کی اُردو تحریروں میں پرانے اِملا بھی ملتے ہے اور وہ تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں جو اُس عہد میں ہورہی تھیں۔

غالبؔ نے اپنے بعض شاگردوں کے نام خطوط میں اِملا کے بارے میں ہدایتیں دی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ چاہتے تھے کہ اُن کے شاگرد صحیح اِملا لکھیں۔غالب ؔنے منشی بہادری لال مشتاقؔ کولکھے خط میں اس کا ذکر کیا۔

خط کا اقتباس۔

" برخوردار بہادری لال!

مجھ کو تم سے جو محبت ہے اُس کے دو سبب ہیں: ایک تو یہ کہ تمہارے خال فرخ فال منشی مکند لال میرے بڑے پرانے یار ہیں۔ خوش خو، شگفتہ رو، بذلہ گو، دوسرے تمہاری سعادت مندی اور خوبی اور حلم اور بہ قدر حال علم، اُردو نظم و نثر میں تمہاری طبع کی روانی اور تمہارے قلم کی گل فشا نی، مگر چوں کہ تم کو مشاہدہئ اخبار اطراف اور خود اپنے مبطع کے اخبار کی عبارت کا شغلِ تحریر ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ تقلید اور انشا پروازوں کے تمہاری عبارت میں بھی اِملا کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو جابہ جا آگاہ کرتا رہتا ہوں۔خدا چاہے تو اِملا کی غلطی کا ملکہ زائل ہوجائے۔" ۴۸ے

۷, جون ۱۸۶۸ء میں منشی بہادر لال مشتاقؔ کو لکھے غالبؔ کے خط میں اُردو اِملا کے بارے میں ہداتیں موجود ہے اس پڑھکر یہ تاثر پیدا ہوتی ہے کہ غالبؔ اُردو اِملا پر بہت توجہ دیتے تھے۔ غالبؔ کے اِملا پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہم کو اِملاکے یہ بنیادی اُصول جاننا ضروری ہے کہ اگر ایک لفظ کا اِملا مخصوص طریقے سے رائج ہے اور کوئی شخص اس کے خلاف لکھے تو وہ غلط اِملا ہے۔ مثلا ''گھر'' کو ''گہر'' اور '' نشاط'' کو ''نشات'' لکھا جائے تو یہ غلط اِملا ہے۔

'' مرقع غالبؔ '' میں پرتھوی چندر مرحوم نے غالبؔ کے ایک سو تین ۱۰۳ اصل خطوط کے عکس شائع کیے ہیں اور غالبؔ کے اِملا کا مطالعہ ان تمام عکسوں کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

یائے مجہول اور یائے مصروف

اُردو کے جدید اِملا میں یائے مجہول اور یائے مصروف میں جو فرق موجود ہے وہ اُردو کے قدیم اِملا میں نہیں تھا ۔ قدیم اِملا میں یائے مجہول کی جگہ یائے مصروف اوریائے مصروف کی جگہ یائے مجہول لکھنا عام تھالکھنے والا اس معاملے میں لفظ اِملا کی جگہ جوش خطی کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس سے یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ مصنف بعض الفاظ کا تلفظ کس طرح کرتا تھا اور اس کابھی علم نہیں ہوتا کہ مصنف کسی لفظ کو مذکر یا مونث لکھتا ہے۔

غالبؔ کی تحریر وں میں بھی یاے مجہول اور یاے مصروف میں فرق نہیں ہے جب کہ ٗان کے عہد میں یاے مجہول اور یاے مصروف دونوں میں فرق شروع ہوچکا تھا لیکن کچھ لوگ اس کی پابندی کرتے کچھ نہیں کرتے تھے۔ '' عود ہندی '' اور '' اُردوئے معلی '' کے اڈیشن تقریبا ایک ہی عہد میں شائع ہوئے ہیں ۔ ''عود ہندی'' میں یاے مجہول اور یاے مصروف میں کوئی فرق نہ تھا جب کہ ''اُردوئے معلی '' میں فرق نظر آتا ہے۔

الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان

قدیم اِملا میں الفاظ کو ملا کر لکھنے کارواج عام تھا۔ جب کہ جدید اِ ملا میں الفاظ الگ الگ لکھے جاتے ہے۔ غالبؔ قدم اِملا سے متاثر تھے اور الفاظ کو ملا کر لکھتے تھے۔

غالب کچھ الفاظ ملا کرلکھتے تھے۔

نوابصاب ، بیگمصاحبہ، فصلربیع ،ہنڈویکا،نکروں ،نگیا، جواسمیں ، غزلونکو ، وغیرہ۔

قدیم اِملا میں ''اُن نے'' اور ''اُس سے'' بھی ملا کر ''اُنّے'' اور ''اُسّے'' لکھتے تھے لیکن غالبؔنے ان الفاظ کو الگ الگ لکھا ہے۔

اعراب بالحروف

قدیم اُردو اِملا میں ترکی رسم الخط کے اعراب بالحروف لکھنے کا طریقہ رائج تھا۔ وہ یہ کہ اگر لفظ کے پہلے صوتی رکن میں ضمہ ہے تو اُسے '' واؤ'' سے بدل دیا جاتا ہے۔ غالبؔ کے عہد میں ''واؤ'' کے بجائے فارسی ''پیش'' کا استعمال کرکے ''اوس'' اور ''اون'' لکھا جاتا تھا۔ ''اوس'' اور ''اون'' کو ''اُس'' اور ''اُن'' لکھا جانے لگا تھا لیکن غالبؔ نے اس نئے طریقے کو نہیں اپنایا۔ اُن کے یہاں اعراب بالحروف کی مشکلیں ملتی ہیں۔

اوس، اون، اونھوں ، اوترنا، اوٹھنا،، پو نچھنا ، وغیرہ۔

پیش کا استعمال

غالبؔ '' واؤ مصروف '' ''واؤ مجہول'' ''پیش مصروف'' ''پیش مجہول'' پر اکثر فارسی پیش لگاتے ہیں۔ مثلا تُم ، طُرفہ ، دُو ، سُر، کھُل، توُ ، جُرم، چُکا، رُہو اور جُو وغیرہ۔

ہاکار آوازوں کی لکھاوٹ

اُردو کی ہاکار آوازیں خالص ہند آریائی ہیں اور تعداد میں گیارہ ہیں۔ یہ آوازیں ہیں۔

پھ ، تھ، ٹھ، چھ، کھ، بھ، جھ، دھ ، گھ، اور ڑھ۔ فارسی میں ہاکار آوازیں نہیں ہیں۔غالبؔ کے زمانے ہی میں ان آوازوں کے یائے مخلوط یعنی دو چشمی '' ھ '' ایجاد کی گی۔ غالبؔ کے یہاں دو چشمی کا استعمال بہت کم ہوا ہے ان کے اِ ملا میں ہاکارآوازوں کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ اگر ہائے مخلوط لفظ کے شروع میں آئے تو غالبؔ اس طرح لکھتے ہیں ۔

بہوکا (بھوکا) ، بہاری(بھاری)، کہانا (کھانا)، گہر(گھر)، تہوڑا(تھوڑا)۔ اگر یائے مخلوط لفظ کے درمیان میں ہو تو، رکہی (رکھی)، اکہاڑ (اکھاڑ)، بوڑہا(بوڑھا)، پڑہا(پڑھا)، آنکہیں (آنکھیں)، ہاتی(ہاتھی)۔ آخری لفظ میں ہاکار آواز کو بندشی آواز ''ت'' سے بدل دیا ہے ۔

اگر ہاکار آواز لفظ کے آخر میں آئے تو اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔

اودہ (اودھ)، پڑہ(پڑھ)، باندہ (نادھ)، بڑہ (بڑھ) ، جڑ (جڑھ)۔

کبھی ہائے مخلوط اور اور ہائے مختفی دونوں کا استعمال کیا ہے

مثلاً۔ دیکہہ (دیکھ)، ہاتہہ (ہاتھ)، مجہہ(مجھ)، ساتہہ (ساتھ)، سمجہہ(سمجھا) جگہہ (جگہ)، کہہ(کہ)

بعض لفظوں کا اِملا اس طرح بھی لکھتے ہے کہ لفظ کے آخر میں آنے والی ہائے مخلوط کو سادہ بندشی آوازوں سے بدل کر اس میں ہائے مختفی کا اضافہ کردیا ہے

مثلاً۔ مجہ (مجھ)، تجہ (تجھ)، سمجہ (سمجھ)،

اور لفظ کے آخر میں آنے والی یائے مخلوط کو صرف سادہ بندشی آوازوں سے بدل دیتے ہیں۔

مثلاً أ ہات (ہاتھ)، میرٹ (میرٹھ)، رت(رتھ)

لفظ کے آخر میں الف یاہاے مختفی

فارسی میں ایسے الفاظ کی تعداد زیادہ ہے جن کے آخر میں تلفظ ‘‘الف’’ کا ہے۔ لیکن انھیں ہائے مختفی سے لکھتے ہیں اور ایران میں ہائے مختفی اور الف کے تلفظ میں فرق ہے۔ لیکن ہندوستان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اُردو میں فارسی کے کچھ ایسے الفاظ جن کے آخر میں اصلاً ہائے مختفی یا ہائے مخلوط تھیں۔ ایف سے لکھے جانے لگے اور بعض اُردو الفاظ جنھیں الف سے لکھنا چاہیے تھا اُسے ہائے مختفی سے لکھا جانے لگے۔ اگر ہر اُردو لکھنے والا اس طریقے کو اپنا لیتا تو پھر یہی اِملا رائج ہوجاتا۔ لیکن کچھ لوگ نے الف سے لکھنا شروع کردیا۔ اُردو الفاظ کو فارسی رسم الحظ کے انداز پر ہائے مختفی سے لکھنا شروع کردیا۔

غالبؔ کے یہاں بھی ایسے الفاظ کے اِملا کی مختلف صورتیں موجود ہے۔ غالبؔ اُردو کے بعض الفاظ کو الف ہی سے لکھتے ہیں۔ مثلاً ۔ پتا، مہینا، بھروسا، کمرا، وغیرہ

لیکن بعض اُردو الفاظ کو ہائے مختفی یا ہائے مخلوط سے بھی لکھتے ہیں۔

مثلاً۔ لالہ، یودینہ ، راجہ، کلکتہ، پرچہ، تھانہ، چبوترہ، اور کیوڑہ۔

بعض فارسی الفاظ کو فارسی رسم الخط میں غالبؔ نے ان کے اِملا کے بجائے الف سے لکھا۔

مثلاً۔ چھاپے خانا، خاکا، نقشا، وغیرہ۔

ہائے مختفی یا الف پر ختم ہونے والے الفاظ واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں

اُردو میں ہائے مختفی اور الف پر ختم ہونے والے الفاظ کا تلفظ فارسی اور عربی کے اس طرح کے الفاظ سے مختلف ہے۔ فارسی کے قاعدے سے لفظ کسی زبان کا ہو جب وہ واحد محرف یا جمع کی صورت میں ہوتو لفظ کے آخر میں الف یا ہائے مختفی یائے مجہول سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ‘‘ قصیدہ ’’ واحد کی صورت میں آئے تو یوں لکھا جائے گا، ‘‘ میں نے قصیدہ لکھا’’ لیکن جمع کی صورت میں ‘‘ میں نے قصیدے لکھے ’’ اور اسی طرح واحد محرف حالت میں ‘‘کلکتہ’’ کو ‘‘ کلکتے لکھیں گے۔ مثلاً ‘‘ میں کلکتے گیا’’۔ ’’

غالبؔ کے تحریروں میں ان الفاظ کا اِملا ان طریقوں سے ملتا ہے۔

۱۔واحد محرف کی حالت میں ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ ،

مثلاً۔جمعہ کے دِن

اس رقعہ کو

ابر ِرحمت کے شکریہ میں

۲۔واحد محرف کی حالت میں الف پر ختم ہونے والے الفاظ غالبؔ نے یائے مجہول سے لکھے ہیں

مثلاً۔

کتاب پر دھبے آگئے۔

اب بڑھاپے میں کیا کروں۔

گزارے کو کچھ تو چایئے۔

۳۔جمع قائم کی حالت میں یاے مختفی یا یاے ملفوظ پر ختم ہونے والے الفاظ

مثلاً

میں نے صفحے لکھے۔

میں نے قصیدے بھیجے۔

سوروپے وصول پائے۔

غالبؔ نے اکثر روپیہ اور کم تر روپے لکھا ہے

۴۔جمع قائم کی حالت میں الف پر ختم ہونے والے الفاظ

چار مہینے ہوئے۔

تم نے کئی پتے لکھے۔

چھاپے کتا ب۔

اس تجزیے سے یہ انداز ہوتا کہ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی یا یائے ملفوظ یا الف ہوتاہے۔ ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ جب واجد محرف کی حالت میں ہوں تو غالبؔ عام طورسے ‘‘ ہ ’’ سے لکھتے ہیں۔

نون غنہ اور نون ساکن

غالبؔ کے زمانے تک عام رواج تھاکہ جن الفاظ کے آخر میں ''ن'' آتا ہو۔ چاہے ''نون غنہ '' ہو چاہے ''نوں ساکن'' ہو ، دونوں حالتوں میں '' نون غنہ'' سے لکھتے تھے۔ غالبؔ نے بھی ایسے تمام الفاظ ''نون غنہ'' سے لکھے ہیں مثلاً۔

ہوں،میں،وہاں ،آؤں،نہیں،شادباں، نگراں،کریں، لوگوں، فرمائیں، اٹھایں ، وغیرہ۔

بعض حروف کو ملاکر لکھنے کا رجحان

غالبؔ ایک ہی لفظ کے بعض ایسے حروف کو ملا کر لکھتے تھے جن کو جدید اِملا میں لازمی طورپر الگ الگ لکھا جاتا ہے۔

مثلاً۔

موجود کو ''و'' اور '' د '' ملاکر

ذیادہ کو '' ا '' اور '' د '' اور ''ہ '' ملاکر

ذ اور ز

غالبؔ کا خیال تھا کہ فارسی میں ''ذ'' نہیں ہے۔ اس لیے وہ تمام فارسی الفاظ کو ''ز '' سے لکھتے تھے۔

غالبؔ نے صاحب عالم مارہروی کو لکھے اس خط میں انھوں کے ''ر'' اور '' ذ '' سے بحث کی ہے اور ''ز '' کے مشقات مثلاً گزاشتن، گز شتن ، پزیرفتن وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔غالبؔ کے نزدیک فارسی حروف تہجی میں '' ذ '' شامل نہیں ہے اور وہ خاص طورپر فارسی الاصل نقطوں میں '' ذ '' لکھنے کو غلط سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کاغذ کو کاغذ اور ''آوز'' کو ''ازا '' لکھتے تھے۔ خط کا اقتباس۔

دال“ نقظ دار کا ذکر نہیں کرتے۔ اِلاّ کوئی لغت فارسی ایسا بتائیے کہ جس میں” ”ذال“ آئی ہو۔ ”گزاشتن“ و ”پزیرفتن“ سب ”زے“ سے ہے۔ کاغد ”دال'' مہملہ سے ہے، اس کا ”ذال“ لکھنا اور کاغذ کو اُس کی جمع قرار دینا تعریب ہے نہ تحقیق۔ ”آدر“ اسم آتش بہ دال ابجد ہے نہ بہ زالِ ثخذ کوئی لفظ متحدالمخر ج فارسی میں نہیں،بلکہ قریب المخرج بھی نہیں ”تے“ ہے ”طوے“ نہیں سین ہے۔۴۹ے

پانو ، پاؤں

تلفظ کے اعتبار سے ''پا ؤں'' اور ''گاؤں'' کی صحیح اِملا ''پانو'' اور ''گانو'' ہے۔ غالبؔ ''پانو'' اور ''گانو'' لکھا کرتے تھے۔ جب قاضی عبدالجمیل جنونؔ بریلوی نے '' پاؤں '' لکھ دیا تو غالبؔ نے انھیں خط لکھ کر تبنیہ لگایا اور لکھ کے پاؤں کا یہ

اِملا غلط ہیں پانو، گانو، چھانو درست ہے۔جدید اِملا الفاظ کی املا پاؤں ، گاؤں اور چھاؤں ہی عام ہے۔

معکوسی آوازیں

فارسی میں معکو سی آوازیں نہیں ہیں اس لیے فارسی رسم الحظ میں ان آوازوں کو تحریری روپ دینے میں خاصی پریشانی ہوتی۔ قدیم اُردو اِملا میں تمام معکوسی آوازوں ہے قریب ا لمخر ج آوازوں کے مصمتے پر تین نقطے بنادیا کرتے تھے ۔

مثلاً

ث	ٹ	تھ	ٹھ
ذ	ڈ	رتھ	رٹھ
ژ	ڑ	ذھ	ڈھ

ایسے الفاظ جن کا املا غالبؔ نے دو طرح سے لکھا

روانہ	اور	روانا
زمانہ	اور	زمانا
تکیہ	اور	تکیا
مولانا	اور	مولنٰا

یہ اور یہہ

ایک لفظ ایسا بھی ہے جس کا اِملا غالبؔ نے تین طرح سے لکھا ہے ۔وہ لفظ ہے ‘‘ہاتھ’’ غالبؔ نے ‘‘ہات ’’ ، ہاتہہ اور ‘‘ ہاتھ ’’ تین طرح لکھا ہے۔

بعض الفاظ کا ا ملا اور اُن کا تلفظ

غالبؔ کی تحریروں میں یہ الفاظ اور خاص طورسے لفظ ‘‘بوڑھا’’ کثرت سے آیا ہے۔غالب ؔنے عام طورپر ان دونوں الفاظ کا املا ‘‘ بوڑھا ’’ اور ‘‘ گاڑی’’ کی گئی ہے لیکن کھبی کھبی ‘‘ بوڑھا ’’ اور ‘‘ گاڑی’’ بھی ملتے ہیں۔

تڑپنا، تڑپھنا

قدیم اُردو میں اس لفظ کا تلفظ ‘‘تڑپھن’’ ہے۔ غالبؔ بھی اسی تلفظ کو ترجیجی دیتے تھے۔

سید احمد خان نے بھی اپنے کتاب اِملا ے غالبؔ کے مذکورہ بیان کو پیش کیا ہے۔

بقول غالبؔ کے پیش نظر ‘‘تڑپنا ’’ اور ‘‘تڑپتی’’ صحیح اِملا نہیں۔‘‘ تڑپھنا’’ اور ‘‘تڑپھتی’’ ہونا چایئے۔ مرزاصاحب کی نظم و نثر میں اس مصدر کے سبھی مشتقات کو مع یاے مخلوط لکھا جاناچائیے۔ تڑپھنا، تڑپھتا ، تڑپھا ، تڑپھتی ہے تڑپھے گا وغیرہ۔

ڈھونڈنا

قدیم اُردو میں اس لفظ کا تلفظ ‘‘ڈھونڈھتا’’ ہے اور غالب کی تحریروں میں اس لفظ کیااملا ‘‘ڈھونڈھنا’’ ملتا ہے ممکن ہے وہ اس لفظ کا تلفظ اسی طرح کرتے ہوں۔

سونچ

غالبؔ نے ہر جگہ سونچ لکھا ہے۔ اگر کہیں سوچ لکھا ہے۔

دوسرے اُن الفاظ کی املا جو میرے خیال سے سہو قلم ہیں۔

پانچ ساتھ	۔	پانچ سات
خورم	۔	خرم
باالکل	۔	بالکل
باالفضل	۔	با لفضل
با اللہ	۔	باللہ

طیار ، تیار

غالبؔنے غلام حسین قدربلگرامیؔ کے نام تحریر کیا خط میں لفظ ‘‘طیار’’ ‘‘تیار’’ کے متعلق باتیں تحریر کی ہیں کہ لفظ ‘‘طیار’’ فارسی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کے اُردو میں خود انھوں نے ‘‘تیار ’’ اور ‘‘تیاری’’ تحریر کیا ہے۔ اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ لفظ ‘‘تیار’’ فارسی میں کبھی جائز نہ ہوگا۔

جبہ

غالبؔ نے منشی ہر گوپال تفتہؔ کے نام تحریر کیا ہے اس میں انھوں نے تفتہ ؔکے کلام پر اصلاح دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ '' جبہ'' میں دو بائے ہورہیں '' جبہ'' غلط ہے اس کا صحیح اِملا ''جبہ '' ہے اور یہ بروزن چشمہ ہے۔

خوشید ، خورشید

غالبؔ نے امیر مہدی مجروحؔ کے نام ایک طویل خط تحریر کیا ہے اس خط میں غالبؔ نے لفظ ''خو شید'' اور '' خورشید'' پر جو لفوی تحقیق کی ہیں اس سے یہ بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ غالبؔ ''خورشید '' کو غلط نہیں مانتے تھے لیکن ''خور شید '' یعنی بغیر ''واو'' کے لکھتے تھے۔
رشید حسین خان نے اپنی کتاب '' اِملاے غالب'' میں مذکورہ بیان کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

مرزا صاحب نے ''خورشید'' کو غلط نہیں کیا البتہ وضاحت کے ساتھ اپنا لفظ نظر پیش کردیا ہے اور تاکیدی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ میں ''خور'' اور ''خرشید'' لکھتا ہوں اس بناء پر مرزا صاحب کی اُردو ، فارسی نظم و نثر میں لازمی اپنی کی مطالقت اختیار کی جائے یعنی خور خرشید لکھیں گے۔ ان لفظوں کے سلسلے میں مرزا صاحب کی رائے سے اختلاف کیا گیا ہے ان کے باوجود مرزا صاحب کے کلام میں ان کی وضاحت کے مطابق ان لفظوں کو لکھا جائے گا۔نسخہ عرشیؔ میں اس کی پابندی کی گئی ہے۔

دوم ، دویم

غالبؔ نے منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام تحریر کیا خط میں اس لفظ ''دوم '' ، ''دویم'' کے متعلق بحث کی ہے اور صحیح لفظ ''دوم '' اور ''دومی '' ہے ''دویم '' نہیں لکھنا چایئے۔ اس بات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'' دویم '' بروزن جو ''یم '' غلط ''دوم'' ہے بغیر تحتانی بالفرمن تحتانی بھی لکھیں تو ''دیم '' پڑھیں گے۔ اگرچہ لکھیں گے ''دویم'' ''واو'' کا اعلان عکساں باہر ہے یاں دومی درست ہے مگر نہ بہ خذف تحتانی مثل '' ذمی'' نہ بہ خدف بلکہ یہ طریق قلب بعض ''دویم '' کا دومی ہوگیا۔''

غالب کے نثر کی اہم خصوصیات

غالبؔ کے نثر یعنی ان کے خطوط کی اہم خصوصیات اس کی جدّت پسندی ، القاب و آداب تحریر کا اندزا بیان تاریخ

کی تحریر سلام و دعا، بات چیت کا انداز اور ڈرامانیت و افسانویت مرقع کشی رنگینی و حسن بیان سادگی اپنے عہد ے کی مکمل تصویر ان کو اپنے عہد میں ایک اعلیٰ درجہ و مقام عطا کرتی ہے۔ کسی بھی خطوط کی خصوصیات ہی ان خطوط کی اہمیت کے حامل ہوتی ہے۔اس خطوط کی بدولت غالبؔ کے زندگی کے حالات اور واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ ہم کو ان کی زندگی کے عہدے کے قریب لے جاتا ہے بلکہ وہ سارا زمانہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

القاب و آداب :

غالبؔ نے القاب و آداب کونیا طرز تحریرعطا کیا۔اس زمانے میں دستور کہ مکتوب الیہ کی خوشنوری کے لیے لمبے لمبے القاب لکھے جاتے تھے اور ان القاب کو نثری مدح کے انداز میں تحریر کیا جاتاتھا لیکن غالبؔ نے جو طریقہ ایجاد کیا اس کا ذکرایک فارسی عبارت میں اس طرح کرتے ہیں اس کا ترجمہ پیش نظرہیں۔

میرا طرز نگارش یہ ہے کہ جب کاغذ و قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس کی" حیثیت کے مطابق کسی لفظ سے پکارتا ہوں اور کام کی بات لکھ دیتا ہوں القاب و آداب خریت ومزاج پرسی غیر ضروری باتیں ہیں انھیں نظر انداز کردیتا ہوں۔"

کہنا یہ ہے کہ غالب نے لمبے لمبے القاب ترک کرکے مختصر القاب لکھنے کی بنیاد ڈالی مثلاً حضرت پیرو مرشید ، بھائی، میاں، برخوردار، صاحب ، میری جان ، مہاراج ، جان برادر ، جان غالب، قبلہ و کعبہ ، بندہ پرور، سید صاحب، یوسف مرزا جی، مرزا تفتہ ، میاں مرزا تفتہ، بی مولانا علائی ،بعض خطوں میں لمبے لمبے القاب بھی نظر آتے ہیں جیسے۔کا شانہ دل دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہر کوپال تفتہؔ برادر صاحب ،جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت بعد سلام مسنون و دعالے لقا بے دولت روز افزوں ،حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت بعد نوردیدہ و سروردل و راحت جان اقبال نشان حیکم غلام رضاخان کو غالب نیم جان کی دُعا،میرے مہربان میری جان میرزا تفتہ سخن دان،بعض جگہ لمبے القاب بھی استعمال کرتے ہیں اور قافیے کا خیال بھی رکھتے ہیں۔

ان کی خطوط میں رنگ بر نگے القاب وآداب بھی نظر آئے۔ کبھی مکتوب الیہ کو مخاطب کہے بغیر وہ مدعا کی طرف آتے ہیں اور جیسے تمہید سے کام کی بات کہہ دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ غالب نے القاب و آداب کے قدیم طرز کو بلائے طاق رکھکر بالکل نئے طرز نگارش کو اپنایا ہے۔

غالب کے مکتوب کا آغاز اور خاتمہ دونوں جدید طرز کے ہیں خطو ط کے آغاز کی بات ہوچکی اور خاتمہ یعنی آخر میں انھوں نے جدّت سے کام لیا۔ خط کہ آخر میں اپنا نام لکھنے کے پرانے رواج کو ختم کر کے صرف اپنا نام لکھا ہے یعنی کہیں صرف اسد تو کہیں اسداللہ یا اسد اللہ خان کچھ خطوں میں اپنے نام کا قافیہ بھی لکھا ہے جیسے۔

شفقت کا طالب غالب، جواب کا طالب غالب،اس خط کی رسید کا طالب غالب،عافیت کا طالب غالب، نجات کا طالب غالب،رحم و کرم کا طالب غالب،مرگ ناگہاں کا طالب غالب،خوشنودی مزاج کا طالب غالب، ترجم کا مستحق اور تفقد کا طالب غالب،تمہاری سلا متیں کا طالب غالب،عنایت کا طالب غالب، التفاف کا غالب غالب، ترقی و دولت کا طالب غالب،آپ کی سلامت ذات اور اپنی نجات کا طالب غالب،
فیض کا طالب غالب، آرام کا طالب غالب،خیر کا طالب غالب،انصاف کا طالب غالب،عضو کا طالب غالب،دوام دولت کاطالب غالب، داد کا طالب غالب،راقم اسد، غالب علی شاہ غالب، بے نوا اسد یک رنگ ، اسد اللہ ، دُعا گوہ غالب۔ مولانا علائی کَے نام خط میں لکھتے ہے کہ کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔ یہ وجہہ ہے کہ غالبؔ کے القاب و آدب سے ان کے مکتوبا ت کی الگ پہچان ہے۔

خط کی تاریخ تحریر:

غالب اپنے مکتوبات میں تاریخ و دن تحریر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہجری کے ساتھ عیو ی سن بھی لکھ دیتے ہیں لیکن کچھ ایسے خطوط بھی ہیں جن پر غالبؔ نے تاریخ بھی نہیں لکھی۔ غالبؔ کی تاریخ و دن و سنہ، ہجری لکھنے کا کچھ نئے انداز تھا زمانہ قدیم سے ابھی تک تاریخ لکھنے کا جو طریقہ چلا آرہا ہے وہ تاریخ تحریر یا خط کے آغاز شروع میں لکھتے ہیں یا پھر خط کے آخر میں خاتمے ۔ لیکن غالبؔ نے اس روایت سے پرائے تاریخ خط کے شروع میں کبھی آخر میں اور کبھی درمیان میں لکھا ہے ۔مثلا کے طورپر۔

شنبہ دوم جون ۱۸۶۶ء

معروضہ ۱۳ ماہ اگست ۱۸۶۸ء

۱۴ رجب المرجب ۱۲۸۱ مطابق ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴

۲۷ دسمبر ۱۷۶۷ ء روز شنبہ یکم ماہ رمضان ۱۲۸۴ ھ

اکثر خط میں تاریخ دن کے ساتھ ساتھ وقت بھی تحریر ہے۔

آج دو شنبہ ۶ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے اس وقت کہ بارہ پر تین بجے عطو فت نامہ پہنچا اور پھر جواب لکھا۔

شنبہ صبح روز عیدذی الجہ ۱۲۸۱ ؁ء نبوی

رواں واشتہ چار شنبہ ۱۴ مارچ ؁۱۸۶۰ء وقت دوپہر بد ھ کا دن تیسری تاریخ فروری کی ڈیرھ پہر دن باقی رہے ۔

خط ملا خطہ فرمایا۔

میاں! تمہارا خط رام پور سے دلی آیا۔ میں تئیں شعبان کو رامپور سے چلا اور تیس" شعبان کو دلی پہنچا۔ اُسی دن چاند ہوا۔ یکشبنہ رمضان کی پہلی۔آج دو شنبہ نو رمضان کی پہلی آج دو شنبہ نو رمضان کی ہے سو نواں دن مجھے یہاں آئے ہوئے ہے۔ ۵۰ـہ

خط میں سلام و دْعا:

ابتدائے خط میں دعْا و سلام لکھنے کی روایت بہت قدیم ہے لیکن غالب سلام و دْعا کہں۔ خط کے شروع ہیں لکھتے ہیں کہیں درمیان میں تو کہیں آخر میں اس کے لکھنے کا جدید انداز جس سے پڑھنے والے کو لطف و سرور حاصل ہوتا۔اس بات پتہ ہمیں غالب کے لکھے خط سے چلتا ہے جو انھوں نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا ہیں وہ خط پیش نظر ہیں۔

میر سر فراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا میر نصیر الدین کو دعا" اور شفیع احمد کو اسلام کہنا میرن صاحب کو نہ سلام نہ دْعا بس یہ خط پڑھا دو۔"

قدیم تحریر انداز کو ترک کر غالب خطوط لکھنے کے جدید طرز کو اپنایا ۔ سلام و دعا خط کے درمیان میں لکھا کہ جدید طرز تحریر دلچسپ انداز میں بخش یا کہ پڑھنے والے بیزار نہ ہو اور لطف ، مسرت کے ساتھ ان کی خطوط کو پڑھتے رہے۔

میر سر فراز حسین کے نام لکھے گئے اس بات کا انداز ہوتا ہے۔ خط کا اقتباس۔

میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے مجھ کو دعا بھی نہ لکھی، بھائی میری دعا" پہنچے۔ میر نصیرالدین ایک دن میرے ہاں آئے تھے اب میں نہیں جانتا یہاں ہیں یا وہاں۔ وہاں ہوں تو دْعا کنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتناکچھ پیام ہے دعا اسلام کی

حاجت کیا؟ دیکھوہم اپنا نام نہیں لکھتے۔ بھلا دیکھیں تو سہی تم جانتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے۔" ۵۱ے

میرمہدی مجروحؔ کو لکھے خط میں غالبؔ دعا اور سلام کے بارے میں لکھتے ہیں۔ خط کا اقتباس۔

ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجہتد العصر کے مسودے کا اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب" اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو مسودے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤگے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں کہ یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسود بعد اصلاح بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دُعا کہنا اور ہاں حکیم میراشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہئ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح سے خط بھیجتے رہو۔" ۵۲ے

اپنے دوست کو خط میں بڑے خوب انداز میں دُعا و سلام لکھتے ہیں۔ ایک خط جو میر مہدی کولکھا ہیں ہے ۔

خط کا اقتباس ۔

مجتہد العصر میر سر فراز حسین صاحب کو دعا۔ آہا ہا ہا میرا فضل علی صاحب کہاں" ہیں۔ حضرت!یہاں تو اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں؟ ہاں بھائی میرن صاحب بھلا اُن کو ہماری دعا کہنا۔" ۵۳ ے

ڈرامائی اور افسانوی انداز:

غالبؔ کے خطوط میں ڈرامائی انداز بھی نظر آتا ہے۔ کچھ خطوط تو مکمل ڈراما ہیں۔ غالب ؔکا یہ دعویٰ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا بالکل صحیح ہے ۔ غالبؔ نے خطوط تو میں ایسے انداز میں مکالمہ لکھے جو ایک ڈرامائی طرز کی واضع کرتے ہیں۔ مکتوب الیہ سے اسطرح مخاطب ہوتے ہیں جیسے اُسے آواز دے کر بلارہے ہیں مثال کے طورپر۔

ارے کوئی ہے، ذرا یوسف مرزا کو بلا ئیو۔ لو صاحب وہ آئے۔

اے جناب مہرن صاحب ! اسلام علیکم۔

نواب علاء الدین علائی ؔکے نام لکھے خط میں ڈرامائی انداز ملتا ہے۔

خط کا اقتباس۔

پیرجی سے جب پوچھتا ہوں تم خوب شخص ہو اوروہ کہتے ہیں "کیا کہنا ہے؟"اور میں" پوچھتا ہوں،کس کا؟تو وہ فرماتے ہیں، مرزا شمشاد علی بیگ کا۔ "ایں" اور کس کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھوں یوسف علی خان بیٹھے ہیں،ہیراسنگھ موجود ہے، وہ صاحب میں کیا خوشامدی ہوں جو منھ دیکھی کہوں۔ ۵۴ـہ

نواب علاء الدین علائی کے نام لکھے کا خط اندازِ بیان اور مکالمے ڈرامائی کیفیت کو ظاہر کرتاہے۔یہی وجہہ ہے کے ان کے خطوط کو مکتوب الیہ بے حد خوشی سے پڑھ لیا کرتے ہے۔غالبؔ کے خطوط میں مکمل ڈراما نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا کہ ہمارے آنکھوں کے سامنے ڈراما پیش ہورہا ہو۔

مثال کے طورپر ایک خط جو میرن صاحب کو لکھا ہے اس میں مکمل ڈراما نظر آتا ہے۔

خط کا اقتباس۔

" اے جناب میرن صاحب، اسلام علیکم۔

حضرت! آداب۔

کہوں صاحب اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی"۔ حضورکیا منع کرتا ہوں؟ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہوگئے ہیں۔بخار جاتارہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے، وہ بھی رفع ہوجائے گی۔میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دُعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔

نہیں،میرن صاحب اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوتا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔

حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیاہوں گے۔

"بھائی! آخر کوئی وجہہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟" ۵۵ـہ

غالبؔ کے بعض خطوں ایسے بھی ہے جس میں افسانوی انداز پایا جاتے ہے۔ اس کے مثالیں کم ہیں مگر بہت دلکش ہیں کئی جگہ خط میں اسطرح تحریر ہے کہ جیسے افسانہ ہی کہا جارہاہے اور کئی جگہ و اقعات بالکل اس طرح سنائے ہیں جیسے کوئی کہانی سنارہے ہوں۔ ایک خط میں اپنی زندگی کی پوری کہانی بیان کی

ہے اس کہانی میں شروع سے آخر تک اشعارہ و علامت کا استعمال کیا گیا ہے۔یہ خط علاء الدین علائیؔ کو لکھا ہے۔

خط کا اقتباس۔

ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزاپاتے ہیں لیکن یوں" بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیامیں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۲۱۲۱ء میں رویکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔۳۱ برس حوالات میں رہا۔ ۷ / رجب ۵۲۲۱ء کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ایک بیڑی میرے پانو ئں میں ڈال دی اور دلیؔ شہرکو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔فکر نظم و نثر کو مشقّت ٹھرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑلائے اور پھراسی مجلس میں بٹھا دیا جب دیکھاکہ یہ قیدی گریز یا ہے۔ دوہتھکڑیاں اور بڑھادیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار،ہاتھ ہتھکڑیون سے زخم دار مشقّت مقرری اور مشکل ہوگئی۔قلم زائل ہوگئی بے حیاہوں۔سال گزشتہ بیڑی کو زوایہۂ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔۵۶ؔ

غالبؔ کے خطوط میں سادگی رنگینی، مرقع کشی ، قافیہ آرائی موجود ہیں ۔ان کے مکتوبات اپنے آپ میں لاجواب ہیں جو انکی زندگی کے تمام گوشوں کواُجاگر کرتے ہیں اور ساتھ ہی غالبؔ کی سوانحی عناصر بھی عیاں کرتے ہیں۔ غالب کی خطوط کی طرز تحریر اعلی رہتی ہیں اور وہ اپنے تمام تر صلا حتوں کو بہت بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط ایک نثر ی تحریر کونیا روپ دیتے ہیں مکتوب الیہ کو خطوط پڑھنے میں لطف اور دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں کہیں سادہ سہل اسلوب اختیارکیا تو کہیں رنگینی و رعنائی سے بیان میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ غالب خطوط میں استعارہ و تشبیہ کا استعمال کرتے ہیں ،کسی خط میں مختفی عبارت استعمال کرتے ہے تو کہیں خالص علمی نثر اور کہیں استدالائی انداز اپناتے نظر آتے ہیں۔کہیں افسانے کا رنگ ہے تو کہیں ڈرامے کا انداز ۔ غرض ان خطوط میں زندگی کا ہر رنگ نظرا ٓتا ہے۔

سادگی اور رنگینی:

غالبؔ کے خطوط کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غالبؔ خطوط میں سادگی پر خاص توجہ دیا کرتے تھے۔ کوئی بھی نثر میں حسن اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے اُس تحریر نثر میں سادگی اور رنگینی کی ضرورت ہوتی ہیں۔سادگی کا اپنا ایک حسن غالبؔ کے خطوط میں پایا جاتا ہے۔کبھی کبھی سادگی اسی پرْ کشش ہوتی

ہے کہ ہزار بناؤ سنگھار بھی اس کے آگے پھیکے پڑے جائے۔ غالب کے طرز تحریر کا انداز ہی نیرالا ہے جب وہ قلم اُٹھاتے ہیں اور خط لکھنا شروع کردیتے ہیں تونہ انھیں موضوع کی ضرورت ہوتی ہے نہ لفظ اور زبان کی۔ غالب اسی نثر تحریر کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ پڑھ تو خوش ہوجائے۔ مکتوب الیہ کو جب دُعا دیتے ہے تو لکھتے ہیں۔ '' تمنّا یہ اور انشاء اللہ تعالی ایسا ہی ہوگا۔ تم جیتے رہو اور تم دونوں کے سامنے میں مرجاؤں۔'' دُعا بے اختیار دل سے نکلتی ہےیہ غالبؔ کی کمال کا انداز تحریر ان کو نثر تحریر کو دنیا میں ایک الگ پہچان د لواتاہے۔

ایک خط یوسف مرزا کے نام لکھا ہےخط کا اقتباس۔

خزانے سے روپیہ آگیا ہے میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں، بات رہ گئی۔" حاسدوں کو موت آگئیدوست شاد ہوگئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔" ۵۷ ؎

غالب کے خطوط اس انداز سے لکھے ہیں کہ پڑھنے والوں کو مسرت بخشی ہے۔ خطوط میں غالب اپنی بات کی واضح طورپر بیان کرنے کے ساتھ بے باک اندازبیان اختیار کرتے ہیں۔سادگی کے ساتھ انداز شگفتہ اور تھوڑی سی ظرافت بھی عیاں ہوتی ہے جس سے پڑھنے والے کا ذہن لُطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک خط جو غالبؔنے علاء الدین علائی کو لکھا ۔ جب علاء الدین نے غالبؔ سے اپنے بیٹے کے تاریخی نام کی فرمائش کی غالب نے فرمایا۔

خط کا اقتباس۔

مولانا نسیمیؔ کیوں خفا ہوتے ہو۔ ہمشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں اگر" خلیفہ ثانی ہو۔ اُس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے، جانشیں دونوں مگر ایک اول ہے او رایک ثانی ہے۔ شیر اپنے بچوں کو شکار کو گوشت کھلاتا ہے طریق صید افتنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہوجاتے ہیں۔ آپ شکار کر کھاتے ہیں تم سخنور ہو گئے حسن طبع خدادادرکھتے ہے۔ ولادت فرزندگی تاریخ کیوں نہ کہواِسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کی مجھ پیر غم زدہ، دل مردہ کو تکلیف دہ؟ علاء الدین خان تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا ن جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرنے پہنچا نہ صاحب دوہائی خداکی میں نہ تاریخ دلادت

کہوں گانہ نام تاریخ ولادت کہوں گا رنہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمرو دولت و اقبال عطاکرے۔ ۵۸ء

اس خط میں غالبؔ علاء الدین علائیؔ کو اپنے بیٹا کا تاریخی نام رکھنے سے منع کررہے۔ اور کہا کہ میں نے اپنے بیٹے کاتاریخی نام نظم کردیا تھا۔ وہ مرگیامیری نحوست نہیں تو اور کیا ہے یہ کہہ کرتا تاریخی نام نکالتے کو منع کردیا۔ یہ بہانہ ہوامگر دلیل ایسی ہے نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔

غالب شاعر ہیں اور نثر نگار بھی ہے اس لیے نثر میں بھی مناسب جگہ وہ شاعری کا استعمال بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں بیکر تراشی سے اور قافیہ آرائی سے اور استعارہ تشبیہ سے کام لتے ہیں۔بعض جگہ شعر کے ذریعہ اپنی بات کو بیان کردیتے ہیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جارہی ہے ۔ جس میں ا شعار کا استعمال کیا گیا ہے۔ میاں داد سیاح کے نام ایک خط میں غالب ؔنے اشعارائی انداز میں اپنے فیضی کے حالت اور بیماری کا ذکر کیا ہے۔

خط کا اقتباس۔

ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکماکردیا ہے، ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر نا پڑ سیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر باز پرْس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہادیہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہاے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔" ۵۹ء

'اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔"
"عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مرگئے پر دیکھتے دکھلائیں کیا"

۱۔ ہندوستانی لسانیات محی الدین قادری ص ۱۲
۲۔ عام لسانیات پروفیسر گیان چند جین ص۱۲
۳۔ تنقیدی اصلاحات ابوالا عجاز حفظ صدیقی ص ۶۵۱
۴۔ لِسانی مُطالعے ڈاکٹرگیان چند ص ۲۳
۵۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص۲۳۳
۶۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص۲۳۴
۷۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص۲۹۸
۸۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص۳۳۵
۹۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۲۲۹،۳۳۰
۱۰۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۲۴۸
۱۱۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۳۰
۱۲۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۵۰ ، ۳۵۱
۱۳۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۵۲
۱۴۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹر خلیق انجم ص ۳۵۲
۱۵۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۵۳
۱۶۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص۳۵۷، ۳۵۸

۱۷۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۵۱

۱۸۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۵۸

۱۹۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۸۶

۲۰۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۸۶

۲۱۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۴۰۶

۲۲۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۵۲

۲۳۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۴۹۶

۲۴۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۹۱

۲۵۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۶۰۱

۲۶۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۶۱۶

۲۷۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۵۴

۲۸۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۳۶

۲۹۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۲۴۷

۳۰۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۳۹

۳۱۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۷۹۴

۳۲۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۳۸

۳۳۔ غالب کے خطوط (جلدسوم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۱۰۲۹

۳۴۔ غالب کے خطوط (جلدچہارم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۱۴۱۶

۳۵۔ غالب کے خطوط (جلدچہارم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۱۴۲۹

۳۶۔ غالب کے خطوط (جلدچہارم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۱۵۰۲

۳۷۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص۵۳۸، ۵۳۹

۳۸۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۴۲،۵۴۳

۳۹۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹر خلیق انجم ص ۵۵۳

۴۰۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۷۲۷

۴۱۔ غالب کے خطوط (جلدچہارم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۱۴۳۱

۴۲۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۶۰۱

۴۳۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۰۲، ۸۰۳

۴۴۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۲۹،۸۲۸

۴۵۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۲۴

۴۶۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۸۴۴

۴۷۔ غالب کے خطوط (جلدچہارم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۱۴۳۴

۴۸۔ غالب کے خطوط (جلدسوم) ڈاکٹرخلیق انجم ص۱۰۳۸

۴۹۔ غالب کے خطوط (جلدسوم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۱۰۱۸

۵۰۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۷۸۰

۵۱۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۷۶۳

۵۲۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۳۲

۵۳۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۳۷

۵۴۔ غالب کے خطوط (جلداول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۴۰۰، ۴۰۱

۵۵۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۲۵، ۵۲۶

۵۶۔ اُردوئے معلی اسد اللہ خان غالبؔ ص ۳۸۴، ۳۸۵

۵۷۔ اُردوئے معلی اسد اللہ خان غالبؔ ص ۱۷۵

۵۸۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۳۶۸

۵۹۔ غالب کے خطوط (جلددوّم) ڈاکٹرخلیق انجم ص ۵۵۱

باب پنجم

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

ادب کی دیگر اہم اصناف میں سوانح عمری کا شمار ہوتا ہے۔ اس صنف میں متعلقہ افرادشخصیت کے خاندانی پس منظر اور پیدائش سے لے کر تعلیم وتربیت، ملازمت، تدریس و تصنیف، ادبی ، سماجی، سیاسی اور تہذیبی سرگرمیوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔اس صنف میں صاحب سوانح کے تمام احساسات ، جذبات اور نظریات سے واقفیت ہوتی ہے۔ ان کے عہد کے ماحول میں تہذیبی ، ثقافتی، ادبی ، سماجی، لسانی، سیاسی اور قومی وبین الاقوامی حالات کی آگاہی ہوتی ہے۔ یہی وجہہ ہے کہ مختلف فنکاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اس فن کو جلا بخشی۔ اس فن کی روایت کو بلندی و وقار اور ارتقاء کے مرحلے طے کروائے۔

سوانح نگاری کے آغاز کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوانح نگاری کاآغاز یہودیوں سے ہوتا ہے ۔اُس زمانے میں انبیاء اور صلحاء کے اخلاق و اعمال کو قلم بند کیا گیا ۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے اقوال کو آنے والے زمانوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنا یا۔ یونانیوں نے بھی یہودیوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے بہاڈروں کے واقعات کو قلم بند کیا۔عیسائیوں نے بھی اپنے مذہبی لٹریچرمیں ان کے بزرگوں ،مذہبی رہنماؤں اور شہیدوں کے حالات تفصّیل سے لکھے ہیں۔یہ ابتدائی نمونہ مذہبی سوانح عمریاں دیومالاؤں اور آسمانی کتابوں سے متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ان کتابوں میں فلسفہ اخلاق، قوموں اور افراد کے حالات بھی بیان کئے جاتے تھے۔اس طرح رفتہ رفتہ انسانی حالات اور کارناموں کو محفوظ رکھنے کے لیے انھیں تحریر کیا جانے لگا۔انسان کی یہ فطری خواہش ارتقائی مرحلے طے کرتی ہوئی ایک فن کی شکل اختیار کرتی گئی۔ادب میں سوانح نگاری کی ارتقائی منزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے ابتدائی دور میں تاریخ کی ایک شاخ تصور کیا گیا ہے ۔مغرب میں ایک زمانے تک تاریخ و سوانح میں فرق نہیں کیا جاتا تھا لیکن سترہویں صدی کے نصف آخر میں سوانح عمری کو ادب کی ایک صنف مانا گیا ہے۔

سوانح نگاری کی تعریف:

سوانح یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو سانحہ کی جمع ہے۔ اس لغوی معنی حادثہ اور صدمہ پہنچا نے والا واقعہ ہے۔ادبی اصطلاحی میں سوانح کسی شخص کی زندگی کے حالات و واقعات کو کہتے ہیں،اور سوانح نگاری ان واقعا ت کو لکھنے کا عمل ہے۔ کسی شخص کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام داخلی، خارجی، حالات، واقعات، حادثات، احساسات، جذبات، تجربات، مشاہدات، خدمات اور کارناموں کو دیانتداری سے تاریخی و حقیقت کے آئینہ میں قلم بند کرکے منظر عام پر لانے کا نام سوانح عمری ہے۔

ڈرائیڈن وہ پہلا شخص تھا جس نے ۱۶۸۳ء میں پہلی بار سوانح عمری کی تعریف بیان کی۔

"The History of particular men's lives." ۱ے

یہ مخصوص افراد کی زندگیوں کی تاریخ ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں سوانح عمری کی تعریف اس طرح ہے۔

The History of of lives of individual men as a branch of "literature"

سوانح عمری ادبی صنف کی حیثیت سے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے۔ ے۲

انسائیکلوپیڈیا میں سوانح کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"The new biography in consequence was after the record of inner life, the relation of previously unasuspected aspect of charactre."

اس تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سوانح عمری کسی فرد کی پیدائش س لے کر موت تک کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی کوائف کے بیان پر مشتمل ہوتی ہے۔ ے۳

''اُردو کی مقبول عام لغت، فروز اللغات میں اس کی یہ تعریف ملتی ہے۔

کسی شخص کی زندگی کے حالات کا تذکرہ ہے۔ ے۴

فرنگ آصیفہ میں سوانح عمری کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے۔

"سرگزشت یا کسی شخص کی زندگی کا حال یا تذکرہ،کسی عالم خواہ فاضل خواہ بڑے بڑے کام کرنے یا بہادر یا حاکم وہ واقعات جو اس کی عمرمیں گزرے ہوں۔" ۵ے

ڈاکٹر عبدالواسع کے مطابق سوانح نگاری،

''سوانح نگاری کسی فرد یا شخص کے اعمال و افکار ، تجربات و مشاہدات کے سچے اور ادبی اظہارکا نام ہے۔ '' ے۶

سوانح نگاری کی مختلف تعریفات کے مطابق ہم یہ کہے سکتے ہیں کہ سوانح عمری سے ہمیں کسی شخص کی داستان حیات، واقعات حیات، معمولات حیات، مشغو لیات حیات، مثبت و منفی خیالات اور داخلی و خارجی افکارو کردار کا علم ہوتا ہے۔

سوانح عمری کسی فرد کی پیدائش سے لے کر موت تک کے خارجی حالات کو بیان کرتی ہے ۔ اس میں کسی فرد کے جذبات و احساسات کا مکمل بیان ہوتا ہے ۔ بیانات کے تجزیہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جہاں یہ تاریخ کی طرح کسی فرد کے حالات زندگی بتاتی ہے وہاں اس کے زندگی کی نقاب کشائی بھی کرتی ہے۔ ایک سوانح نگار کو صرف مواد کے سہارے اس طرح چلنا پڑتا ہے کہ شخصیت کے قدوقال پوری آب و تاب کے ساتھ واضح ہوجائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ سچائی اور دیانت داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

سوانح نگاری کا فن اور روایت:

سوانح نگاری کا فن انسان یا کسی فرد کی شخصیت کی عکاسی و ترجمانی کے لیے اہم ذرائع ہیں۔اس فن میں کسی فرد کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات، واقعات اور خدمات کا تذکرہ حقیقی اور تاریخ وارکیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کے زمانے قدیم سے ہی اس فن سے فطری طورپر انسان کے اندر دلچسپی رہی ہے۔انسانی فطرت ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی سرگزشت میں بڑی ہی دلچسپی رکھتا ہے انسان خواہ کتنا ہی مشغول ہو لیکن دوسروں کے بارے میں کچھ جاننے کاجذبہ اس کے اندر ہمشہ زندہ رہتا ہے۔ہمیں جس قدر اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے اسی قدر دوسرے کے حالات جاننے کی چاہا ہوتی ہیں ان کی زندگیوں میں کمزوریاں اور خامیاں دریافت کرکے ایک تسکین سی محسوس کرتے ہیں ہم ان کے کارناموں کو مشغل راہ بناتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انسان کو یادر فتگان ہمیشہ سے عزیز رہی ہے۔اپنے بزرگوں کے کارناموں کو جمع کرنا اور یاد رکھنے کا دستور آج سے نہیں زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔انسان اپنے خاندانوں اور قبیلوں کے قابل ذکر کارناموں کو قصے کہانیوں کی شکل میں اور لوک گیتوں کے ذریعہ سونپتا چلاگیا۔ اشعار، مرثیہ اور قصائد

اسی سلسلے کی ترقی یافتہ کڑیاں ہے۔ اس کے بعد ہی تحریری سوانح عمریاں وجود میں آئیں۔

قدیم تاریخی ماخذ جیسے ہرام مصر، بادشاہوں کی قبروں اور تابوتوں ایسی سلیں اور بھوج اور پتھر برآمد ہوئے ہیں جن پر ان کے حالات زندگی لکھے ہوئے ہیں وہی سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے کہے جاسکتے ہیں۔باضابط سوانح عمریاں لکھنے کا رواج سب سے پہلے یہودیوں کے یہاں ملتا ہے۔اس کے بعد اہل روم میں رواج ہوا ۔جدید تحقیق کے مطابق سب سے پہلی سوانح عمری دوسری صدی عیسوی میں پلوٹارک نے لکھی۔عیسائیوں نے اپنے بزرگوں اور مذہبی رہنماؤں کے حالات زندگی کو یادگار کے طورپر تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس لیے ابتدائی نمونوں میں مذہبی سوانح عمریاں

دیومالاؤں اور آسمانی کتابوں سے متاثرمعلوم ہوتی ہیں۔آسمانی کتابوں میں فلسفہ اخلاق کے علاوہ قوموں اور افراد کے حالات بھی بیان کئے گے ہیں۔ اس طرح انسانی حالات اور کارناموں کو محفوظ کرنے کا یہ عمل ارتقائی مراحل طے کرتا ہو ایک فن بن گیا۔

فن سوانح نگاری میں پلوٹارک کی کتاب کو نقش اول کی حیثیت حاصل ہے یہ کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد دنیاکی تمام زبانوں کے مشاہیرنے اپنے زبانوں میں سوانح عمریاں لکھنا شروع کیا۔اسطرح سوانح عمری لکھنے کی جو سنہری روایت کا سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے۔ابتدائی دور کے سوانح عمریوں میں امراء ، سلاطین ، فقراء ، صوفیا اور مذہبی شخصیات کی سوانح عمریاں کثرت سے ملتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ا سے انگریزی ادب میں " Autobiography" یعنی خود نوشت سوانح کے نام دیا گیا۔ عیسائیو ں کے مفکروں اور فن کاروں نے اپنی اپنی سوانح عمریاں لکھیں اور اسے خوب فروغ دیا۔چنانچہ خود نوشت سوانح نگاراپنی زندگی کے پوشیدہ حالات واوقعات، تجربات و مشاہدات کو قلمبند کرتا ہے اور انہیں قارئین کے روبرو پیش کرتے تھے۔

فن سوانح نگاری یہ مغربی ممالک میں فن کی حیثیت سے معرض وجود میں آنے والی یہ صنف اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ آئی اورانگریزی، فارسی، اُردو اور ہندی وغیرہ اہم زبانوں میں اپنی جگہ مستقل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔انگریزی زبانوں کی سوانح عمریوں کو فارسی میں ترجمہ کرقلمبند کیا گیا۔بادشاہوں کی خود نوشت سوانح عمریوں میں امیر تیمور کی '' تزک تیموری ''، جہانگیر بادشاہ کی '' تزک جہانگیری ''، بابر کی '' تزک بابری '' اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد اُردو میں خودنوشت سوانح عمریاں لکھنے کا چلن عام ہوا۔ مولانا جعفرتھانیسری نے اپنی آپ بیتی '' تواریخ عجیب '' (کالا پانی) لکھ کر اُردو میں سوانح نگاری لکھنے کی داغ بیل ڈالی۔ ظہیر دہلوی نے '' داستان غدر '' ، منشی عنایت حسین کی '' سرگزشت ایام غدر ''، مولانا حسرت موہانی کی '' قید فرنگ ''، مولانا ابوالکلام آزاد کی '' تذکرہ خواجہ حسن نظامی کی '' آپ بیتی ''اور ہمایوں مرزا کی '' میری کہانی میری زبانی '' یہ اُردو میں ابتدائی دور کی سوانح عمریاں ہیں۔اسطرح اُردو میں خود نوشت سوانح نگاری کا کبھی نہ رکنے والے سلسلہ جاری ہوا۔

سوانح نگاری اُردو زبان میں بھی ادبی اور فنی حیثیت رکھتی ہے۔سوانح نگاری دیگر زبانوں کی طرح اُردو میں بھی فنی تقاضوں کے لیے موضوع، مواد ، ادبی اسلوب، دیانتداری، صداقت کے ساتھ موجود ہے۔یہ فن اپنے آغاز سے ہی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا ادب میں کافی مقبول ہوا ہے۔ اُردو میں باضابطہ سوانح نگاری کا آغاز خواجہ الطاف

حسین حالیؔ نے کیا۔محمد حسین آذاد ‘‘آب حیات ’’ میں سیرت نگاری کی طرف ایک قدم بڑھا چکے تھے۔ لیکن مغربی ادب کے اثرات کی بنیاد پر پہلی بار اُردو کے دو عظیم فنکار حالیؔ اور شبلیؔ نے اس صنف کا معیار بلند کیا۔حالیؔ و شبلی ؔانگریزی زبان سے براہ راست واقف نہیں تھے لیکن انگریزی ادب کی مختلف اصناف میں ہونے والی تبدیلیوں و ترقیوں سے بے خبر بھی نہیں تھے۔ ان کی سوانحی تصانیف کے دیباچے بھی ان اثرات کی شاہد ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں میں اپنے زمانے کے اچھے بُرے اثرات نمایاں ہوتے نہیں ہیں جوش عمل اور اصلاحی جذبہ دونوں میں مشترک ہیں ۔ بحیثیت سوانح نگار حالیؔ اُردو کے پہلے جدید سوانح نگار تسلیم کیے جاسکتے ہیں۔

اُردو سوانح نگاری میں حالیؔ کی تصانیف ‘‘ حیات سعدی ’’ ، ‘‘ یادگارغالب ’’، ‘‘ حیات جاوید ’’ کو بڑی اہمیت حاصل ہیں۔ان سے اُردو میں سوانح نگاری کے فن آغاز ہو ا۔اس کے بعد اُردو میں مستقل سوانح عمریاں لکھنے کا رواج عام ہوا۔

بقول شیخ چاند۔

> ‘‘حیات سعدی لکھ کر حالی نے اُردو زبان میں فن سوانح نگاری کا سنگ بنیاد رکھا۔’’ ۷ے

‘‘حیات سعدی’’ سے پہلے سوانح عمریوں کا مقصد یادگار یا تاریخی مواد جمع کرنا ہوتا تھا۔لیکن حالیؔنے ‘‘حیات سعدی ’’ لکھ کر سوانح عمریوں کو اس محدودد ائرے سے ہٹانے کو کوشیش کی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حالیؔ کا سوانح لکھنے کا مقصد بھی اصلاحی اور اخلاقی تھا اور ہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیق کردہ تینوں سوانح عمریوں میں بات مشترک ہے خواہ وہ حیات سعدی’’ ، ‘‘یادگار غالب ’’ اور ‘‘حیات جاوید ’’ ان تینوں کا اجتماعی مقصد قوم میں جوش و لولہ اور ان کے کرداروں کی خصوصیات کو اُبھار کر آئندہ نسلوں کے لیے نمونہ بناکر پیش کرناتھا۔حالی ؔکے نزدیک سوانح نگاری ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی کارناموں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائیں اور جن قوموں میں پستی آگئی ہے ان کے لیے یہ سوانح عمریاں تا زمانہ عبرت ہیں۔

حالی کے بعد اس دور کے دوسرے عظیم سوانح نگار شبلیؔ ہیں۔ شبلی ؔسوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انشاء پردار، نقاد، مورخ،اور شاعر بھی ہیں۔مختلف سوانح نگار کے موضوعات کا دائرہ مذہبی اور تاریخی ہے لیکن شبلیؔ کا مقصدتاریخ اسلام کے شاندار پہلوں کو قوم کے سامنے پیش کر نا ہے۔شبلیؔ نے المامون، الفاروق، سیرۃ انعمان جیسی مقدس کتابیں لکھی۔

حالیؔکے بعد اُردو ادب میں سوانح نگاری اپنی فنی خصوصیات کے ساتھ ترقی کی راہوں پر گامزن رہی ہے۔ اُردومیں ادب میں یوں تو سوانح عمری ایک با ضابطہ ادبی

صنف کی حیثیت رکھتی ہے لیکن غیر افسانوی اصناف میں کچھ اور بھی ایسی اصناف ہیں جن میں سوانح عناصر پائے جاتے ہیں اور ایک کامیاب سوانح نگار ، سوانح ترتیب کے لیے ان تمام اصناف سے استفادہ کرتا ہے۔

سوانح نگاری کے اُصول اور اقسام:

ہر فن کے اُصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔اُصول و ضابطے کے بغیر کوئی بھی فن کے اندر دلکشی وچاشنی پیدا نہیں ہوسکتی۔اُصول و ضابطے کے بغیر کوئی بھی فن پایہء تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ادب میں بھی ہر اصناف کے اُصول و ضابطے مقرر کیے گئے ہیں۔کتابوں کی تالیف، تصنیف،تحقیق و تنقید کرتے وقت اُصول و ضابطوں کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔سوانح عمری اور خود نوشت کے لیے کچھ اُصول ، ضوابط ، مبادیات، نکات اور ماخذات کا ہونا ضروری ہے۔

سوانح نگاری میں سوانح نگار کو سب سے پہلے صاحب سوانح کا انتخاب کرنا ہوتاہے۔وہ جس کی سوانح لکھنے کا اِرادہ کررہا ہے وہ شخصیت اس قابل ہوکے اس کی سوانح لکھی جائے۔سوانح نگار ایسی شخصیات کا انتخاب کرے جو کہ نمایاں ہو اور ان کی زندگی نشیب و فرازسے دوچار رہی ہو۔سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ صاحب سوانح کی زندگی کے تمام پہلو سے پوری طرح واقف ہو۔ سوانح میں اپنے دور کی تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی کشمکش کا اظہار ملتا ہے۔اس کے بغیر کوئی سوانح عمری مکمل نہیں ہوسکتی ۔

ڈاکٹرعبدالوسع اس سلسلے میں لکھتے ہے۔

سوانح نگاری کے لئے سب سے پہلے کسی فرد یاشخض کی ضرورت" ہے جس کی زندگی کے اعمال و افکار اور تجربات و مشاہدات کے ذریعہ اس کی شخصیت روشن کی جاتی ہے اور اس کی زندگی کے تمام پہلواجاگرکئے جاتے ہیں۔ اسی طرح سوانح نگاری میں شخص یا فرد بنیادی اہمیت کا مالک ہے۔ جس طرح مصور فطرت کائنات میں بکھرے رنگارنگ جلوؤں میں سے کسی ایک منظر کا انتخاب کرتا ہے اسی طرح ایک سوانح نگار کو بھی اس جہانِ فانی میں بسنے والے کروڑوں انسانوں میں سے کسی فرد کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو مناسب اور مفید موضوع ثابت ہو۔اتناہی نہیں بلکہ جس طرح کوئی مصور مشاہدات عالم میں جلوہ ریز بے شمار مناظر میں سے کسی ایک منظر کا انتخاب کرتا ہے جو فطری، متوازن اور حسین معلوم ہوتا ہے،اسی طرح سوانح نگاری بھی اپنے اردگردبے شمار لوگوں میں سے کسی ایک ایسے فردکی زندگی کا انتخاب کرتا ہے جو اسے پر کشش، اہم اور د لچسپ معلوم ہوتی ہے۔" ۸ے

سوانح عمری لکھتے وقت سوانح نگار کو واقعات کا انتخاب کرنا ضروری ہیں۔ واقعات ہی فرد کی ذات اوراس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہے ۔ انسانی زندگی میں کئی واقعات پوشیدہ رہتے ہیں اس لئے سوانح نگار کو ان تمام واقعات میں سے ایسے واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو فرد کی ذات کو نمایاں کرسکے۔سوانح نگار کے لئے صاحب سوانح کی زندگی کے تمام معمولی سے معمولی واقعات بھی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ہر واقعہ اُس صاحب سوانح کے کردار کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔سوانح نگار کوصرف انہیں واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو صاحب سوانح کی شخصیت کی عکاسی کرنے میں مدد گار ثابت ہو۔

سوانح نگار کوکسی بھی شخص کی سوانح عمری لکھتے وقت مواد کی فراہمی کہ ذرائع تلاش کرناضروری ہے۔مواد ملنے کے بعد اُسے حسن ترتیب کے ساتھ پیش کرنا پڑتا ہے۔سوانح نگار کو کسی بھی صاحب سوانح کی زندگی کے بارے میں مکمل طورپر

تحقیق کرنے کے بعد ترتیب وار مواد جمع کرنا چاہیے۔ مواد کو ترتیب دیتے وقت سوانح نگار کو صاحب سوانح کے پیدائش سے لے کر موت تک کہ تمام واقعات ، کارنامے کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ صاحب سوانح کی مکمل زندگی قاری کے آنکھوں کے سامنے آجائے۔سوانح میں تاریخ، فرد واحدکے ساتھ ادبی چاشنی تینوں کی آمزیش ہونی چاہیے۔صاحب سوانح ذہنی کیفیت تک پہنچ کراس کو ٹٹولنا اور اس کی شخصیت کے اُتار چڑھاؤکوترتیب سے پیش کرنا ایک اچھے سوانح نگار کا فرض ہے۔

سوانح نگار کو صاحب سوانح کی زندگی کے ہر پہلو سے ہونا ضروری ہے اور ان پہلوں کو ایمانداری کے ساتھ پیش کرنا پڑتا ہے ۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ عیوب کو بھی بیان کرنا پڑتا ہے۔ایک بہترین سوانح نگار کو زبان و اسلوب کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔سوانح کو پُر کشش دلچسپ بنانے کے لئے اس کے اظہار و بیان میں ندرت ہو، اسلوب نگاری میں سلاست، ادبیت اور جازبیت ہو نا ضروری ہے۔ ان چیزوں کے بغیرسوانح عمری کامیاب نہیں ہوسکتی ۔

بقول ڈاکٹر عبدالواسع،

"سوانح نگاری میں ادبیت یا صناعی کی مثال ایک صاف اور روشن آئینہ سے دی جاسکتی ہے۔جس طرح صاف اور روشن آئینہ میں چہرے کے قدوخال واضح طورپر منعکس ہوتے ہیں، اس طرحاظہار و بیان کے اعجازو ابلاق کے ذریعہ انسانی شخصیت اور اس اعمال و افکار کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ اظہارو بیان ہی کہ ذریعہ سوانح موضوع کی شخصیت میں رنگ و روغن بھر اجاتا ہے۔" ۹ے

سوانح نگاری میں مخصوص اسلوب کا ہونا ضروری ہے۔ سوانح نگاری میں بحیثیت فن موضوع اور مواد کے بعد اسلوب بیان کو اہمیت حاصل رہی ہے۔اسلوب بیان کے ذریعہ نہ صرف مصنیف کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ موضوع کی شخصیت کو بھی اسلوب کے ذریعہ ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ادب شناش ہو، اس کی تحریر وں میں دلکشی اور خوبصورت لب و لہجہ میں تحریر کرنے کا ہنر جانتا ہو۔سوانح نگار کو اپنے انداز نگارش میں سچائی اور دیا نتداری سے کام لینا پڑتا ہے۔

ارباب ادب نے سوانح عمری کے اقسام کے سلسلے میں یہ بات بتائی ہے کہ سوانح عمری اور خود نوشت کے علاوہ سیرت، مکتوب، روزنامچہ، تذکرہ، سفرنامہ، رپورتاژ، شخصی مرقعہ اور خاکہ وغیرہ کو سوانح ادب میں شمار کیا ہے۔کیونکہ اِن میں سوانح عناصر کے واضح نقوش پائے جاتے ہیں۔سوانح نگاری کو دو قسمیں میں تقسم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم سوانح عمری (Biography) دوسر ی خودنوشت سوانح عمری (Autobiography) ہے۔

سوانح عمری (Biography) :

سوانح عمری میں سیرت، منقبت، مفلوظ، تذکرہ، رپورتاژ اور خاکہ ہ شمار کئے جاسکتے ہیں۔ مصنف سوانح عمری میں دوسرے افرادکی حیات زندگی کا تذکرہ پیش کرتا ہے۔

سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے عربی و فارسی میں سیرت نگار و تذکرہ نویسی کی شکل میں موجود تھے۔سوانح نگاری کے تدریجی ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے تو اسے ابتدائی نقش تاریخوں ، تذکروں اور سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ان تصانیف میں عام طورپرمذہبی رہنماؤں کے حالات و مفلوذات پر مشتمل ہوتی تھیں۔سیرت کی کتابوں میں اکثر عقیدت کی کارفرمائی تھی لیکن تذکروں میں شاعروں کے برائے نام حالات، سیرت کا خاکہ اور انتخاب کلام ہوتاتھا۔

سیرت نگاری کا لفظ جب استعمال ہوتا ہے تو عام طورپر ہمارے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے کہ اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کی سیرت ہے۔ ابتدا میں اس سے مراد نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارک ہی ہوتی تھی اور وہ خاص نہج پرمرتب کی جاتی تھی مگر زمانے کے ساتھ ساتھ سیرت کی یہ خصوصیت برقرار نہ رہے سکی اور پھر آہستہ آہستہ اس میں وسعت آتی گئی۔ چنانچہ سیرت نگاری خصور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ سے محدود نہ رہی اور پھر اس کے دائرہ کار میں عام سوانح عمریاں بھی شامل ہوگئیں۔سیرت نبوی پر مختلف کتابیں منظر عام پر آئی جن میں علامہ شبلی نعمانی کی ‘‘ سیرت النبی

'' ، مولانا سید سلیمان منصورپوری کی '' رحمتہ اللعالمین ''، مولانا الاعلیٰ مودودی کی '' سیرت سرور عالم '' بشیر محمد شارق دہلوی کی '' سیرت پاک '' وغیرہ شامل ہیں۔

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنی ذکر، یاداشت، تاریخ واقعات، سرگذشت اور سوانح عمری وغیرہ کے آتے ہیں۔ لیکن اُردو زبان میں اصلاحاً اس لفظ کا استعمال ایک ایسی کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعرا کے مختصر اَحالات اور ان کا کلام بطور نمونہ درج کیا گیا ہوتا ہے۔سوانحی حالات کے تحت تذکرہ نگار شعراء کے نام اور تخلص، وطن،پیدائش و قیام، مزاج کی افتاد اور تصنیفی وتالیفی کارناموں کی نوعیت کا بیان ملتا ہیں۔تذکراتی ادب ہماری ادبی تاریخ کا اہم حصّہ ہے، تذکرہ نگاری بہ اعتبارفن ایک اعلیٰ درجہ کا فن ہے۔یہ نثری اصناف میں اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہے۔شعراء اُردو کے تذکروں کی بدولت ہمارے ادب میں سوانحی، تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی شعور پیدا ہوا۔قدیم شعراء کے تذکروں میں لکھے شعرا ء کے حالات زندگی کسی نہ کسی سوانحی ادب میں شامل ہیں۔جن میں میر تقی میرؔ کی کتاب '' نکات الشعراء '' ، مصحفٰی کا '' تذکرہ ہندی '' ، شیفتہ کا '' گلشن بے خار '' ، محمد حسین آزادؔ کا '' آب حیات ''، فرحت اللہ بیگ کا '' نذیر احمد اور سلیم کی سرگزشتیں '' وغیرہ شامل ہیں۔

'' رپورتاژ '' یہ صنف ادب اُردو میں ترقی پشند تحریک کے ساتھ آگے بڑھی۔ رپورتاژ یہ لفظ فرانسیسی ادب کی دین ہے۔ انگریزی میں رپورتاژ کو '' رپورٹ یج '' کہتے ہیں۔ اُردو میں اس جدید صنف کو '' رپورتاژ '' کے نام سے یاد کیا جاتاہے۔ رپورتاژ کی روایت کافی قدیم ہے۔ انگریزی فرانسیسی سمیت دنیا کے دیگر زبانوں میں بھی اس کو لکھنے کا رواج پایا جاتا ہے۔اس کو لکھتے وقت علمیت اور ادبیت کا پورا لحاظ برتا جاتا ہے اس لئے اس صنف کو اُردو میں تسلیم کیا گیا ہے۔اس صنف میں حقیقت اور صداقت کے ساتھ جو واقعہ جس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے ، اس کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔رپور تاژ میں تخلیق کاروں نے جذبات، احساسات ، خیالات، تاثرات ، واقعات، واردات اور بیانات کو قلم بند کیا گیا ہیں۔اپنی ذات کو موضوع بنانے کی بجائے دوسروں کی شخصیت اور دوسروں کی زندگی کے کسی ایک پہلو کو اُجا گر کیا ہے اور ان کے تمام شعبہ حیات پر روشنی ڈالی اور نہایت ہی ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ ان کی زندگی کے حالات کو اس صنف میں پیش کیا۔اُردو ادب میں کرشن چندر کی '' پودے ''، سجاد ظہیر کی '' یادیں '' اور خاطر غزنوی کی '' قید یا غستان '' رپورتاژ کے ابتدائی مشالیں ہیں۔

خاکہ نگاری شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔ انگریزی اصطلاح میں اسے اسکیج (Sketches) کہتے ہیں۔خاکہ نگاری ادب کی ایک صنف ہے جس میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح براہِ راست کھینچی جاتی ہیں کہ اِن کے ظاہر و باطن دونوں قاری

کے ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے کے سامنے اس کا پورا چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔خاکہ نگار کسی شخصیت کی سیرت کی دھوپ و چھاؤں ۔ اس کے عادات و اطوار ، اسکے کردار کے سیاہ و سفید کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس سے شخصیت کے اہم گوشے بے نقاب ہوجاتے ہیں۔خاکہ نگاری کے چندمثالیں ہے جن میں ''محبوب الزمن '' ، ''تذکرہ گل رعنا '' ، '' دربار اکبری '' اور ''بیرنگ خیال '' قابل ذکر ہیں۔ دور جدید کے خاکوں کی اچھی مثالیں '' چہرے ''، '' جلوئے '' اور '' آپ سے ملئے '' ہیں ان خاکوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عظیم سے عظیم شخصیت کی تصویرایک مختصر فریم میں آسکتی ہیں۔

خود نوشت سوانح عمری : (Autobiography)

خود نوشت سوانح عمری سے مراد کسی شخص کے اپنی زندگی سے متعلق خود لکھے ہوئے حالات ہوتے ہیں۔لفظی اعتبار سے ''خود نوشت سوانح عمری اپنی کہانی خود لکھنے کے ہے''۔خود نوشت سوانح حیات ادبی اعتبار سے فن کی خالص اور حقیقی صورت ہے اور نفسیاتی اعتبار سے یہ فن کار کے ان بنیادی تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے جو اس کے ذات کی پوشیدہ تہوں کو اُجاگر کرتی ہیں۔خودنوشت سوانح عمریوں میں مکتوب،روز نامچہ،سفر نامہ،وغیرہ کو شمار کیا جاسکتا ہے ان سب میں قلم کار اپنی زندگی اور اپنے احوال وکوائف کو لکھتا ہے۔اپنی ذات،حیات،واقعات،اور خدمات کو اہمیت دیتا ہے۔

روزنامچہ بھی ایک ادب کی صنف ہے جس میں آپ بیتی نگار اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کو اپنی ذات کے حوالے سے قلمبند کرتا ہے۔روزنامچے میں روزانہ کے حرکات اور واقعات جو لکھنے والے کے علم اور مشاہدے میں آتے ہیں اُسے وہ قلمبند کرتا ہے۔اس لئے روزنامچے سوانح نگاری کی ایک غیر مرتب شکل ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیاجاسکتا کہ اُردو ادب میں اہمیت کچھ خاص نہیں ہے۔ قدیم زمانے میں ہندوستان میں مغل بادشاہ اپنے روزنامچے تحریر کیا کرتے تھے۔بعد میں وہی ان کی خود نوشت کہلاتی تھی۔دور حاضر میں روزنامچے کے چند نمونے ملتے ہیں جو خواجہ حسن نظامی، خواجہ غلام الثقلین اور مولوی مظہر علی سند یلوی نے لکھے ہیں۔

سفر نامہ اُن تحریروں کو کہتے ہیں جو سفر کے حالات اور واقعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ایک مسافر یا سیاح جن علاقوں ، شہروں اور ملک سے ہوگذرتا ہے وہاں کے لوگوں سے ملاقاتیں کرتا ہیں اور اُن کے خیالات کو پیش کرتا ہے۔وہاں کی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لیتا ہے اور ان کوالفاظ میں قلمبند کرتا ہے۔اسی طرح اپنے حالات، مشاہدات ، تحربات، فرمودات اورتجزیات پر روشنی ڈالتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اپنی شخصیت کے مختلف پہلوں کی بھی تصویر کشی کرتا ہے۔سفرنامہ کی بہترین مثال ابن بطوطہ کے سفر نامے ہیں۔ انھوں نے دنیا بھر کا سفر کیا اور ان سفروں کو کتاب کی شکل میں ترتیب دی جو '' سفر نامہ ابن بطوطہ '' کے نام سے شائع ہوئی۔

مکتوب نگاری کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی توسط سے انسان اپنے حالات ، واقعات، تجربات، مشاہدات ، تاثرات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔مکتوب نگاری میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ ایک دوسرے کے حالات و کوائف کا بخوبی علم ہوتا ہے۔خطوط کے ذریعہ مکتوب نگار اپنی آپ بیتی بھی بیان کرتا ہے۔ ماضی میں ایسے خطوط لکھے جاتے تھے جو آپ بیتی کا بہترین نمونہ ہوتے تھے۔ مکتوب نگاری کو فروغ دینے میں مرزا اسداللہ خان غالبؔ، سرسید احمد خان، علامہ شبلی ؔنعمانی،خواجہ الطاف حسین حالی،ؔ علامہ اقبالؔ، مولوی عبدالحق وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ '' عودہندی ''، '' اردوئے معلی ''، ''خطوط غالبؔ '' ، '' نادرات غالبؔ'' یہ غالبؔ کے خطوط کے مجموعے کافی مشہور ہوئے۔

خطوط بھی نثری مواد کے ماخذ کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ خطوط لکھنے کا رواج سکیڑوں برس سے دُینا کے بشترحصّوں میں پایا جاتا ہے۔ اس صنف کو مشرق و مغرب میں یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔عربی میں پیغمبر اسلام اور نقاء دائمہ کے خطوط کو مذہبی نقطہ نظر سے قابل قدر سمجھا گیا ہے۔ فارسی اور اُردو زبان میں بھی یہ روایت رقعات ابوالفضل و عالمگیر سے لے کر غالبؔ کے خطوط تک موجود ہے۔ خطوط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے اور اس میں خیالات کے اظہار کا عنصر بھی پایاجاتا ہے گویا گفتگو تحریر کا لباس اوڑھے ہوئے ہوتی ہے۔خطوط کا ایک اور پہلو قابل لحاظ ہے اور اس میں وہ ملاقات سے بھی بازی لے جاتے ہیں لہذا تحریروں میں سب سے اہم تحریر ، موضوع کے وہ نجی خیالات خطوط کی شکل میں ہوں گے جو اس نے اپنی زندگی میں اپنے دوستوں عزیز و اقارب، بیوی یا محبوب کو لکھے ہوں گے جن میں ان کی ذاتی زندگی کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

خطوط کو اگر اظہار ذات کا وسیلہ سمجھ کر پڑھا جائے تو اندا زہ ہوتا ہے کہ تحریر و نگارش کے ذخیروں میں یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں ظاہرداری کی آمیزش کی کم سے کم گنجائش ہے۔ بعض اوقات خطوط کے ذریعہ وہ باتیں کہی جاسکتی ہیں جو یو کہنا نہایت مشکل ہوتی ہے۔یوں تو ہمارے ادبی سرمایہ میں چند منظوم خطوط بھی دستیاب ہیں مکتوب نگاری کا تعلق نثری اصناف سے ہے۔ خط کو نثر کے ایک صنف مانا جاتا ہے لیکن وہ دیگر اصناف نثر سے بالکل مختلف ہے کیوں کہ خط کے لیے نہ کوئی موضوع کا تعین ضروری ہے اور نہ اس کو اسلوب کا یعنی خط کی حدود مقرر نہیں ایک ہی خط میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔

خطوط میں مکتوب نگار وقت اور حالات کی وجہہ سے اپنے زمانے کے سیاسی سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کو بے ربط انداز میں قلم بند کرتے ہے۔ خطوط میں صداقت اور سچائی کے ساتھ، بے ساختگی ، بے تکلفی لازمی چیز ہیں۔ مراسلات میں ان شرائط کو دیانت داری کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے کیوں کہ خطوط عام طورپر اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے جاتے۔ اس لیے اس میں مکتوب نگار کی باطنی شخصیت کے تمام پہلو غیر شعوری طورپر اُجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں۔خطوط میں سوانحی عناصرکا پا یا جانا لازمی ہے کیوں کہ مکتوب نگار اپنے حالات اور کوائف کا ذکر اپنے عزیزوں اوردوستوں سے کرتا ہے۔

غالب کے خطوط میں سوانحی عناصر:

اُردو مکتوب نگاری میں مرزا غالبؔ کومنفرد مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بیشتر خطو ط اپنے عزیزوں اور اپنے سے قربت رکھنے والوں دوستوں اور شاگردوں کو لکھے تھے۔ ان مکاتیب میں غالب کی روشن خیالی اور حقیقت پسندی موجودہے۔غالب نے اپنے خطوط میں روزمرہ کی زندگی کے واقعات، معمولات اور اپنی ذہنی کیفیات کو جس شرح و ضبط کے ساتھ پیش کیا ہیں اس سے ان کی پوری شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ان خطوط کی مدد سے غالب کی سوانح بھی مرتب کی جاسکتی ہے۔

غالب کے خطوط کا جائزہ لینے پر ان کی نجی زندگی کے کچھ اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ غالب کے خطوط اُردو مکتوب نگاری میں بیش قیمتی سرمایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ جو رنگ تحریر اختیار کیا ہے وہ منفرد اہمیت کا حامل ہے یعنی غالب سے پہلے کوئی بھی شخص اُردو مکتوب نگاری میں یہ انداز تحریر اختیار نہیں کرسکا ۔ غالب کے جدّت پسند ذہن نے اس فن کو نیالب و لہجہ دیا۔ اُنھوں نے اپنے طرز تحریر کے بارے میں خود مرزا حاتم علی مہر کے نام لکھے خط میں کہاہے۔اقتباس

” مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے ہزار وکوس سے بزبان قلم باتیں باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو تم نے مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی ہے اِ تنا توکہوکہ کیا بات تمہارے جی میں آئی۔“ ۱۰ـہ

غالبؔ نے اپنی کوئی سوانح عمری نہیں لکھی لیکن ان کے خطوط سے سوانحی اقتباسات چن کر ترتیب دے جائے تو غالب کی خود نوشت یتار ہوسکتی ہیں۔کیونکہ کے اِن کے خطوط میں خاندانی حالات سے لے کرتعلیم و تربیت، شادی،شوقی و ظرافت کے بیان، مے نوشی، تمام سفروں کا ذکر، با طینی کیفیت، بیماری، تنگ دستی ومفلسی،زندگی کی تمام پہلوں کا ذکر مل جاتا ہیں۔

خاندانی حالات

خاندان:

غالب سلجوتی ترکوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالب کے داد ترک وطن مادراء النہر سے شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے اور فوج میں نوکر تھے۔ غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں لیکن غالب کی تحریروں میں صرف دو بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک مرزا عبداللہ بیگ خان غالب کے والد اور دوسرے مرزانصراللہ بیگ خان غالب کے چچاتھے۔غالب کے والد عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنو میں آصف الدولہ کی سرکار میں ، پھر حیدرآباد جاکر نظام علی کے یہاں اور اس کے بعد الور جا کے راجا بختیارسنگھ کے ملازم تھے۔ غالب کے والد کسی لڑائی میں مارے گئے جب اُن کی عمر پانچ برس کی تھی۔ غالب کے چچا نصراللہ بیگ خان بہادر مراہٹوں کی طرف سے اکبرآبادکے صوبیدار۔ تھے ۔غالب جب آٹھ بر س کے تھے تب اُن کے چچا کا انتقال ہو گیا تھا۔غالب اپنے چچا کی کفالت میں تھے۔چچا کے انتقال کے بعد جائداد کے عوض میں نقد رقم مقرر ہوئی جس کا ایک حصّہ غالب کو بھی ملتا تھا۔

" میں قوم کا ترک سلجوئی ہوں وہ میرا مادر الھنرسے شاہ عالم کے وقت ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضیعف ہوگی تھی صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ دنشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پر گنہ ز سیر حاصل ذات کی تنخواہ پایا"۔ ۱۱؎

غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خان کے بیٹے اور بیٹیوں کا ذکر غالب نے اپنے خط میں لکھا ہے۔

اقتباس۔

" آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھوپھیاں، تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ دادی یعنی اس مرحومہ کے ہونے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بارمرگئے۔" ۲۱؎

مرزا غالب کے والد عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی، جو کہ سرکار میر ٹھ کے ایک معزز فوجی افسراور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔مرزا عبداللہ بیگ نے بطور گھر داماد اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد مرزا سد اللہ خان ، مرزا یوسف خاں اور ایک لڑکی چھوٹی خانم نے بھی وہیں پرورش پائی۔والد کی وفات کے بعد نانا نے پرورش کی۔ غالب کے ننھیال میں وہ

جو حویلی میں رہتے تھے اس کا حویلی کا ذکر اور اس کے ہمسایہ مکانات کا ذکر غالب نے منشی شیونرائن کو لکھے خط میں ملتا ہے ۔ خط کا اقتباس۔

" ہمارے اور انکے مکان میں مچھیارنڈی کا گھر اور ہمارے دو کڑی درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جواب لکھی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے۔ اُس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اُسکے ایک کھٹیاوالی حویلی،اور سیلم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی، اورکالے محل سے لگی ہوئی اور ایک حویلی، اور اُس سے آگے بڑھکر ایک کٹرا۔“ ۳۱ ؎

اسطرح غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ اپنے خاندان کی قدیم تاریخ اور اپنے ذہن میں موجود اسکے دیرینہ حال و احوال پر روشنی ڈالی ۔

ولادت، تعلیم و تربیت:

نام اسد اللہ بیگ خان ، عرف مرزا نوشہ، تخلص ،اسدؔ اور غالبؔ ، خطابات جو بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے دیئے تھے یہ ہیں نجم الدولہ ، دبیرالملک، نظام جنگ۔ غالبؔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو یعنی ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو بدھ کے دن آگرہ میں پیدا ہوئے۔ نواب علاء الدین احمدخاں کو ایک خط میں جو ۱۲۸۰ھ کا لکھا ہوا ہے غالب فرماتے ہیں۔

‘‘ میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں، اب کے رجب کے مہینے سے اُنہتروان برس شروع ہوا ہے۔’’

غالب نے اپنے خطوط میں اپنی تعلیم و تربیت کا ذکر کیا ہے۔ غالب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی کیوں کے ان کی والدہ عزت النساء بیگم ایک معزز خاندان کی پڑھی لکھی خاتون تھی۔ اس کے بعد باقاعدہ تعلیم آگرہ کے مشہور اُستاد شیخ معظم سے حاصل کی۔ غالب نے چند عربی کی قواعد کی کتابیں پڑھی لیکن ان کی خاص توجہ فارسی پر تھی۔ اپنی تعلیم کا انہوں نے کئی خطوط میں ذکر کیا۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

”میں نے ایام دبستان نشینی (مکتب کی تعلیم کا زمانہ) میں شرح مائتہ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کرفسق و فجور یاعیش و عشرت میں مہنمک ہوگیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری وطبعی تھا۔“ ۴۱ ؎

غالب نے فارسی اور دیگر علوم کی تعلیم اپنے اُستاد ملا عبدالصمدایرانی سے حاصل کی۔ جو ایران سے ہندوستان ۱۸۱۱ء میں سیرو سیاحت کے لیے آئے تھے اور اکبرآباد میں دو برس مقیم تھے۔ اس وقت غالب چودہ برس کے تھے ۔ انھوں نے اپنے

اُستاد سے بہت استفادہ کیا۔فارسی زبان میں مہارت حاصل کی اس بات کا ذکر غالب نے ایک فارسی خط میں کیا ہے۔

اقتباس۔

”نا گاہ ایک شخص کی ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا مظق و فلسفہ میں مولانا فصل حق مرحوم کا نظیراور مومن، موحد، صوفی، صافی، میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا۔ اور لطائف فارسی بحت (خالص فارسی بے آمیز ش عربی) اورغوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے مرے حال ہوئے، سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ذہن محوج (کند) نہ تھا زبان دری سے پیوندازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرحمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہوگئی۔“ ۵۱ے

ملا عبدالصمدسے غالب نے دوسال تعلیم حاصل کی اس وقفے میں ان کے اُستاد نے ا ُنھیں بڑی توجہ و محنت سے ان کو جتنا سکھا سکتے تھے سکھایا۔ غالب نے اس بات کا ذکر اپنے فارسی خطوط میں کیا ہے۔ آگرہ میں غالب نے جہاں قیام کیا وہ محلہ گلاب خانہ تھا یہ محلہ فارسی زبان کے ماہرین کا تھا۔ یہاں مولانا ولی محمد اور میرا عظیم جیسے بڑے اعلی بلندپایہ عالم رہتے تھے۔پورے محلے کا ماحول علمی تھا اور غالب کا اس سے متاثر ہونا ضروری تھا۔

شادی اور اولاد:

مرزا غالب کی شادی تیرہ سال کی عمر میں نواب الہی بخش خان معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی جو اس وقت گیارہ سال کی تھی۔ غالب نے اپنی شادی کے واقعہ کو ایک خط میں بڑے دِلچسپ انداز میں بیان کیا ہے ۔ یہ خط انھوں نے علاؤالدین احمد خان کے نام تحریر کیا جو اُردوئے معلی میں شامل ہے۔

اقتباس۔

”۷ رجب ۱۵۲۲ ھ کو میرے واسطے حکم دوام جس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ ۶۱ے

غالب کی بیوی امراؤ بیگم بڑی دین دار اور نیک بی بی تھیں اور غالب سے بے حد محبت کرتی تھیں ۔ان کے والد یعنی غالب کے خسر غالب کی بہت عزت کرتے تھے جبکہ وہ معزز رئیس تھے ۔غالب کی بیوی غالب کی شراب نوشی کی وجہہ سے ہمشہ ان سے خفا رہتی تھی اور اپنے کھانے پینے کا سامان بھی الگ رکھتی تھی۔ غالب کی بعض

تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی سے خوش نہ تھے لیکن ان کے اعمال و اقوال سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے آپسی تعلقات خوشگوار رہے۔ ایک وقت کا کھانا غالب اپنے گھر پر ہی بیوی کے ساتھ کھاتے تھے۔ بیوی کی آرام و آسائش کا خیال رکھتے تھے۔ اُن کے خطوط کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ شادی کے بعد دہلی میں قیام پذیر ہوگئے۔ دہلی کی گلیوّں اور دوستوں کے وہ مرزا نوشہ بن گئے۔

مرزا غالب کے یہاں لڑکے اورلڑکیاں ملا کر سات بچےّ پیدا ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی پندرہ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا۔اس کا غم غالب کو ہمیشہ رہا۔ غالب نے اپنی بیوی کی بڑی بہن بنیادی بیگم جو نواب غلام حسین خان سے منسوب

تھیں۔ان کے دو لڑکے تھے، ان میں سے ایک لڑکا زین العابدین خان عارف کو گود لیا تھا۔ وہ بڑے ہوکر غالب کی طرح ہی شاعر ہوئے ۔ ان کا تخلص عارف تھا اور وہ غالب کی طرز کی پیروی کرنے لگے۔غالب ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ لیکن اچانک عین عالم جوانی میں ان کی وفات ہوگئی۔جس کا غالب پر بہت اثر ہوا۔ اپنے درد اور غم کی گہرائی کا اظہاراُردو میں ایک پُر درد مرثیہ لکھ کر کیااور عارف کے دونوں کمسن بچوں کی پرو رش کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ان دونوں بچوں کے نام باقرعلی خان اور حسن علی خان تھا۔

دلی کا قیام:

غالب سات برس کی عمر سے دلی آیا جایا کرتے تھے۔ ابتدا میں جب وہ دلی آتے توشعبان بیگ کی حویلی میں قیام کرتے تھے۔غالب کا دلی میں مستقل قیام ۱۸۱۶ء کے لگ بھگ ہواجب غالب ۱۹ برس کے تھے۔دلی میں غالب ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے۔ان کا کوئی ذاتی مکان نہ تھا اور مکان خریدنے کی اُنھوں نے فکر نہیں کی۔ مولانا حالیؔ نے غالب کے مکان کا ذکر ''یادگار غالب '' میں کیا۔

”دلّی میں اُنکے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کا معلوم ہوتا ہے اس تمام مدت میں اُنھوں نے غالباً کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا، ہمیشہ کرایے کے مکان رہاکیئے۔ یا ایک مدّت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرا ے کے رہے تھے، جب ایک مکان سے جِی اُکتایا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا، مگر قاسم جان کی گلی یا حیش خان کے پھاٹک یا اُسکے قرب وجوار کے سوا کسی اور ضلع میں جاکر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کی دیوان خانہ کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت ہو کہتے ہیں۔“

”مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیاہے

یہ بندہ کمینہ ہمسایہ خدا ہے۔ ۷۱ے

غالب نے مرزا ہر گوپال تفتہ ؔکے نام لکھے خط میں اپنے محلّہ اور مکان کا ذکر کیا۔

اقتباس۔

” میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اوراس محلہ کا نام بھی بلی ماروں محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوست میں نہیں پایاجاتا۔واللہ ڈھونڈ نے کو مسلمان ملتا،کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ سہنودالبتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔ اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ!میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نودس برس سے کرایے کو رہتا ہوں۔“ ۸۱ے

مالی حالات

۱۔ آمدنی کے ذرائع ۲۔ تنگ دستی و مفلسی ۳۔ پنشن

پنشن:

غالب کے والد عبداللہ بیگ خان کے انتقال کے بعد غالب کی کفالت اُن چچا نصر اللہ بیگ خان نے کی۔نصراللہ بیگ خان لارڈ لیک کے فوجی دستے کے رسالدار تھے اور سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ چارسو سواروں کے دستے کی ذمہ داری کے عوض ملتی تھیں ۔ لارڈ صاحب نے نصر اللہ بیگ خان کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں انھیں تا حیات صوبہ آگرہ میں سونک اور سونسا کی جاگیر اور پندرہ ہزار آٹھ سو روپے ہمیشہ کے لیے مقرر کردے تھے۔ نصر اللہ بیگ خان کی تقرری کے دس گیارہ مہینے بعد ہاتھی پر سوار جارہے تھے تو نیچے گرے اور اندرونی چوٹوں کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔ اس دن حکومت نے ان کی جاگیریں اپنے قبضہ میں لے لی۔نواب احمد بخش خان کی درخواست پر لارڈ جنرل بہادر صاحب نے نصراللہ بیگ خان کے عزیز و اقارب کے گزر و بسر کے لیے پانچ ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیاجس میں سے مرزا اسد اللہ غالب کو پندرہ سو روپے سالانہ حصّہ ملتا تھا۔نصراللہ بیگ خان کا نوکر جس کا نام خواجہ حاجی تھااُس کو بھی اس وظیفہ میں سے دو ہزار روپے سالانہ حصّہ ملتا تھا۔اس بات پر غالبؔ کو اعتراض تھا کیونکہ خواجہ حاجی ،نصراللہ بیگ کا رشتہ دار نہیں تھااس لیے

غالب کویہ گوارا نہیں تھا کے وہ نصراللہ بیگ خان کے رشتہ داروں کی حیثیت سے وظیفہ کا حصہ دار بنے۔ غالب نے اس سلسلے میں حکومت کو درخواست پیش کی۔اس سلسلے میں غالب نے کلکتہ کا سفر کیا اور انگریز آفسروں سے ملاقاتیں کی لیکن کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تو اُنھوں نے فیروزپور جھرکہ کے رئیس نواب شمش الدین خان سے مدد لی۔ کچھ عرصے کے بعد ایک انگریز افسرولیم فریز کا قتل ہوگیا اس میں نواب شمش الدین خان مجرم پائے گئے اور انھیں پھانسی دی گئی۔اب غالب کی براہ راست انگریزی حکومت کے خزانے سے پنشن ملنے لگی۔اسی دوران سہہ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ غدر برپا ہوگیاغالب کو بھی گوشہ نشی ہونا پڑا اس کے باوجود ان پر یہ الزام لگاکے وہ باغیوں کے ہمدرد تھے۔ باغیوں کی مدد اور خوش آمد کرتے تھے اسی وجہ سے انگریزی سرکار نے پنشن بند کردی۔غالب اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر کارمیاب ہوئے اور ۴ مئی سہہ۱۸۶۰ء کو تین سال کی رُکی ہوئی پنشن کی رقم واپس مل گئی۔اس بات کا ذکرغالب نے مرزا تفتہؔ کو لکھے خط میں کیا۔ خط

"مرزا تفتہ۔ ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجب نشاط مفرط ہوگا۔میں اجراے پنشن سرکارانگریزی سے مایوس تھا۔بارے وہ نقشہ پنشن داروں جو یہاں سے بن کر صدرکو گیا تھااور یہاں کے حاکم نے نسبت میرے صاف لکھ دیا تھاکہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کہ حاکم کے راے کی میری پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا میں نے بھی سُنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آیندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنحواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھاچاہئے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔" ۹۱ـہ

۶۱ اپریل سہہ۱۸۶۰ء

آمدنی کے ذرائع:

غالب کا بچپن اور جوانی کا ابتدائی زمانہ آرام و آسائش سے گذرا۔غالب کو آمدنی کے ذرائع میں ماہانا و سالانہ پنشن ملتی تھی۔ اس کے علاوہ انعام امداد یا نذرانے مل جاتے تھے۔

قلعہ معلی سے غالب کو ۱۸۵۰ سہہء میں بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے تاریخِ تیموری لکھنے پر مامور کیا تھا اور پچاس روپیہ ماہانا اس کام کی تنخواہ مقرر کی تھی ا ور خلعت کے علاوہ غالبؔ کو نجم الدولہ، دبیرالملک اور نظام جنگ کے خطابات سے نوازا۔ غالب کو قلعہ سے پچاس روپیہ ماہوار جولائی ۱۸۵۰ سہہء سے لیکر آخر اپریل ۱۸۵۷ سہہء تک ملتے رہے۔غالب نے خاندان تیمور یہ کی تاریخ کا جتنا حصّہ لکھا تھا، وہ '' مہر نیمروز '' کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکا تھا۔دوسرا حصّہ مکمل نہ ہوسکا

کیونکہ ۱۸۵۷ ؁ء کی بغاوت میں مغلیہ حکومت کا تختہ اُلٹ گیااور تاریخِ تیموری کا دوسرا حصّہ ‘‘ ماہ نیم ماہ ’’ مکمل نہ ہو سکا۔

اس کا ذکر غالب نے ایک خط جو منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھا۔

اقتباس۔

”میں نے اب عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلہ اُس تاریخ کا تمام کر وہ نذر کیا۔اُس کا حال سینے کہ وہ صورت جو پہلے تھی وہ نہیں رہی۔ آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا۔ اب شروع تحریر آفرنیش عالم و ظہور آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام ”پرتوستان“ رکھتا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتداے عالم سے حضرت بصیرالدین، ہمایوں تک۔ اس کا نام ”مہر نیمروز“ رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والی عصر تک۔ اُس کا نام ”ماہ نیم ماہ“ سودہ ”مہر نیم روز“ تمام ہوا اور نذر حضور کیا۔ اب اگر ز یست وفا کرے گی تو ”ماہ نیم ماہ“ لکھاجائے گا۔“ ۲۰ ؎

نواب رام پور سے بھی غالب کے اچھے مراسم تھے۔ غالب نے نواب یوسف علی خاں رام پورکی فارسی پڑھائی۔ شاعری میں ان کے شاگرد بھی تھے۔ غالب کو زندگی کے آخری دس برسوں میں ریاست رام پور سے سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔اس مقررہ رقم کی علاوہ بھی وہاں سے کچھ نہ کچھ مدد ملتی رہتی تھی۔غالب نے اس کا ذکر تفتہؔ کو لکھے ایک خط میں کیا۔

اقتباس۔

”نواب یوسف علی خاں بہادر بیس تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگردہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ؁۱۸۵۹ء سے سوروپیہ ماہ ہر ماہ بھیجتے ہیں بلاتے رہتے ہیں۔اب میں گیادو مہنیے رہ کرچلاآیا۔ بشرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سوروپیہ مہینہ یہاں رہوں وہاں رہوں۔ خدا کے ہاں سے میرا مقررہے۔“ ۲۱ ؎

سلطنت اودھ سے بھی غالبؔ کا تعلق رہا۔نواب واجدعلی شاہ نے غالب کو مدح گوئی کے صلے میں پانچ سوروپے سالانہ مقرر کیا تھا۔غالب نے نصیرالدین حیدر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا تھا غالب کے بیان کے مطابق اس پر پانچ ہزار روپے بطور انعام ملے تھے جس کا ذکر غالب نے مرزا تفتہؔ کو لکھے خط میں کیا۔

اقتباس۔

”یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیرالدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن پانچ ہزار روپیہ کے بھیجنے کا حکم ہوا۔“ ۲۲ ؎

دو شنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

ریاست الور کے راجابھی غالب کی قدر دانی کرتے تھے اورانعام کچھ نہ کچھ دیا کرتے تھے۔ریاست جے پور اور گوالیار اور پٹیالہ سے بھی کچھ نہ کچھ انعام کی شکل میں غالب کو مل جاتا تھا۔حکومت اور ریاستوں کے علاوہ غالب کے کچھ صاحب دل رئیس بھی ان کے قدردان تھے اور کچھ نہ کچھ نذرانے دیا کرتے تھے۔

تنگ دستی و مفلسی:

غالب کا بچپن اور ابتدائی جوانی کا زمانہ عیش و عشرت ، آرام و آسائش سے گذرا ۔ لیکن وہ دہلی میں مستقل قیام کے بعد مالی پریشانیوں سے گزرے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ امیروں و رئیسوں کی طرح زندگی گذارتے تھے۔غالب کی آمدنی کم تھیں اور خرچ زیادہ کرتے تھے۔ غالب اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مہاجنوں سے سودی قرض لیا کرتے تھے۔

قلعے سے جو ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور بعد میں چھ ماہی کردی گئی انھوں نے اس بات کا ذکر اپنے خط میں کیا جو ہر گوپال تفتہؔ کے نام تحریر کیا اس خط سے غالب کی تنگ دستی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ قرض لینے کے عادی ہوگئے تھے ۔

اقتباس۔

”تمھاری خیروعافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔بھائی کا ہاترس سے آنا معلوم ہوا آویں تو میرا سلام کہہ دینا۔تمھار ا دعاگو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ عالی ہے۔ یعنی محتاج ہوں۔سُودوسُو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمہاری ہمت پر سو ہزار آفریں۔ جے پور سے مجھ کو دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا فرض رفع ہوجاتا اور پھر اگر وہ چاربرس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پالنسو تو بھائی تمھاری جان کی قسم متفرقات میں جاکر سوڈیڑھ سوبچ رہیں ہوگے سووہ میرے صرف میں آویں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سے سولہ باقی رہے گا اور جوبابو صاحب سے منگوائے گئے تھے، وہ صرف انگریزی سوداگر کے دینے تھے قیمت اُس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمھارے مشرب میں حلال ہے سو وہ دے دیے گئے۔ دو۔ ۲۳ ؎

نگا شتہ، پنجشنبہ نہم جون۳ ۱۸۵ء   از اسد اللہ

یہ تھیں ان کی مالی مشکلات جن سے غالب کو ساری زندگی تنگ دستی میں گذرنا پڑا۔ ان تمام حالات کا مقابلہ انھوں بڑی ہمت سے کیا اور اپنے حالت کا خود مذاق اُڑیا ۔

غالب نے نواب علاء الدین خاں علائیؔ کے نام ایک خط میں اپنی غربت اور معاشی بدحالی کا مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔

اقتباس۔

”بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ اِدھر متھراداس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول نہ سود۔اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سرباایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوادیا کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکڑی کے، سوروپے رام پور کے قرض دینے وال ایک میرا مختار کار۔ وہ سودماہ بہ ماہ لیا چاہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکی دار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدام بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمدوہی ایک سوباسٹھ تنگ آگیا۔ گزار مشکل ہوگیا۔“ ۲۴ے

۲۷ جولائی ۱۸۲۶ء

ان کے یہ خط سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ماہانہ خرچ تین سوروپے سے کم نہ تھا اور آمدنی خودان کے ارشاد کے مطابق ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے تھی۔ گویا ایک سو چالیس روپے ماہوار کا خسارہ تھا۔ اس خط میں غالب نے مزے لے کے اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنی مصیبتوں کا ذکر کرنے کے لیے بہت بڑادل ہونا چائیے۔ اور غالب نے اپنے زخم بیان کرنے کے والا دل چیرکر دکھایا ہے۔

غالب کی ساری زندگی اپنی انا کی حفاظت میں گزری لیکن عملی زندگی میں جب غالب کی انا بادحوادث کے تھپڑے کھاتی ہے تو غالب نے اپنا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آئے۔ مرزا قربان علی بیگ کو لکھتے ہوئے اس خط سے اس بات کی آگائی ہوتی ہے۔

مرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ کو اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

اقتباس۔

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتاہوں کہ لو، غالبؔ کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے، اب تو قرضداروں کی جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالبؔ کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کا فرمرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشمین" خطاب دیتے ہیں، جوں کہ یہ اپنے کو "شاہ قلمر و سخن" جانتا تھا، "سفر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کررکھا ہے۔آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنارہا ہے۔'' ۲۵ ؎

اس خط کے اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جو قرض لیے تھے اُس کی وجہ سے اُن کی عزت جاتی رہی، اُن کے انا کو ٹھیس لگی پھر بھی غالب نے اپنی کمزوریاں ، معاشی بدحالیوں اور محرومیوں کومزاحیہ انداز میں بیان کیا۔ ان کے اس شوقی بیانی کی تہہ میں نہ قابل بیان ذہنی کرب اور شدت کا احساس ہے۔

غالب خط لکھتے ہوئے کو شش کرتے ہیں کہ اپنی مصیبتوں کے بیان سے دوسروں کو بے وجہ پریشان نہ کریں۔ وہ اپنے دُکھ بڑے مزے لے کربیان کرتے ہیں۔ میر سرفراز حسین کے نام خط میں اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہیں اور ان دوستوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو انقلاب زمانہ نے اُن سے جدا کردیا۔ پھر ایک دم بات کا رُخ بدلتے ہوئے میر سرفراز حسین کو اپنی تنہائی کاماتم اور دوستوں کے جُدا ہونا کا غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

خط کا اقتباس۔

" اللہ اللہ اللہ! ہزار کامیں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔ "سنو غالبؔ! رونا پیٹنا کیا، کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔" ۲۶ ؎

سفروں کا ذکر:

غالب نے دہلی سے باہر کئی سفر کئے انھوں نے اپنی زندگی میں صرف ایک لمبا سفر کیا اور وہ کلکتہ کا سفر تھا۔ اس سلسلہ میں وہ تقریباً تین سال دہلی سے باہر رہے اس سفر کے راستہ میں انھوں نے لکھنوء الہ آباد ، بنارس، پٹنہ اور بعض دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا۔ سفر بھرت پور، فیروز پور جھرکہ، سفر دیار مشرق، لکھنوء کا سفر اور قیام، شہرالہ آباد بنارس اور پھر کلکتہ کا سفر۔ تمام سفروں کا ذکر غالب نے اپنے اکثر خطوط میں کیا ہے۔ فیروز پور جھرکہ کا سفر انھوں نے اپنے پنشن کے

مسئلے کے خاطر کیا۔ غالب کو فیروز پور جھرکے سے پنشن ملتی تھی اور ان کے خاندان کے لیے دس ہزار روپیہ سالانہ مقرر تھا۔مگر نواب احمد بخش خان صرف تین ہزار سالانہ دیتے تھے۔ اس میں غالب کا حُقہ صرف ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ تھا۔

غالب چاہتے تھے کہ پورے دس ہزار سالانہ ملیں تاکہ ان کے حُقہ کی رقم میں اضافہ ہو جب احمد بخش خان نے اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خان کو اپنا جانشین مقرر کیا تو انہوں نے جو رقم ملتی تھی وہ بھی بند کر دی۔اس سلسلے میں وہ خود نواب صاحب سے ملنے فیروزپور جھرکہ گئے تھے۔وہاں کوئی صورت نظر نہیں آئی انھوں نے کلکتہ کا سفر کیا۔ غالب خود نواب صاحب سے ملنے اور عرض معروض کے ذریعہ آپسی معاملات کوطے کرنے کی عرض وہاں گئے چند روز وہاں خیموں میں اپنی زندگی کی صبح و شام گزارتے رہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے۔

'' دو سال یک ہزار دو صدو چہل وبک ۱۲۴۱ ہجری مطابق ۱۸۲۵ء سے کہ گتی حنانان نگلشد بر بھرت پور لشکر کشیدہ داؤں روئین ڈرامہ درمیان گرفتہ و من دریں پرش ---- غم عاحی قدر مخزالہ ولہ نواب احمد بخش خان بہادر۔''

اس طرح غالب نے اپنے سفر کا ذکر اپنی فارسی خط میں کیا جو خطوط کا فارسی مجموعہ پہنچ آہنگ میں موجود ہے۔

فیروز پور جھرکہ کا سفر:

غالبؔ کو ملنے والی پنشن میں خواجہ حاجی حصّہ دار بنے تھے ۔ خواجہ حاجی غالب کے چچانصراللہ بیگ خان کے رشتہ دار بھی نہیں تھے لیکن پھر بھی اُن کو نصراللہ بیگ کے خاندان کی پنشن کا حصہّ مل رہا تھایہ بات غالب کو نہ گوارہ تھیں۔ غالب کے چچا نصراللہ بیگ خان کے خسرو نواب احمد بخش خان کی طرف سے خاموش تھے۔ایک زمانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہوگیا تو غالب نے یہ خیال کیا کہ اب سال کی پوری پنشن غالب کو ہی ملے گی لیکن جب وظیفہ تقسیم ہوا تودو ہزار کی رقم خواجہ حاجی کے دونوں بیٹھوں کو ادا کردی گئی۔ غالب مایوس ہوکر نواب احمد بخش خان کے پاس فیروز پور جھرکہ گئے اورنواب صاحب کو اپنا وعدہ پورا کرنے کو کہا کہ جائز وارثوں کو اپنا حق ملنا چاہیے ورنہ مجھ اِجازت دیجیے کہ میں کلکتہ جاکر اپنا مطا بعہ حکومت کے سامنے پیش کرو۔غالب نے اس اُمیدسے فروزپور میں قیام کیا کہ نواب صاحب سے بات کرکہ اس مسئلہ کا کوئی حل ہوجائے گا مگر نواب صاحب ان کو ٹالتے رہے۔ غالب کو اسی وجہ سے شدید ذہنی کوفت ہوئی۔ اس بات کا ذکر غالب نے اپنے فارسی خط میں کیا جو پنچ آہنگ میں موجود ہے اور اس کا ترجمہ '' ذکر غالب '' میں ہے۔

خط کاترجمہ ۔

”ہر چند میرا یہ شیوہ نہیں کہ میں دراز نفسی اختیار کروں اور جو میرے ہمدم و غم خوار ہوں اپنے دکھ انھیں دیدوں لیکن تم میرے بھائی بھی ہو اور میرے دوست بھی۔اس لیے تم سے کہتا ہوں اور اُسے اپنی لاچاری خیال کرتا ہوں کہ ایک اچھا خاصہ وقت میں نے اس خوش اندیشی گزارا ہے کہ وہ میرے لیے کچھ کریں گے۔ کیا کہوں کہ میں اس انتظار کی آگ میں کس طرح جلتارہا ہوں اور کیسے اس عذاب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے بیٹھا ہوں۔ یہ وہ دُکھ ہے ہے جو گوشہء زنداں میں (قید) کس مجرم کے حصّے میں بھی نہیں آیا اور وہ دیکھ رہا ہوں جوکوئی کافر جہنم میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ۷۲ ے

اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب معاشی حالات سے مجبور تھے۔ اور اپنے پنشن کی کاروائی کے لیے بہت کوشاں رہتے تھے۔ نواب صاحب کے نہ ملانے کی وجہہ سے کوفت میں تھے۔ فیروز پور چھرکہ میں نواب صاحب کی انداز ستم روا اور سلوک سے وہ گمراہ ہوگئے اور وہ صبر کرتے ہوئے چُپ بیٹھے ہے۔ مرزا علی بخش بہادر کے نام اس خط میں جس کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ غالب کے سفر فیروز پور چھرکہ اور اس کے پس منظر جو روشنی پڑتی ہے اس سے غالب کی نفسیات کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

غالب کی حساس طبیعت کے لیے ذریعہ معاش کی تنگی ، بھائی کی بیماری، قرض خواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتں ناقابل برداشت تھیں۔ دوستوں نے مشہورہ دیا تھا کہ نواب کی خدمت میں اپنا دُکھ درد بیان کرنے کے عرض سے انھوں نے فیروز پور چھرکہ کا سفر کیا۔ مرزا غالب کو اُمید تھی کہ نواب صاحب ان کی امداد کرئے گے لیکن نواب صاحب ان دنوں اپنی پریشانیوں میں گرفتارتھے۔ اس لیے مرزا کو فیروز پور جھرکہ رُکنا پڑا۔ اس کا ذکر غالب نے اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ کے والد رائے بھجمل کھتری کے نام لکھا ہیں۔ اس سے ان کی مصیبتوں کا پتہ چلتا ہے۔جو فارسی خطوط کے مجموعہ پنچ آہنگ میں موجود ہے۔

غالب نے اس زمانے میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے نام صنعت تعطیل میں جو خط لکھا تھا اس سے اس سفر کے مقصد پر ورشنی پڑتی ہے۔ جو نامہ ہائے فارسی میں موجود ہے۔ جس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ خط ملا خط فرمایا

خط کا ترجمہ۔

" قصہ مختصر یہ کہ کام کا سر رشتہ وقت سے وابستہ ہے اس کشاش میں اپنے بند گریں کو نہ ملا سکا اس سے باہر آجاؤ ں میری بخودی گربیاں ہوتی اور پھر دہلی لے آتی۔" ۲۸ے

اُن کے اس مکتوب میں بہت سی باتیں موجود ہیں جن کو اس وقت مرزا کی ذہنی زندگی کا ترجمان کہا جاسکتا ہے۔جو مکتوب پنچ آہنگ اوراق معانی میں موجود ہیں جس کا اُردو ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

خط کا ترجمہ

'' عرض مُدّعا کے اُن بھیدوں کی شرخ نگاری، کیسے ممکن ہو۔سو عمریں بھی عطا ہوں اور ہر عمرکے ساتھ اس اندوہ نارسائی و دردِ جدائی کا حساس بڑھتا رہے تویہ ہر طرح رواہے۔

اللہ بہترجانتا ہے کہ میں سرتا سرگم کردہ جواس اور سرتا پاوہم و شواس کے عالم میں یہاں پہنچا۔ اگر اس پر، حضرت والا کا دل گلہ مندہو اور خاطِر عالی پر اس کی کوئی پرچھائیں گزرے تو میرے لیے کس قدر تکلیف و ندامت کی بات ہوگئی۔۲۹ے

اس خطوط سے غالب کے قیام فیروز پور کے سلسلہ میں مزید ان کی نفسیات اور وقت و حالات کی پیدا کردہ ذہنی الجھنوں کی ایک متحرک تصویر چشم خیال کے روبر و آجاتے ہیں۔ یہاں غالب کے ایک اور خط بنام رائے چھج مل کھتری کو تحریر کیا پیش نظر ہیں۔

" اگر چہ میں وطن میں نہیں ہوں لیکن وطن سے قریب ہونا قیامت سے کچھ کم نہیں اب تک اہل کاشانہ کے ساتھ نامدو پیام کا سلسلہ جاری ہے لیکن جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے وہ آشوب چشم کا درجہ رکھتا ہے جو سننے کو ملتا ہے وہ زحمت گوش، کے علاوہ کیا ہے۔ میں موج کے ان تھپٹیر وں سے جونیم جان لے کر باہر آیا ہوں شاید وہ خاک فیروزپور کی امانت ہے مجھے بہ جبرو کراہ اس قیام پرراضی ہونا پڑا۔ اپنی موت جو میں ہزار آرزو کے ساتھ خدا سے چاہتا ہوں شاید اس کے لیے سرزمین موعود یہی فیروزپور ہے لیکن بوجہ افتادگی یہاں کے قیام میں اس قدر ورنگ واقع ہورہی ہے۔" ۳۰ے

اسی ذہنی حالت مبتلا اور تشویش کے ساتھ غالب نے فیروزپور جھرکہ سے لوٹ جانے کا فیصلہ کیا وہ ایک حسا س آدمی تھے وہ اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی جانتے تھے۔ اور اس وقت اُن کو یہی احساس ذمہ داری ستاتارہا ہو۔ فیروز پور جھرکہ کی صورت حال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ

" میرے غم حال قدر نے اس وہم وگمان کے زیر اثر جو دشمنوں نے خوف وہراس کی طرح ان کے دل میں رکھا ہے سر کار سرمور سے محصولات کی عدم وصول یابی کا ذکر کیا۔اور فیروز پور جھرکہ سے مایوس ہو کر غالب نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔"
۳۱ے

لکھنوء کا سفر :

غالب قا ض خواہوں کے تقاضوں اور اپنی کمزور مالی حالات کے چلتے دہلی سے کانپور کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہ سر چارلس مٹکاف سے مل کر اپنی پنشن سے متعلق انصاف کی گوہر لگا سکے۔ لیکن وہ کانپور میں اچانک بیمار پڑگئے اور اس شہر میں مناسب طبیب نہ ملنے کی شکل میں وہ مجبوراً دریائے گنگا کے راستے لکھنوء کے لیے روانہ ہوگئے۔ غالبؔ بتاریخ ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۲۶ء کو لکھنوء پہنچے۔ غالب نے لکھنو میں پانچ ماہ تک قیام کیا۔

مالک رام صاحب نے غالب کے سفر کے سلسلہ میں ان کی بیماری کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ وہ چلنے پھرنے کے لائق بھی نہیں رہ گئے تھے۔

" بد قسمتی سے جوں ہی کانپور پہنچے وہاں بیمار پڑگئے۔یہاں تک کہ ملنے جُلنے کی سکت بھی جاتی رہی۔ چونکہ اس شہر میں ڈھنگ کو ئی معالج نہیں ملا۔ اس لیے انہیں مجبوراً ایک کرایہ کی پالکی میں لکھنوء جانا پڑا۔یہاں وہ پانچ مہینے سے کچھ زیادہ دن بستر پر لیٹے رہے یہیں میں نے گور نر جنرل بہادر کے ورد اور بادشاہ اودھ کے استقبال کے لیے جانے کی خبر سنی لیکن ان دنوں میں چارپائی سے اُٹھنے تک کے قابل نہیں تھاعرضکہ لکھنؤکی آب وہوا بالکل راس نہیں آئی۔" ۳۲ے

غالب کی لکھنؤ آنے کی خبرمعتمدالدولہ سید محمد بہادر عرف آغا میر کو ہوئی تو انھوں نے غالب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا۔ لکھنو میں غالب کے دوست سبحان علی خاں،میر نیازحسین خاں کے ذریعہ غالب نے معتمد الدولہ سید محمد بہادر عرف آغا میر سے ملاقات کی تجویزپیش کی تاکہ اُن سے مل کر غالب کو کچھ امدادے مدت مل سکے۔ لیکن غالب کی ملاقات آغا میر سے نہیں ہوسکی۔اس سلسلے میں غالب نے معتمدالدولہ کے نام صنعت تعطیل میں ایک عرض داشت لکھی جس میں ان سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے غالب لکھتے ہے کہ۔

"معاوضے کے سلسلے میں ملاقات کے لیے اُن (معتمدالدولہ) کی طرف ہے کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ ذہنی معاملے نے عملی صورت اختیار نہیں کی۔ چوں کہ اُن معاملات کی وجہ سے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا دل زخمی تھا، نیز طویل سفر اور دشوار

مقصد در پیش تھے۔ میں نے پاسِ ناموسِ خاکسای کی وجہ سے استغتی سے کام لیاتھا اور اُن نو دولتیوں کے اختلاط سے اپنا دامن بچالیا۔ اگر چہ اُس خواہش کا نقش دل پر باقی نہیں وہ تحریر کاغذ پرمحفوظ ہے۔ چناں چہ ہزیاں نگار قلم سے وہ (عرض داشت) نقل کررہاہوں۔" ۳۳ـہ

غالب نے منددجہ بالامدحیہ نثر صفت تعطیل نواب کو لکھا لیکن اس نثر کی پیش کرنے کی نوبت نہ آئی وجہ اسکی یہ تھی کہ نواب آغا میر وزیر نائب سے ملاقات کی جو شرطیں پیش کی وہ مرزا غالب کو منظور نہ تھی مرزا اس کو شرم اور خوداری کے خلاف سمجھتے تھے۔

مرزا غالب کے لکھنؤ قیام کا ذکر مولانا الطاف حسین حالیؔ نے بھی تحریرکیا۔

"اُس زمانے میں نصیرالدین حیدر فرما نروا اور روشن الہ ولہ نائب لسلطنت تھے۔ اہل لکھنو ئ نے مرزا کی عمدہ طورپر مدارات کی اور روشن الد ولہ کے یہاں بغوان شائستہ ٰان کی تقریب کی گئی۔ مرزا سے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سر انجام نہیں ہوسکا،مگر ایک مدحیہ نثرء صنعت تعطیل میں جو اُن کے مسودّات میں موجود ہے نائب لسلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں اور دوسرے نذر سے مجھ کو معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے مرزا بغیر اس کہ روشن الد ولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں وہاں سے کلکتہ کو روانہ ہوگئے۔" ۳۴ـہ

حالیؔ کی اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کی خود داری اور انا کی حد کیا تھی۔وہ کتنے خودار تھے اور کسی کا احسان نہیں لیتے تھے۔ لکھنؤ قیام میں مرزا کی و صورت حال پر روشنی ان کے مکتوبات سے ملتی ہے اور لکھنؤ میں غالب کے شب و روز کا اصطراب سامنے آیا ہے۔ لکھنؤ میں قیام کے حالات اور کیفیت کی آگاہی اپنے دوستوں کو مکتوب کے ذریعہ دیتے رہے ۔انھوں نے لکھنؤ کے قیام میں مولوی سجادت علی ، منشی محمد حسن، مولوی کرم حسین خان،وغیرہ کو مکتوب لکھتے رہے ۔ یہ تمام خطوط ''اوراق معنی'' میں موجود ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے ہم کو غالب کے سفر کی روداد حاصل ہوتی ہیں۔ان مکتوبات کو غالب کا سفر نامہ دیار مشرق بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کی سواریوں کا ذکر بھی ان کے مکتوبات میں ملتا ہے۔ انھوں نے اُس زمانے کی سفر کی روداد، سست قدمی کے جو اسباب ہوئے تھے ان کی طرف بھی اشارہ کردیا۔ بیل گاڑی کے سفر سے ذیادہ انھوں نے کشتی میں سفر کو ترجیح دی اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اس نگارش نامہ میں لکھا۔ خلاصہ تحریر یہ کہ

”اس گردون دوں کی بیدار گری سے تنگ آکر میں نے خود کو دریا میں ڈال دیا۔۔ بسم اللہ مجر یہاو ُمرسٰہاکہا اور سیفنہ کوروِدِ جمنا کے سپرد کردیا۔“ ۳۵ـہ

سفر بنارس:

غالب نے اپنے پنشن کے مقدمہ کے لیے کلکتہ کا سفر کیا۔کانپور کے راستہ کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے اور پہلے باندہ پہنچے ، باندہ سے روانہ ہوکر کبھی گھوڑے پر کبھی گھوڑے گاڑی پر اور ذیادہ سفر گنگا میں کشتی کے ذریعہ الہ آباد پہنچے وہاں سے بنارس گئے ۔ غالب نے ۱۸۲۵ ءسے لے کر سے۱۸۲۷ء کے درمیان میں بنارس کا سفر کیا اور وہاں قیام کیا ۔ غالب نے الہ آباد سے بناس کا سفر کیا جس کی روداد بیان کرتے ہوئے محمد علی خان کو لکھتے ہے۔

خط کا اقتباس۔

”دوسرے دن ایک بیل گاڑی کرائے پر مل گئی۔ صبح کے وقت گنگا کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ہوا کی طرح تیزی سے پانی پر سے گزرا کے ساتھ بنارس کی طرف سرگرم سفر ہوگیا۔ جس دن بنارس پہنچا، بادۂ جانفز اور ٹھندی ٹھندی ہوا، مشرق کی طرف سے چل رہی تھی۔ جس سے میری جان کو طاقت ملی اور دل میں تازگی پیدا ہوگئی۔ اُس ہوا کے اعجاز نے اس غبار کو علم فتح کی طرح بلند کردیا۔“ ۳۶ـہ

بنارس ہندوستان کا قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ یہ شہر تہذیب اور ہندو عقائیدکے مطابق ایک مقدس ترین شہر ہے۔ یہ شہر بہت خو بصورت ہے خاص کر یہاں کے گنگا کے گھاٹ کے مناظر اس شہر کو اور خوبصورت بنادیتے ہیں۔ غالب نے بھی بنارس شہر کی تعریف میں ایک مثنوی ' چراغ دیر ' کے نام سے لکھی جو فارسی میں ہے۔ غالب نے میاں داد خان کے نام لکھے خط میں بنارس شہر اور اپنے سفر کا ذکر کیا۔

خط کا اقتباس۔

” بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی اور ”چراغ دیر“ اس کا نام رکھا وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔ اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں فتنہ و فساد کے زمانے سے بہت پہلے اُن کا خط اور کچھ اُن کا کلام میرے پاس آیا ہے تم اُن کو میرا اسلام کہنا اور میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنوء سے بنارس تک کے سفرکی سرگذشت لکھی ہے اس طرح آئندہ بھی لکھتے رہوگے۔ میں سیرو سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں۔

” اگر بہ دل نہ خلا ہرچہ از نظر گذر

زہے روانی عمرے کہ درسفر گذرد"

خیر اگر سیر وسیاحت میسّر نہیں نہ سہی ذکر العیش نصف العیش پر قناعت کے میاں درد خان سیاح کی سرگذشت سیر و سفر ہی سہی۔" ۳۷ے

غالب نے مندرجہ بالا خط میں بنارس شہر کی خوبصورتی پر ایک مثنوی لکھی۔ جس میں شہر کے حسن و جوازپر کشش نمود پر فخر وناز اظہار کیا۔ بنارس غالب کے سفر دیار مشرق کے نہایت خوبصورت تجربوں اور دل نشین تاثرات میں سے ہے انھیں جو ذہنی راحت اور روحانی خوشی ملی اس کا مقابلہ وہ دلی سے کرسکتے ہیں نہ لکھنوء سے کہ وہاں جس اُمید میں وہ گئے تھے پوری نہ ہوئی اور ان کے ذہن پر ایک سفردور دراز کا خیال اُن کے تصور حال کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ یہاں بے تکلف دوستوں کی محفلوں اور کوچہ بُرزن کی سیر سے وہ اپنا دل نہ بہلا سکے مگر بنارس کا تاثر تو عجیب ہے۔بنارس میں غالب جس خیالات میں کھوئے رہے اس خوبصورت شہر میں ان کی آنکھیں جیتے جاگتے حسنِ خواب دیکھتی رہی۔ لیکن وہاں انھوں نے شہر دہلی اور اپنے متعلقین کو بھی یاد کیا۔اور اس کو انھوں نے درو خیر اشعار کہہ کر یاد کیا اور مثنوی ' چراغ دیر ' میں اسے بھی پیش کیا۔

بنارس میں ان کی طبعیت ناساز تھی۔ لیکن تھوڑے دنوں میں طبعیت بحال ہوگی اور اب سوائے اس کے کوئی افسوس نہ تھا۔ان کے عزیز دوستوں نے انہیں بھولا رکھا ہے۔ ' چراغ دیر ' میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔بنارس کی بہت تعریف کی ہے اور شاہ جہاں آباد پر اسے ترجیح دی ۔ غالبؔ نے اس شہر سے اتنا متاثر ہو کر کہا کہ اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا۔ بنارس کے سیر وسفر کے تاثرات غالب کے ادبی ذہن اور فنکارانہ حال و خیال پر مرتب ہوئے بنارس کے ذکر جمیل کے ساتھ حسین کلام و لطف و اظہار کی وہ کیفیت غالب پر طاری ہوئی گویا '' بُت کد ے کا در کھلا '' اس کا اندزا ہمیں ان کی مثنوی 'چراغ دیر ' کے مطالعے ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے صنم پرستوں کے اس شہر آرزو کو خراج عقیدت پیش کی ہے۔ جس کا ذکر 'نامہ ہائے فارسی غالب ' میں ملتا ہے۔

خط کا ترجمہ

'' فرشتے اس کی خوشبوؤں کو اپنے شانوں پر لے کر فضائے اقدس میں پرواز کرتے ہیں اور اس کا سراپا اہل عشق وعقیدت کے تئیں نظارہ گاہ جمال ہے بنارس کے لیے کوئی کہتا ہے کہ یہ نگا رخانہ چین ہے میں اے بُت چینی کہتا ہوں اور دریا گنگا کی لہریں اس کی پیشانی پر ٹیری ہوئی شکنیں ہیں اس کے پیکر وجود کی طرزطرقہ دل آویزیوں کی وجہ سے دہلی جیسا شاہی شہر اس کی دُعا درود سے یاد کرتا ہے۔" ۳۸ے

غالب کے بنارس میں قیام کے آخری دن کی روداد کچھ اس طرح بیان کی ہے جو فارسی خطوط میں موجود ہے۔ آج کہ جمعہ کا دن ہے ایک گروہ کے نزدیک ماہِ رواں کی تاریخ ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ آج نو نہیں دس ہے میں رقتِ سفر باندھنے کی فکر میں پڑا ہوا ہوں اگر رات خریت سے گذر گئی اور میر ا وجود رہا تو کل کہ شبہ کا دن ہوگا بنارس سے رخصت ہوجاوں گا۔ جمعہ ۲۹ دسمبر ۱۸۲۷ کو بنارس سے روانہ ہوئے۔ غالب نے بنارس سے عظیم آباد تک گھوڑے پر سفر کیا پھر وہ کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔

کلکتہ کا سفر:

اپنی پنشن کے بند ہوجانے پر غالب مجبور ہوکر اس کے لیے قانونی کاروائی کرنے کے لیے غالب نے کلکتہ کا سفر کیا۔اس دور میں ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی اور حکومت کا صدر مقام کلکتہ تھا جہاں گورنر جنرل رہتا تھا اور اسکی انتظامیہ کو نسل بھی وہی تھی ۔ غالب کو اسی کونسل کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرنا تھا۔ اس مقصدکے لیے غالب بڑی پریشانی کے ساتھ کلکتہ کا لمبا سفر کیا ۔ مگر ان کا مقصد حاصل نہ ہوا کلکتہ سے نام واپس آئے۔آغاز سفر میں غالب دہلی سے کلکتہ کے لیے کب روانگی کی اس میں کچھ اختلاف ہے بعض محقیق کے خیال سے؁۱۸۲۶ء کے وسط میں دلی سے روانہ ہوئے اور بعض کی رائے ہے کہ ؁۱۸۲۸ء انھوں نے کلکتہ کا سفر شروع کیا۔کلکتہ پہنچ کر مرزا غالب نے مولوی محمدعلی کو جو خط تحریر کیا ہے اس میں راہ سفر کے علاوہ باقی ماندہ مرحلوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

" اُس سنگِ در سے جسے سجدہ عقیدت کے لیے ”مہر نماز“کہا جا سکتا ہے، اتنی دوریاں موجود ہیں۔ جنہیں قطبین کے فاصلوں سے کم قرارنہیں دیاجاسکتا ہے۔ عطوفت نامہ نے، بنارس کی خاک نشینی کے زمانہ میں میری چشم نجت کو نور اورنجت چشم کو سرور بخشا تھا۔ اس تحریر سعادت کے جواب کو۔ منجملہ مغتنمات تصور کرکے خدمت والا میں ورق بندگی روانہ کیا اور خشکی کے راستے سے عظیم آباد کا سفر اختیار کیا۔ فی الجملہ توجہ عالی کی بدولت، کہ سرچشمۂ فیوض و برکات ہے، گردِ راہ کی طرح کوہ وبیابان میں افتان وخیز اں سفر کرتے اور خارخارِ مصائب کے باعث سینہ کے بل دم تیغ سے گذارتے ہوئے کبھی شدّتِ سرما کے اثر سے یخ بستہ راتوں کے لمحات میں افسردہ خاطر اور کبھی گردشِ ایاّم کی چترہ دستیو ں سے نا لاں،بروزچہار شنبہ، رمضان المبارک کی چوتھی تاریخ کوپہر دن چڑھے، کلکتہ پہنچ گیا۔“ ۳۹ـہ

مرزا غالبؔ نے کلکتہ کے طویل راہ سفر کی داستان کو اپنے مکتوب میں بیان کیا۔ اس وقت شہر کلکتہ ہندوستان کی نئی مرکزحکومت کا دفتر تھا۔ یہ شہر مرزا غالب

کو بہت پسند آیا۔ غالب کو رہنے کے لیے جو مکان دس روپے ماہوار کرایہ پر ملا تھا وہ بہت روشن اور کشادہ تھا۔

مرزا غالب کو کلکتہ پہنچ کر سب سے پہلی فکر یہ تھی کہ وہ جلد از جلد انگریز حکاّم سے ملیں جو اُن کے مقدمہ کی کاروائی کو آگے بڑھا سکیں ۔ اس راہ میں قانونی دشواریوں اور پیچداریوں کو کم و ختم کرنے میں ان ملاقات مددگار ثابت ہوں۔ مسٹراندرواسڑلنگ انگریز افسر سے ملاقات کا ذکر غالب نے مرزا علی بخش بہادرؔ کے نام لکھے خط میں کیا۔

خط کا اقتباس۔

" مسٹراندرواسٹرلنگ کو میرے حال پر رحم آیا، ایک انگریز افسر ہے اور اعیان کو نسل میں سے ہیں۔ نیز ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگاکہ وہ دردمندوں کے چارہ ساز اور خستہ خاطروں کے غم گسا ر ہیں۔اگر چہ میرایہ دل کہ ایک مدّت سے مایوسیوں کا خوگر ہے، یکایک نا امّیدی کے رشتے کو منقطع بھی نہیں کرسکتا۔ پھر بھی یہ مردِ تو انادل اپنی کام بخشی سے کہ جادوکا سا حکم رکھتی ہے مجھ میں اور میرے احساس نامرادی میں ایک دائمی جدائی کی طرح ڈال دے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔" ۴۰ ؎

مسٹر اندرواسٹرلنگ سے غالب کی ملاقات کا ذکر اس سے پہلے ہوچکا اور ایک خط میں جو کلکتہ میں ان کے ابتدائی زمانہ قیام سے تعلق رکھتا ہے اور شہر کی تعریف بھی آئی ہے یہ اللہ پاک کی رحمتوں کے عجیب آثار میں سے ہے کہ آب وہوا نے کلکتہ مجھے پوری طرح راس آگئی ہے ۔ اس بقیہ زمین میں اس سے زیادہ آرام و راحت سے ہوں جتنا کہ اپنے وطن میں تھا۔

ایک دوسرے خط میں غالب نے کلکتہ کی آب و ہوا کی خوش گوار اور اپنی تدبیر علاج کا ذکر بھی کیا ہے۔ گرمی کی شدت کے ایام میں ناریل کا تازہ پانی قندّنیات کے اضافے کے ساتھ میری صحت کے لیے بہت سود مند ثابت ہوا لیکن اب کہ برسات کا موسم ہے میں نے اُسے ترک کردیا ہے۔مختصر یہ کہ مجھے عوارض مہمانی کی اب بالکل شکایت نہیں بلکہ اس شہر میں دہلی کی بہ نسبت مجھے ذیادہ راحت آسودگی میسر ہے۔

غالب اپنی زندگی کے سفر میں سب سے لمبا اور طویل سفر کلکتہ کا بتاتے ہیں۔ اس میں پیش آنے والی دشواریاں اور مشکلات اپنی جگہ جس میں اخراجات ایک خاص کردار ادا کرتے ہیں۔غالب نے اپنے خطوط میں جو سفروں کا ذکر کیا ۔ا س سے یہ معلوم

ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کس نشیب و فراز سے گذری ہے۔غالب کو دوسروں کا احسان لینے میں کوئی تکلّف نہیں تھا مگر اس وقت وہ قرض کی بھاری رقومات کی وجہہ سے دب گئے ان کو ابتداء میں کامیابی کی صورت نظر آئی ۔ انھوں اس بات کا خوف تھا کہ ان کی عرض مسترد نہ ہوجائے ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے والے انگریز افسروں نے بھی یہی بتایا کہ ان کا مراقعہ لائق سماعت ہے ۔ اسی وجہہ سے وہ اپنے سفر سے مسرت محسوس کرنے لگے۔ وہاں کے دستور کے مطابق غالب کی درخواست مسڑپاٹن کے سپرد ہوئی اس کا ترجمہ انگریزی میں کرکے فریز صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

غالب کی ملاقات فریز صاحب سے ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان کی عرضی صاحبان کونسل کی عرض گاہ میں پہنچے گی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالب نے اپنے پنشن کی کاروائی میں کتنی مشکلا ت کا سامنا کیا۔ اس دوران وہ اپنے اہل خانہ سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس بخوبی تھا۔ جس کا اندازہ مطالعہ ' چراغ دیر ' سے ہوتا ہے۔کلکتہ میں مرزا یوسف کو تحریر کر دہ خط سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ غالب ایک آزاد طبیعت کے اورخواہش کو اظہار کرنے والے آدمی تھے وہ آزاد زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو اپنے عزیزوں اور اہل خانہ کا بہت خیال رہتا تھا۔ اپنے بھائی یوسف کی بیماری کی وجہہ سے وہ کافی پریشان رہتے تھے۔ اس بات کی وہ خود اپنے خط میں تحریر کرتے نظر آتے وہ خط جو انھوں نے نواب مولانا محمدعلی کو لکھا ہے ۔

" مرزا یوسف سراپا ننگے رہتے تھے اور دیوانگی کی وجہ سے کسی ایک جگہ آرام سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ماں کو ماں اور بہن کو بہن نہیں سمجھتے تھے۔ ۷۲ رمضان کو مجھے دہلی سے ایک خط ملا۔ خط کے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نظر پڑتے ہی میں نے پہچان لیا کہ میرے بھائی کی تحریر ہے۔ جب میں نے غورسے دیکھا تو معلوم ہواکہ مرزا یوسف ہی کا خط ہے، جواس نے خود لکھا ہے۔ اس میں القاب و آداب پوری ہوش مندی کے ساتھ لکھے گئے تھے۔ میں خوشی سے ناچنے لگا۔ اتنا خوش ہوا کہ روپڑا۔"
۴۱ے

غالب جب کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو نواب محمد عالی خاں نے کلکتے کہ ایک صاحب بزرگ علی اکبر خاں کے نام غالب کا ایک تعارفی خط دیا تھا۔غالب کلکتہ میں دو دن آرام کرنے کے بعد نواب علی اکبر خاں کو ملنے روانہ ہوئے جو ہُگلی میں رہتے تھے، جہاں جانے کے لیے کشتی کا استعمال کرناپڑتا تھا۔غالب نواب علی اکبر خاں کے حویلی پہنچے انھوں نے غالب کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا۔غالب نے نواب علی اکبر خاں سے اپنے کلکتہ آنے کا مقصد بیان کیا۔ نواب صاحب نے کوئی ایسی

اُمیدنہیں دلائی جس سے غالب خوش ہوتے اور نہ ہی ایسا نہ اُمید کیا کہ غالب اپنے مقصد سے دست بردار ہوجاتے۔غالب وہاں سے اس اُمید سے واپس نکلے کہ نواب صاحب کا کلکتہ میں بڑی حیثیت اور رسوخ ہوں گے۔ یہ غالب کی بدنصیبی ہے کہ علی اکبر خاں کا حکومت سے اختلاف ہوچکا تھا۔محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالب نواب علی اکبر خاں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" کافر ہوں اگرکلکتے سے دہلی تک میں لطافت طبع، نزاکت ادا، حسن بیان اور فہم درست والا ایسا کوئی امیر بزرگ دیکھاہو۔ (نواب صاحب) صالح کبھی ہیں اور مصلح بھی لیکن ان میں مولوی محمد علی خاں والی بات کہاں کہ مجھ جیسے عاجزو لاچار کے کام آسکیں۔ ۴۲ے

غالب نے گورنر جنرل سے ملاقات کی درخواست کی جو گورنر نے منظور کرلی یہ اطلاع گورنمنٹ کے سکریڑی کے عملے کے نائب میر منشی نے غالب کو خط کے ذریعے دی کہ اُن کی عام حاضری طے پاگئی۔دوسرے دن غالب سکریڑی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ انھیں بھی دربار میں بلایا جائے۔ غالب کی یہ درخواست منظور کرلی گئی۔غالب نے اس کا ذکر ایک خط میں کیا۔

خط کا اقتباس۔

"جب میں نے دیکھا کہ سکریڑی میرے حال پر بہت کرم فرمارہے ہیں تو میں نے خلعت کی آرزو کا اظہار کیا۔کچھ دیرسوچ میں پڑے رہے۔ پھر سر اُٹھا کر دلفریب انداز میں کہا۔ اے فلانے اس وقت خلعت کی گنجائش نہیں ہے۔" ۴۳ے

غالب دربار میں حاضر ہوئے۔ نواب اکبر علی خاں دربار نہیں آسکے اُن کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے ان کی کرسی خالی تھی۔ غالب نے گورنر جنرل کو دو اشرفیاں بطور نذر پیش کیا اور انھیں اپنا پنشن بند ہونے کا اور خلعت نہ ملنے کا ذکر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کو خلعت نہیں ملا تھا۔یہ صرف اِن کی آرزو تھی۔

غالب اپنے پنشن کی کاروائی کے سلسلہ میں وہاں گئے تھے اس میں ان کو ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا افسوس لیکن ان کو اس سفر سے بہت سے فائدے بھی ہوئے وہ یہ کہ انھیں مولوی سراج الدین احمد خان ، نواب اکبر علی خان ، ابوالقاسمؔ اور منشی محمد حسین جیسے اچھے دوست ملے۔ غالب کو کلکتے کے مشاعروں اور محفلوں میں شریک ہونے کا مواقع ملا۔جہاں اُردو اور فارسی زبانوں کے شاعر کے کلام سے متاثر ہوئے انھوں نے اپنے فارسی اشعار بھی پیش کئے۔ کچھ غالب کے فارسی اشعار میں کچھ غلطیاں نکلی۔ ہندوستانی فارسی شاعر قیلؔ اور واقفؔ سے مشہور سمجھے جاتے تھے۔

لیکن غالب ان کو کم تر سمجھے تھے غالب کے نزدیک صرف ایران کے باکمال فارسی عالموں اور شاعروں کی اہمیت تھی وہ ان کو ہی مانتے تھے۔ انھوں نے اس کا جواب سختی سے دیا اور وہاں ایک ہنگامہ برپا ہوا۔اس کے باعث غالب کی وہاں شہرت پھل گئی۔ اور غالب نے اس واقعہ کو ایک فارسی نظم میں بیان کیا جو مثنوی کی شکل میں موجود ہے اور اسکا نام ' ' یاد مخالف '' رکھا ہے۔

مرزا افضل بیگ کوانگریزوں سے غالب کے دوستانہ تعلقات دیکھکر یہ محسوس ہوا کہ پنشن کا مقدمہ غالب کی حق میں ہوجائیگا اور ان کی سگی بہن کے بچے پنشن سے محروم ہوجائیگے۔ اس لیے مرزا افضل بیگ نے غالبؔکی عزت و وقار کو ٹھیس پہنچے اور پنشن کا مقدمہ غالب کے خلاف ہواس لیے مرزا افضل بیگ مذہبی محاذ پر بھی غالبؔپر حملے کیے۔

بقول غالبؔ۔

”مرزا افضل بیگ میرے ساتھ پوشیدہ دشمنی رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اہل سنت میں مجھے کٹرر افضی اور اہل تشیع میں صوفی وملحد وزندیق مشہور کردیا۔“ ۴۴؎

مرزا افضل بیگ کا مقصد یہ تھا کہ سنّی و شیعہ دونوں فرقے غالبؔکے خلاف ہوجائے اور برطانوی حکومت کے افسران کے نزدیک غالبؔ کو بدظن کردیا جائے لیکن مرزا افضل بیگ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملی۔ مرزا افضل بیگ نے غالبؔ کو عوام و خواص کی نظر میں کم علم ثابت کرنے کے لیے مشاعرے کا حربہ استعمال کیا تھا۔ادبی معرکے کے سلسلے میں تین مشاعرے منعقد ہوئے تھے ان مشاعروں کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہیں۔

غالبؔ نے ادبی معرکے کے سلسلے میں جس میں پہلے مشاعرے میں شرکت کی وہ یکم جون ۱۸۲۸ء کو مدرسہ عالیہ میں منعقد ہواتھا۔اس کا ذکر غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں کیا۔

” اس شہر کے نکتہ رس اور سخن ور افراد نے اس خاکسار کے وردو سے پہلے ہی ایک انجمن بنارکھی ہے ہر ماہ انگریزی شمسی کے پہلے یک شنبہ کو یہ اہل قلم اور مدرسہ کمپنی بہادر کے ادبا اور اہل علم یہاں جمع ہوتے ہیں اور ہندی وفارسی غزلیں پڑھتے ہیں۔“ ۴۵؎

ادبی معرکے کادوسرا مشاعر ۸ جون ۱۸۲۸ء مدرسہ عالیہ میں منعقد ہوا۔

بقول غالبؔ۔

”دس بـارہ اشـعار میں نے بھی اس ردیـف قـافیے میں لکھے اور مشـاعرے میں پـڑھے۔“ ۶۴ـہ

مشاعرے میں تو سامعین نے خاموشی سے غالب کی غزل سن لی اور وہاں کسی نے اعتراض نہیں کیا لیکن مخالفین نے غالبؔ کے ایک شعر پر نکتہ چینی کرکے خود کو اربابِ ذوق کی نظر میں رسوا کیا ہے۔

۱۵ جون ۱۸۲۸ء کو تیسر ا مشاعرہ منعقد ہوا۔اس مشاعرہ میں غـالب نے طے کیـا تھا کہ وہ کم علم والے سامعین کے منہ نہیں لگیں گے۔ لیکن اس مشاعرے میں بھی غالب کے ’ ہم عالم ’ ترکیب پر اعتراض کرتے ہوئے کسی نے اسے قتیلؔ کی تصـانیف ’ چـار شربت ’ میں یہ نہیں بتایا گیـا کہ ’عـالم ’ کلمہ مفـرد ہے اسلئے ’ ہمہ ’ کی تـرکیب درسـت نہیں۔غالب نے اپنا موازنہ قتیل ؔسے کرنے پر اعتراض کیا۔ بقول غالبؔ

”لیکن چوں کہ حق کی حمایت کرنا اور حق کے لیے جنگ کرنا ہر ایک متنفس کے لـیے فطری امر ہے۔ مجھے بھی قدرے غصّہ آگیا اور میں مشاعرے کی تیسری نشست میں ان اعتراضات کا جواب دینے پر آمادہ ہوگیا۔“ ۴۷ـہ

غالب نے اپنی زندگی میں جو سب سے بڑا سفر کیا وہ دہلی سے کلکتہ تک کـا تھـا اس کے علاوہ اُنھوں نے جو سفر کئے ان کا بھی مختصر حال بتانا مناسب ہوگا دہلی سے آگرہ تو ان کا آنا جانا کئی بار ہوا۔ اس کے علاوہ دہلی سے فـیروز پـور جھـرکہ اور لوہـا رو بھی کئی بار گئے۔

سفر رام پور:

غالب نے دوبار رام پور کا سفر کیـا۔ پہلی مـرتبہ جنـوری ۱۸۶۰ء کـو رام پـور گئے وہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ نواب رام پور سے کچھ مالی مدد حاصل ہوجائے۔ اس سفر کے لیے غالب ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے روانہ ہو ئے اور ۲۰ جنـوری میرٹھ پہنچے وہاں نواب مصطفی خان شائستہ کے یہاں قیام کیا۔ وہاں سے شاہ جھـان پـور اورگڑھ مکٹیشر ہوتے ہوئے مراد آباد گئے۔ مـراد آبـاد سے رام پـور ۲۷ جنـوری ۱۸۶۰ء کو وہاں پہنچے ۔ آخر مارچ ۱۸۶۰ء تک وہاں قیام کیا۔ نواب رامپور نے ان کـو بہت عزت و احترام سے اپنے یہاں ٹھرایـا۔ وہـاں کی علمی و ادبی محفلـوں میں غـالب کی شرکت پیش پیش رہی۔ محفلوں کی رونق کو غالب نے اپنے موجودگی سے بڑھا دیا۔

غالب نے رام پور جانے کی اطلاع اپنے ایک خط جو ہرگوپال تفتہ کو لکھا۔

خط کا اقتباس۔

ھائی،

"میں دلی کو چھوڑ اور رام پور کو چلا۔ پنچشنبہ اُنیس کو مراد نگر اور جمعہ بیس کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ اکیس کو بھائی مصطفےٰ! خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہجہاں آباد، پر سوں گڑھ مکٹیشر رہوں گا پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔ اب جو مجھ کو خط بھیجو رام پور بھیجنا۔ سرنامہ پر رام پورکا نام اور میرا نام کافی ہے اب اسی قدر لکھنا کافی تھا۔ باقی جو کچھ لکھنا ہے، وہ رام پورسے لکھوں گا۔" ۴۸؎

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں مسندنشین ہوئے توغالب نے قطعۂ تاریخ جلوس لکھ کر بھیجا،وہاں سے اُس کا کوئی جواب نہیں آیا۔نواب یوسف علی خاں سے غالب کے تعلقات کی تجدید مولانافضل حق خیرآبادی نے کرائی تھی جب نواب یوسف علی خاں دہلی میں قیام تھے اور ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔۵ ۔ ؍ فروری۱۸۵۷ء کو نواب یوسف علی خاں نے اپنے اشعار کی اصلاح کے لیے غالب کو بھیجے تو غالب نے بھی اس کے جواب میں ۱۱؍ فروری کو مدحیہ قصیدہ لکھ رام پور بھیجا۔

۱۸۷۵ء کی جنگ آزادی نے سارے ملک میں ہنگامہ برپاکردیا تھا۔اس وقت نواب یوسف خاں نے حکومت برطانیہ کا ساتھ دیا اور اپنے علاقہ روہیل کھنڈ انگریزوں کی انتقامی کاروائی سے بچا لیا۔نواب یوسف علی خاں ادبی ذوق رکھتے تھے ۔ اُن کوناظم تحلّص غالب ہی نے تجویز کیا تھا وہ شاعروں کے قدر دان تھے اور آگے چل کر غالب کے شاگرد ہوگئے تھے۔ جولائی ۱۸۵۹ء سے غالب کو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ یوسف علی خاں ناظم کی مدح میں غالب نے چار قصیدے لکھے۔

دوسری مرتبہ غالب ماہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور گئے۔نواب یوسف علی خاں کی وفات ۲۱؍ اپریل ۱۸۶۵ء میں ہوئی۔ان کے وفات کے بعد نواب کلب علی خاں اُن کے جانشین ہوئے تو حکومت برطانیہ سے خلعت و خطاب ملا۔ د سمبر ۱۸۶۵ء کے پہلے ہفتہ میں جشن ہوا تھا ۔ اس جشن کو غالب نے " جشن جمشیدی " کہا ہے ۔ نواب کلب خان نے عزت و احترام کے ساتھ ٹھرایا اور اپنے جشن تخت نشینی میں مدع کیا۔ یہ تمام باتوں کا ذکر غالب نے اپنے جو علاء الدین احمد خان علائی کولکھا۔

"یہاں جشن کے وہ سامان ہورہے ہیں کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا شہر سے دوکوس پر آغا پور نام ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے پرسوں صاحب کمشزبہادربریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خمیوں میں اُترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان کل سہ۵ دِسمبر حضور پرٗ نور بڑے تجمّل سے آغا پور تشریف لے گئے ممکن دو بجے گئے۔ اور شام

کو پانچ بجے خلعت پہن کرآئے۔ وزیر علی خان سا ماں،سے باتیں میں سے روپے پھنیکتا ہوا آتا تھا۔ ۴۹ـہ

غالب نے اس خط میں شہر رام پور کی شان و شوکت اور نواب کلب علی خاں کے تخت نشینی کا پورا خاکہ کھینچا ہے۔ اس خط کے مخاطب خود کلب علی خاں نہیں بلکہ غالب کے عزیز شاگرد ہیں اس لیے منقولہ اقتباس کو غالب کے حقیقی جذبات کا ترجمان سمجھنا چاہیے۔

غالب کی رام پورکی چاہت کا سلسلہ اور فرماں روائے ریاست سے غالب کے کاروباری اور اقتصادی رابطوں سے آگے بھی جاتا ہے۔ میر مہدی مجروحؔکے نام ایک خط میں غالب نے اس شہر کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

خط کا اقتباس۔

” ہا ہا ہا! میر پیارا میر مہدی آیا آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اُس کا نام ہے بے شبہ چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔ تمھارا خط پہنچا ترددعبث۔ میر مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے نہ عُرف لکھنے کی حاجت نہ محلّے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجئے اور جواب لیا کیجئے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب اور صحت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں۔دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر ہیں کوئی وقیقہ فروگذاشت نہیں ہے لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔“ ۵۰ـہ

ان مکتوبات کے ذریعے غالب کی نثر اور ان کی سوانح کے ایک باب ، ریاست رام پور سے ان کے تعلق اور اس شہر کی متعلق ان کی رائے ان سب پر روشنی پڑتی ہے۔غالب نے اپنے مکاتیب کے توسط سے اُردو میں نثر کا جو معیار قائم کیا وہ ہر لحاظ سے غیر معمولی ہے۔ شہر رام پور کے سلسلے میں غالب کا رویہؔ ایک آگرہ، کلکتہ، دلّی اور بنارس کو چھوڑکر ان کے خطوط

میں شہر رام پور کی ایک امر نشاندہی ہوتی ہے۔رام پور غالب کے لیے ایک شہر یا بستی نہیں بلکہ ایک تجربہ بھی ہے جو ان کے احساسات پروارد ہوا۔رام پور کے تذکرے میں غالب کے یہاں ایک وارفتگی، نشے کی سی ایک کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔رام پور سے غالب کے روابط اور رشتوں کی اس روداد میں غالب شناسی کی اس غیر معمولی روایت کے رنگ بھی شامل ہیں ۔ غالب کے خطوط میں زندگی اور موجودات سے ان کے براہ

راست، کھرے اور سچّے رشتوں کی تصدیق انہی واسطوں سے ہوتی ہے۔ زندگی کی عظمت اور حقیقت تک رسائی، زندگی کے عام تجربوں،معمولات اور چاروں طرف بکھری ہوئی بہ ظاہر اور اہم مانوس اشیاسے تعلق کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے غالب کے یہاں ان حوالوں کی موجودگی دراصل زندگی اور کائنات کی طرف ان کی مجموعی روےّے کا پتہ دیتی ہے۔

میرٹھ کا سفر ۔

غالبؔ جنوری آخر ۱۸۵۹ء اپنے دوست نواب مصطفی خان شیفتہ سے ملاقات کے لیے میرٹھ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ نواب مصطفی خان شیفتہ کا شمار اُس وقت بڑے بلند مرتبہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان پر انگریزوں کی مخالفت کا الزام لگاکر مقدمہ چلا اور عدالت نے ان کو سات سال کی قید کی سزا سنائی ۔ جب عدالت کو ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا تو رہائی دی گئی۔ اور اس رہائی کی مبارکباد دینے کی لیے غالب میر ٹھ گئے تھے۔ اور تین یوم وہاں قیام کیا۔ اور ۲۵ جنوری کو دہلی واپس آگئے۔

اس بات کا ذکر غالب نے مرزا ہر گوپال تفتہؔ کے نام ایک خط تحریر کیا اور اس میں میرٹھ کا ذکر کیا۔

” صاحب!

تمہارا خط مع رقعہ مردِ سخن فہم پہنچا۔ تمہاری خوشامدنہیں کرتا، سچ کہتا ہوں کہ تمہارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔جو اب میں درنگ اس راہ سے ہوئی کہ مصطفےٰ خان کی ملاقات کو بہ سبیلِ ڈاک میرٹھ گیا تھا۔تین دن وہاں رہا، کل وہاں سے آیا، آج تم کو یہ خط بھیجوایا۔“ ۵۱ ؎

محراہ و مرسلہ چہار شنبہ ۲۶ جنوری۵۹ ۱۸ء

سفر باندہ:

غالبؔ نے جون ۱۸۲۷ء کے اواخر میں باندہ کا سفر کیاتھا۔ جب غالبؔ لکھنؤ میں تھے تب ہی غالب نے کلکتہ کے سفر کا اِ رادہ کر لیاتھا۔ انھیں کے دل میں یہ خیال تھا کہ معتمدالدولہ اور شاہ اودھ غازی الدین حیدر سے انعام و اکرام کے صورت میں کچھ مل جائے گی جس سے وہ لکھنؤ سے کلکتہ کا سفر کرسکیں گے۔ جب غالب کو معتمد الدولہ سے کچھ نہ ملا تو اُنھوں نے سونچا کہ وہ لکھنؤسے کان پور اور کان پور سے باندہ جائیں گے۔

قدیم وجدید بندیل کھنڈ اور اُن کے معروف اصلاح کی بحث سے قطع نظر محض ضلع باندہ کو جغرافیائی اعتبار سے دیکھیں تو خشک چٹیل پہاڑیوں سے گھِرا ہوا خطہ اپنے محدودوسائل کی بنا پر پسماندہ رہا ہے۔ تاریخی اعتبارسے بھی یہ علاقہ ڈھند لکے میں رہا ہے۔ اس کے مثال میں دریائے جمنا، جنوب میں وِندھیا چل کی پہاڑیاں ، مشرق میں فتح پور اور ہمیر پور، مغرب میں کالنجراور موجود میں مدھیہ پردیش کا علاقہ ہے۔

غالب نے نواب انورالدولہ سعدالدین خاں شفقؔکے نام ایک خط میں لکھامورخہ ۱۸۵۳ء

خط کا اقتباس۔

"میرا بھائی ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقاربہادر کے حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھااور مسند نشین حال چچاتھا اور وہ میرا ہمشیربھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھاوہ باعث ہوا تھامیرے باندابوندیل کھنڈآنے کامیں سب سامان کرلیا۔" ۵۲ے

غالب کویہ اُمید تھی کہ اُنکے رشتہ دار نواب ذوالفقار بہادر اُن کا علاج کرادیں گے اور ان کے سفر کلکتہ کے اخراجات کا بھی انتظام کردیں گے۔غالب نے باندہ جانے کے بارے میں گورنر جنرل کو پیش کی جانے والی عرض داشت میں لکھا ہے۔

"چونکہ میرے اور نواب ذولفقار علی بہادر کے آباواجداد میں دوستانہ مراسم زمانہ قدیم سے چلے آرہے تھے اور میرے دل میں بھی نواب بہادر کے لیے بڑی محبت اور لگاؤ تھا اس لیے میں نے ایسی تدبیریں شروع کردیں جس طرح بھی بن پڑے میں بندیل کھنڈ میں باندے پہنچ جاؤں۔" ۵۳ے

باندہ میں غالبؔ کے ایک اور رشتہ دار مرزا اوزبک خاں بھی تھے۔ یہ نواب باندہ اور غالبؔ دونوں کے ہمشیرتھے اور غالبؔ کی ممانی کے صاحب زادے تھے۔مرزا اورزبک خاں کے بڑے بھائی مرزا مغل خاں بھی باندے میں تھے۔

نواب ذوالفقار علی خاں نے اپنے مہاجن سیٹھ امی کرن سے دو ہزار روپے قرض غالبؔ کو دلوادیا۔ غالب باندہ میں چھ مہینے گزار نے کے بعد صحت یاب ہوکر الہ آباد ہو کر سفرکلکتہ کے لیے روانہ ہوگئے۔

عادات و اطوار

حلیہ و لباس:

غالب کا اچھے قدوخال کے آدمی تھے۔ جوانی میں وہ بہت خوبصورت تھے۔ مرزا کا قد لمبا، جسم سڈول اور چہرہ کتابی تھا دیکھنے والا متاثر ہوجاتا۔ رنگ سُرخ و سفید، آنکھیں بڑی بڑی اور پلکیں گھنی، پیشانی چوڑی کیونکہ کے وہ سرزمین توران کے باشندے تھے جو صحت و طاقت اور مردا نہ حُسن کا نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ غالب نے اپنے جوانی کا حلیہ مرزا حاتم علی کو لکھے خط میں بیان کیا۔

" میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔تمھارا گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرارنگ چنپئی تھا اور دیدہ در لوگ اس کی ستایش کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ ساپھر جاتاہے۔" ۵۴ے

غالبؔ جوانی میں ڈاڑھی منڈواتے تھے، مگر جب بالوں میں سفیدی بڑھ گئی تو انہوں نے ڈاڑھی رکھ لی۔ قد لمبا تھا لیکن بڑھاپے میں کمر ذارسی جھک گئی تھی، کپڑے بچپن سے ہی نہایت اچھے اور صاف سُتھرے پہنتے تھے اور آخری عمر تک لباس کے معاملہ میں اپنی نفاست پسندی کو نہیں چھوڑا۔غالب جب گھر پر ہوتے تھے تو عام طورپر جو دہلی کے رئیس اور معزز لوگ پہناکرتے تھے وہ لباس پہنا پسند کرتے تھے، یعنی ایک برکا پائجامہ، کھُلی آستین کا کرُتا ، سر پر ململ کو گول ٹوپی جس پر کامدانی یا کشیدہ کاری کا کام ہوتا تھا۔ جاڑے کے دنوں میں گرم کپڑے کا کالی دار پائجامہ اور مرزئی پہنتے تھے۔جب گھر سے باہر جاتے تو تنگ مُہر کا پائجامہ کُرتا اور اس پر جامہ دار کپڑے کی اچکن پہنے کر نکاتے تھے۔ اور سب سے اُوپر کِسی اچھے

اور خوبصورت اور قمتی کپڑے کا چُغہ پہنا کرتے تھے، ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی تھی، کبھی کبھی شال کا رومال بھی کاندھے پر ڈال لیتے تھے، اور سر پر پوستن کی چوگوشیہ ٹوپی یا کلاہ پا پاخ پہنتے تھے، یعنی وہ اونچی سیاہ ٹوپی جو غالبؔ کی سب زیادہ رائج اور پسندیدہ تصویر میں نظر آتی ہے۔لیکن جب وہ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچے تو اُن کے ڈاڑھی کے بال سفید ہونے لگے جس کا ذکر غالبؔ نے مضحکہ انداز میں ایک خط جو مرزا حاتم علی مہرؔ کو لکھا ہے۔

خط کا اقتباس ۔

"جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہواکہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچارمسی بھی چھوڑ دی اورڈاڑھی بھی۔ مگر یہ یا د رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک دردی ہے عام ملاّ۔ حافظ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقّہ بھٹیارہ۔ جو لاہہ، کنجڑا مُنہ پر ڈاڑھی سر پربال۔ فقیرنے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر منڈوایا۔" ۵۵ے

مرغوب غذا:

غالبؔ کو کھانے پینے کا شوق تھا۔ دنبے اور بکرے کا گوشت غالب کو بہت پسند تھااور وہ کھانے پر ہر روز گوشت ضرور کھاتے تھے۔گوشت کے کباب کا بہت شوق تھا۔ترکاریاں کا استعمال غالب کم ہی کیا کرتے تھے۔گوشت اور کباب میں چنے کی دال ضرور ڈالتے۔غالب کو دوپہر کے کھانے میں آدھ سیر گوشت ضرور ہوتا تھا۔جب عمر بڑھی اور معدہ کمزور ہوگیا تو گوشت کی مقدار بھی کم ہوگئی۔اگر صحت خراب ہوتی تو رات کا کھانا ترک کردیتے۔ صرف دن کے کھانے میں سیر بھر گوشت اور تین چار شامی کباب کھالیتے تھے۔ان کی غِذا کا حال خود ان کے خطوط میں تفصیل سے ملتا ہے۔ غالب مولوی حبیب اللہ خاں کو لکھے خط میں ذکر کرتے ہے۔ خط کا اقتباس۔

" غذا صبح کو سات بادام کا شیر رہ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر میں سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب چھ گھڑی رات گئے۔" ۵۶ـ

غالب کو پھلوں میں آم سب سے زیادہ پسندتھا۔ انگور بھی بہت مرغوب تھے۔غالب نے آم کی اپنے نظم و نثر میں بہت تعریف کی ہے۔ ان کو بنگال کے آم بہت پسند تھے۔ کلکتہ کے سفر کے دوران غالب کو آم کھانے کا موقع مِلاتھا۔ غالب کے دوست احباب غالب کو آم کی ٹوکری تحفہ لا کر دیتے تھے۔آم کا ذکر غالب منشی میاں داد خاں کو لکھے خط میں کرتے ہے۔

خط کا اقتباس۔

" آم مجھے بہت مرغوب ہیں انگور سے کم عزیز نہیں۔ لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت مالدہ کا آم یہاں پیوندی اور ولاتیی کرکے مہشورہے اچھاہوتاہے کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دلّی آم بھجتے محض تکلف ہے روپیہ کے آم اور چار روپیہ محصول ڈاک اور پھر سو میں شاید دس پہنچیں۔ میرے سر کی قسم کبھی ایسا اردہ نہ کرنا۔ یہاں ویسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوشبوافراط سے ہیں۔پیوندی آم بہت ہیں۔رامپور سے نواب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثربسبیل ارمغاں بھیجتے رہتے ہیں۔" ۵۷ـ

مرزا غالب کا آم کا ایک قصہ یہ ہے کہ ایک روز بہادرشاہ ظفر آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ تھے جن میں مرزا بھی شامل تھے۔ آموں کے باغ میں ٹہل رہے تھے کہ مرزا غالب کی نظر ایک آم سے لدرہے درخت پر پڑی۔اس باغ کے آم صرف بادشاہ ، سلاطین، بیگمات کے سوا کوئی تیسرا نہیں کھا سکتا تھا۔مرزا آم کی طرف بار بار دیکھتے تھے تو بادشاہ نے پوچھا، '' مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے

ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا،آم کو دیکھتا ہوں کہ کس دانے پر میرا اور میرے باپ داد کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں''،بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک عمدہ عمدہ آموں کی ٹوکری مرزا کو بھجوائی۔ ۵۸ے

آم کے مطالق ایک اور قصّہ یہ بھی ہے کہ غالب کے دوست حکیم رضی الدین خاں جنہیں آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے، اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے ہاکتا ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑدیے۔ حکیم صاحب نے دیکھتے آم ایسی چیز ہے جیسےگدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بیشک گدھا ہی نہیں کھاتے۔ ۵۸ے

شراب نوشی:

غالبؔابتدائی سے شراب پینے لگے تھے، اُس بُری عادت غالب کی صحت خراب کردی اس لیے غالب چاہتے تھے کی وہ ولایتی شراب ملے۔ ولایتی شراب کے لیے غالبؔ شاگردوں اور بعض دوستوں سے مدد لیتے تھے، مگر غالب نے شراب کھلے عام کبھی نہیں پی۔ابتدائی میں غالب شراب کئی مرتبہ نوش کرتے تھے،مگرجب دوستوں اور لوگوں نے سمجھایا کہ اس کے صحت پر بُرا اثرپڑتا ہے پھر بار بار پینا ترک کردیا، صرف رات میں پی لیا کرتے تھے اور مقدر بھی کم کردی تھی۔ غالبؔ زندگی کے آخری دور میں شراب کی تیزی کم کرنے کے لیے اس میں عرق گلاب ملایا کرتے تھے۔غالب نے اس بات کا ذکر ایک خط جو مولوی منشی حبیب اللہ خاں ذکاؔکو لکھا۔

خط کا اقتباس۔

” غذا مفقود ہے صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر۔دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سر شام تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اُسی قدر گلاب حزف ہوں۔“ ۵۹ے

اس طرح مہر مہدی مجروحؔ کا ایک شعر ہے جس میں وہ غالب کی شراب میں گلاب ملانے کو پیش کرتے ہیں۔ شعر

”غالب آئے ہیں لاؤ اے مجروحؔ

بادہ ناب میں ملا کے گلاب“

مرزا غالبؔکو مدّت سے رات میں سوتے وقت کسی قدر شراب پینے کی عادت تھی۔ جو مقدر شراب کی مقرر کرلی تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔غالب جس بکس میں بوتلیں رکھتے تھے اُسکی کُنجی داروغہ کے پاس ہوتی تھی، اور اُس کو سخت تاکید

تھی کہ کبھی مجھ زیادہ پینے کی خواہش ہوتو ہزگز نہ مانناوار کُنجی نہیں دینا اس پر غالب داروغہ پر ناراض ہوجاتے تھے۔

غالب اور ایک خط میں شراب کا ذکر ملتا ہے جو مولوی منشی حبیب اللہ خاں ذکاؔکو لکھا۔

خط کا اقتباس۔

”آج میرے پاس نقد بکس میں ۴ بوتل شراب اور ۳ شلیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔“ ۶۰ے

مرزا نے شراب کا ذکر اپنے خطوں میں کئی جگہ کیا ہے۔ شراب کو وہ کافر کہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ‘‘کافرشراب منہ لگی کہ آخر دم تک نہ جھوٹی’’باغ دودر کے ایک قطہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات سے دو تین مہینے پہلے انھیں نے چند دن کے لیے شراب پینا چھوڑ دی تھی۔غالب کے احباب میں سے دو شخصوں نے ان کو شراب پینے سے منع کیا لیکن وہ ان کی باتوں میں نہیں آئے اور شراب ترک نہیں کی اس پر انھوں نے اور چال چلی یعنی جس دکان دار سے غالب شراب ادھار منگویا کرتے تھے اسے بہکایا، اور اتفاق سے اُس دکاندار کا غالب پرغرض بھی زیادہ ہوچکا تھا۔ جب غالب نے اس سے اور اُدھار دینے کو کہا تو اس نے انکار کردیا۔ دوسری دکان سے پینے کے لیے ان کے پاس دام نہیں تھے کچھ دن ہونے کہ بعد پھر پینا شروع کردی۔شام کے علاوہ دن کے بعض اوقات بھی پی لیتے تھے۔کبھی صبح ازطعام چاست یا قریب شام جب جی چاہا تین چار گلاس پی لیتے ۔لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ اس سے نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اپنے دوست خیام کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے دن کا پینابالکل ترک کردیا اور صرف شام میں مختصر مقدار میں پیتے تھے۔ یہ سلسلہ آخر دم تک رہا۔اگر شام میں شراب نہ پیتے تو اُن کو رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ شروع میں روزانہ پاؤ بھر کے قریب پیتے تھے آخری ایام میں جب صحت خراب ہوگئی اوربیمار رہنے لگے۔تو یہ مقدار کم کر کے صرف چند تولے رہ گئی اس میں بھی دوتین حصے گلاب جل ملایا کرتے تھے۔ چناچہ خود اُن کے اشعار میں یہ بات ملتی ہیں۔

اسودہ باد خاطر غالب کو خوے ادست

آمیختن بہ بادہ صافی گلاب

دْرد اشام، غالب نام، درساقی گری

پارہ مشک و گلاب افزودرد صہبائے من

ایک خط میں غالب انگریزی شراب کا ذکر کرتے ہیں جو بابو ہر گوبند سَہائے نشاطؔ کو لکھا ہے۔

خط کا اقتباس۔

”دوقسم کی انگریزی شراب، ایک تو کاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام، یہ میں ہمشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپیے، حدچوبیس روپیے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر ہی نہیں آتی تھی، اب پچاس روپیے اور ساٹھ روپیے درجن آتی ہے، وہاں تم دریافت کروکہ اس کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ با طریقِ ڈاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟ ہو تو یہاں سے روپیے کی ہنڈوی بھیج دوں ارو تم خرید کر بیل گاڑی کی ڈاک پر روانہ کردو۔ جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے ار یہ گڑچھال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔“ ۶۱ـہ

بعض حالات سے انداز ہ ہوتا ہے کہ غالبؔکو اِس بْری عادت کا احساس اور افسوس تھا مگر شراب کی عادت ایسی پختہ ہوگئی تھی کہ چھوڑنا مشکل تھا ، یہ عادت غالب کے آخر عمر تک نہیں چھوٹی اس کا ذکر غالبؔ نے اپنے کئی خطوط اور اشعار میں کیا ہیں۔

شوخی و ظرافت:

غالبؔ کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔غالب ایک طرف تو وہ مالی پریشانیوں ،تنگ دستی، علا لت وبیمار ی،قرض خواہیوں کے تقاضے سے پریشان رہتے تھے، مگر دوسری طرف ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے تھے۔ غالبؔ کبھی بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کوئی پریشانی میں ہے بلکہ بے فکراپن ظاہر کرتے تھے اور ہرفکر و پریشانی کو مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

غالب کے خطوط میں ادبی خلوص ، بے تکلفی اور بے باکی موجود ہے۔ ان کے خطوط کی تحریر اتنی مزاحیہ اور دلکش ہوتی ہے کہ غالب اپنی زندگی کے ذاتی اور نجی مسائل بھی مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں۔ خطوط میں جو خیالات اور ماحول کی تصویر ملتی ہے اُن سب میں غالبؔ کی اپنی زندگی کی تصویریں دکھائی دیتی ہے۔وہ لوگوں کو خط لکھتے ہیں تو ان سے اس درجہ قریب ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی یہ باتیں دلوں کا بھانے لگتی ۔ ہر شخص ان سے

اتنا قریب ہوتا ہے کہ اجنبیت کا تصور ہی ختم ہوجاتا ہے۔غالب بہت کم بولتے تھے لیکن جوکچھ ان کی زبان سے نکلتا وہ لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔غالب کے خطوط میں شوقی اور ظرافت کے کئی نمونہ ملتے ہیں۔

ایک اور خط جو ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ ؁ء کی آخر تاریخوں میں لکھا ہے۔ انھوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کو پہلی یا دوسری تاریخ کو لکھا بھیجا ہے اس کے جواب میں غالبؔ اُن کو لکھتے ہیں۔

خط کا اقتباس۔

"دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۸۵۸۱ء کے جواب ۹۵۸۱ء میں بھیجے ہو۔ اور مزہ یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا۔ تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔" ۶۲ ؎

غالب کے مزاج میں بلاکی شوخی اور ظرافت تھیں اس بات کا اندازا اُن کے خطوط کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ میر مہدی محروحؔ کے نام لکھے ایک خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔

خط کا اقتباس۔

"وبا کو کیا بوچھتے ہو قد رانداز قضا ئے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسابڑاوباکیوں نہ ہو لسان الغیب دس برس پہلے فرمایا تھا، شعر

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ نا گہانی اور ہے

میاں ۷۷۲۱ ؁ ء کی با ت غلط نہ تھی میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسرشان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔" ۳۶ ؎

منشی سیف الحق میاں داد خان سیاحؔ کے نام لکھے خط میں غالب کی شوخی وظرافت ملتی ہے ۔

خط کا اقتباس۔

" فقیر کی طرف سے سلام دعا قبول کریں۔ چھوٹے صاحب کی تصویر کی رسید میں بھائی محمد حسین خان سے کہا گیا تھا کہ تم تصویر کے پیونچنے کی اطلاع دینا۔ سواب تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اطلاع دی ہے حال تصویر کا یہ کہ میں نے اُسے سرپر رکھا آنکھوں سے لگایا گویاچھوٹے صاحب کو دیکھا لیکن اس کا سبب نہ

معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر دیدار تو میسّر ہوا۔ گفتار بھی اگرخد ا چاہے گا تو سُن لیں گے۔دیکھو منشی صاحب! آ ئینہ کی تصویر کی صنعت کو سب پسند کرتے ہیں مگر فقیر اُس کا معتقد نہیں، اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیو ں تک ہاتھ کی تصویر ہے آگے پہنچے اور پنچے کا پتہ نہیں۔مکالمہ ایک طرف، مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی۔"۶۴ـہ

ایک دوست کو رمضان کے مبارک مہینے میں خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں۔

خط کا اقتباس۔

" دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگرروزے کو بہلا ئے رہتا ہوں۔کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔" ۵۶ـہ

مرزا غالبؔ شاعری کا ذوق اور فارسی زبان پر مہارت کے ساتھ ظرافت اور شوقی بھی ان کی فطرت میں موجود تھیں۔ ان کی کوئی بات ظرافت سے خالی نہ ہوتی اس لیے ہر کوئی ان سے دوبارہ ملاقات کی خواہش رکھتا تھا۔غالب کی زندگی ہمیشہ پریشانیوں میں گھیری رہی وہ کبھی خوشحال و مطمین زندگی گذار نہ سکے۔غرض کہ انہیں نہ تو ذہنی سکون میسر ہوا نہ مادی اطمینان ۔ایسے حالات کا لازمی نتیجہ زندگی میں افسردگی اور دل گرفتگی ہواکرتی ہے لیکن غالب کو ایسے ماحول میں بھی ان کی طبیعت کی شگفتگی مرتے دم تک قائم رہی۔مولانا حالیؔ نے سچ فرمایا ہے کہ غالب کی'' حیوان ناطق '' کی جگہ '' حیوان ظریف '' کیا جائے تو بجا ہے۔

مذہبی عقائد:

غالبؔکے مذہبی عقائد کا معاملہ کافی خاصا پیچیدہ ہے۔ ان کے آباء و اجداد سُنی تھے۔لیکن ان کے تحریروں جو عقائد ظاہر ہوتے ان کے مطابق غالب شیعہ تھے۔لیکن اس بارے میں اختلاف اس لیے پیدا ہواکہ حکیم محمودخاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مرزا کی تدفین اہل تشیع کے طریقہ پر نہیں ہونے دی۔ اور جب ان کی تمام رسوم اہل تسنن کے عقیدے کے مطابقہ ادا کیں تو یقینا انہیں معلوم ہوگا کہ مرزا اصل اسی مسلک کے پیرو تھے اور شیعی نہیں تھے۔

جہاں تک مرزا غالبؔ کا تعلق تھا وہ ساری عمر اپنے شیعی ہونے کا اعلان کرتے رہے اور اس میں ان کی مخاطب سُنی اور شیعہ دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے بزرگ تھے۔غالبؔ کا ایک خط جو نواب علاء الدین احمد خاں علائؔی کو لکھا ہے۔

خط کا اقتباس۔

"موجدِخالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لاَ اِلہَ اِلاَّ اللّٰہ کہتا ہوں اور دل میں لاَ موجوَدْ اِلاَّ موثرْفیِ الْوَجْودِ اِلاَّ اللّٰہ سمجھے ہوا ہوں۔انبیا بس واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السّلام پر نبّوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمتہ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبّوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ مِنَ اللہ ہے اور امام مِنَ اللہ علی علیہ السّل م ہے۔ ثم حسن، ثم حسین۔ اسطرح تا مہدی موعود علیہ السّلام: بریں زلسیتم، ہم بریں بگزرم۔" ۶۶ ؎

غالب نے اپنے شیعہ عقائد ہونے کا ایک جگہ ذکر کیا ہے وہ مرزا حاتم علی مہرؔ کو لکھے خط میں فرماتے ہیں کہ۔

خط کا اقتباس۔

"صاحب بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خداکرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔" ۷۶ ؎

غالب اس عقیدے پر بہت ابتدا سے قائم تھے۔ ان کی مثنوی '' ا بھگرا بار '' غالباً ۱۸۴۵ء میں مکمل ہوچکی۔ اس کے منقبت کے باب میں لکھتے ہیں۔

کہ تاکینہ ازمہر نبشاختم بکس غیرحیدر نہ وا ختم

جوانی برس دربسرکردہ ام شبے در خیالش سحرکردہ ام

غالب کہتے ہے کہ میں نے جب سے ہوش سمبھالا اور کینہ اور محبت کے درمیان فرق سمجھا، اسی دن سے حضرت علی کے سوائے کسی دوسرے سے سروکار نہیں رکھا۔ اسی کے در پر اپنے جوانی کے ایام بسر کر دیے اور اسی کی یاد میں راتیں گذار دیں۔

غالب کا اس مثنوی میں لکھے باب پڑھنے کے بعد انھیں اہل سنت کے گروہ میں شامل کرنے کا کوئی عمل ممکن نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شیعیت کا امتیازی نشان تبرآ نہیں تولاّ ہے۔ وہ دوسرے صحابہ پر تبرّا نہیں کرتے بلکہ حضرت علی سے اپنے تولا اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ غالبؔپر کونسا اثر تھا جس کے تحت انھوں نے شیعیت اختیار کی کیوں کہ قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی ننھیال جہاں اُن کی پرورش ہوئی غالباً سُنی طریقہ کی پا بندتھی جہاں تک شیعیت کا سوال ہے شاید اُن کے اُستاد ملا عبد الصمد جن سے غالب نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں تعلیم حاصل کی تھی ۔اور یہ وہ زمانہ تھا جب انسان کی طبیعت بہت جلد بیرونی اثر

قبول کرتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے تعلقات نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کے خاندان سے نہایت ابتدائی زمانے سے تھے اور ان کے صاحبزادے ناظر حسین مرزا کے بچپن کے ہمجولی تھے اور یہ خاندان بھی کٹڑ شیعہ تھا۔ اس لیے عن ممکن ہے کہ ان کے اثرات نے بھی غالب کو شیعیت کی طرف مائل کردیا ہو۔

ایران میں سولہوی صدی عیسوی میں صفوی خاندان بر سراقتدار آیا اور شیعیت ملک اور حکومت کا مذہب قرار دی گئی تو ایران سے تصوف کی شاعری بھی ختم ہوگئی۔ چنانچہ کوئی قابل ذکر صوفی شاعر نہیں پیدا ہوا اس کے مقابلے میں مرزا اپنے تصوف کا بھی شدوید سے اعلان کرتے ہیں۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کی وحدانیت پر کامل یقین رکھتے اور نجات کے لیے نبوت پر ایمان کو لازم سمجھتے ہیں۔ نبوت کے بعد امامت مرتضوی کے قابل ہیں اور اسی طرح بارہ اماموں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور امامت کے من اللہ ہونے کے معتقد ہیں۔وہ تمام صحابہ کا ادب کرتے ہیں لیکن حضرت علی کو سب دوسرے صحابہ پر ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں۔

باطنی کیفیات

مرزا غالبؔ کی باطنی کیفیات میں خلوص اور دردمندی چھلکتی ہے اظہار شفقت رواداری ، تسلّی اور تشفی ہدایت بزرگانہ شفقت یہ تمام باطنی عناصر ان کے خطوط میں موجود ہے۔ ہم جب ان کے مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی سوانحی عناصر اور با طنی کیفیات کا پتہ چلتا ہے کہ غالب کتنے علی صِفات انسان تھے۔اُن کے عادات و اخلاق بلند درج کے تھے وہ اپنے دل میں ہمدردی، دردمندی خلوص اور محبت کے جذبات رکھتے تھے۔بیماروں کی عیادت کرنا ان کو تسلی دینا اور ہدایت، اور شفقت کا اظہار یہ تمام اطوار ان کے خطوط کے ذریعہ عیاں ہوتے ہیں۔

ا ظہار شفقت :

غالبؔکا خاندان بہت مختصر تھا ایک بھائی اور ایک بہن۔ بہن کی شادی بہت کم سنی میں ہوئی تھیں۔ ایک بھائی مرزا یوسف جو غالب سے دو سال چھوٹے تھے اور ان کا قیام غالب کے مکان سر قریب ہی تھا۔ مرزا یوسف تیس سال کے عمر میں دویوانے ہوگئے ۔غالب کو اپنے بھائی سے کس قدر محبت تھی اس کا اندازہ اُن کے تحریروں سے ہمیں ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں غالب اپنے بھائی سے الگ ہوگئے۔ غالبؔ اپنے بھائی سے متعلق بہت فکر مند اور مضطرف تھے اور چاہتے تھے کہ کس طرح انھیں اپنے پاس لے آئے لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ ممکن نہ ہوسکا۔ اسی دوران ان کے

بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہوگا۔اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے غالب ؔنے ‘‘ دستنبو ’’ میں جن دردناک جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ صاف عیاں ہے کہ انھیں بھائی کی موت کا کتنا صدمہ ہوا۔

مرزا غالبؔبچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ مرزا کی کوئی اولا نہ تھی انھوں نے زین العابدین خان عرف عارف مرحوم کے دونوں بیٹھے حسین علی خان اور باقر علی خان کو کم عمری ہی سے اپنے پاس لے آئے۔ ان بے ماں باپ کے دونوں بچوں کی پرورش محبت اور دل سوزی کی اور بچےّ بھی غالب سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس بات کا ذکرغالب تفتہؔ کو لکھے خط میں کیا۔ خط کا اقتباس۔

”سنو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خان مرحوم میرا فرزندتھا اور اب س کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزندکی جگہ سمجھتا ہوں۔ دونوں مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں میں کیوں گھبراؤں گا۔“ ۶۸ ؎

غالبؔ ان دونوں کا ہر طرح سے لاڈ چاؤ برداشت کرتے۔ ان کے لیے ہر تکلیف اُٹھاتے، اُن کو تفریخ کا ہر سامان مہیاء کرتے خواہ کتنی بھی تنگ دستی ہو اُن کے ماتھے پر بل نہیں آتا۔ مرزا کی ہمشہ کوشش رہتی کے دونوں پوتوں کی دل چسپی اور دل بستگی میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔

اظہار شفقت کا پتہ ہمیں غالب کے تحریر کردہ خط جو انھوں نے مرزاباقر علی خاں فرزند عارفؔ کے نام خط لکھا خط فرمایا۔ خط کا اقتباس۔

”نورچشم وراحت جان مرزا باقر علی خاں کو فقیر غالب کی دعا پہنچے تمہارے خط جو میرے خط کے جواب میں تھا وہ مجھ کو پہنچا۔ اُس میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ اس خط میں ایک نئے امر کی تہمیں اطلاع دیتا ہوں ہو امریہ ہے کہ میں نے اگلے مہینے میں ’سیہ چین‘ کی جلد مع عرض اقبال نشاں مرزاتغفل حسین خاں کی مصرفت الورکو بھجوائی تھی۔ سواب کے ہفتے میں حضور پر نور مہاراو راجا بہادرکاخط انہیں کی مصرفت مجھ کو آیا۔حضور نے ازراہ بندی و قدر افزائی القاب بہت بڑا تھے لکھا اور خط میں فقر کے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کیے تم تو ہیں تم کو اس کی اطلاع ہوگئی یا نہیں اور اگر ہوگی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا۔ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں کچھ میرا ذکر بھی آیاہے یا نہیں حضور سن کرکیا فرماتے ہیں۔“ ۶۹ ؎

یہ تو غالب کے اپنے بچےّ تھے ۔ انھیں دوسروں کے بچوں سے بھی یکساں محبت اور شفقت تھی اور وہ سب دوستوں کی اولاد کا حال پوچھتے رہتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام خطوط سے ان کی صاحبزادی زکیہ بیگم اور ان کے بیٹوں اور پوتوں سے حددرجہ محبت اور شفقت کا ثبوت ملتا ہے۔

خط کا اقتباس۔

”آج اسی ہجوم، غم داندوہ میں تمھارا اور تمھارے بچوں کا خیال آگیا۔ بہت دن گزرے کہ نہ تمھارا حال معلوم اور نہ پیاری بھتیجی زکیہ کا حال معلوم۔ نہ منشی عبدالطیف اور نصیرالدین کی حقیقت معلوم۔ دعاگوہوں تمھارا اور ثناخواں ہوں تمھارا بہ ہر حال لڑکوں کا دعا کہہ دینا، اور اگر مولانا تفتہؔ ہوں تو اُن کی سلام کہنا اور کہنا کہ بھائی دو ایک جز تمھارے اس کارنامے کے دیکھے ہیں۔ آیندہ مجھ کو کثرتِ غم وہم سے فرصت دیکھنے کی نہیں ملتی۔“ ۷۰ے

خودداری:

غالبؔ میں مدح نگاری اور خودداری دونوں تھیں۔مدح نگاری کا تعلق شاعری سے ہے جو اکتسابی چیز ہے اور خودداری کردار کا جز و ہے جو فطری چیز ہے۔جب غالبؔ قصیدے میں کسی ممدوح کی تعریف کرتے ہیں تو وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ رسمی باتیں ہیں اور اس میں نہ کوئی حقیقت ہے۔ پس کسی شاعر کی مدح گوئی اور قصیدہ نگاری سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ذلیل اور خوشامد پرست ہے یہ غلط ہے۔کچھ لوگوں نے اسی بناء پر مرزا کی مدح نگاری پر اعتراض کیا اور انھیں بے غیرت کہا۔ کسی شخص کے اصلی کردار کا اندازہ اس کی روزمرہ کی زندگی کے طرز عمل سے لگانا چاہیے۔مرزا کے زندگی کے دو واقعے جس میں غالب کی خودداری ملتی ہیں۔پہلا واقعہ ۱۸۲۷ء کا ہے۔

جب مرزا نے دلی سے کلکتہ جانے کا اِرادہ کیا تھا اس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا، مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدّت سے چاہتے تھے کہ غالبؔایک بار لکھنؤ آئیں۔ اسلئے غالب ؔکانپور سے لکھنؤ گئے۔اُس وقت نصرالدین حیدر کا زمانہ تھا اور روشن الدولہ نائب سلطنت تھے۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طورپر مُدار رات کی اور روشن الدولہ کہ ہاں بعنوان شائستہ اُنکی تقریب کی گئی۔مرزا سے اس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہوسکا، مگر ایک مدحیہؔ نثر صنعت تعطیل میں۔ جو اُنکے مسوّدات میں موجود ہے نائب سلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھّی تھی۔ مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دوشرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں، ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں، دوسرے نذرسے مجھے معاف رکھاّجائے۔اسی

وجہ سے مرزا بغیر اسکے کہ روشن الدولہ سے ملیں او رو ہ نثرپیش کرے۔ وہاں سے کلکتے کو روانہ ہوگئے۔[۷۱]

جب یہ واقعہ پیش آیا تب غالب کی عمر تیس برس کی تھی اور ان کو دربار سے کوئی خلعت اور منصب نہیں ملے تھے۔ مدعا کا یہ ابتدائی زمانے میں جب مرزا کو کوئی اعزازواکرام کے عادی نہیں ہوئے تھے۔ان کا سلطنت اودھ کے وزیر اعظم سے ان اسباب کی بناء پر ملاقات نہ کرنا اس بات کی قطی دلیل ہے کہ وہ اپنی عزت نفس کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔

دوسرا واقعہ ۱۸۴۲ ء میں انھوں نے دہلی کالج کی فارسی مدرس کا عہدہ اس وجہ سے ٹھکرادیا کہ جب یہ اس سلسلے میں ٹامسن صاحب سیکریڑی حکومت ہند سے ملنے کوانکے مکان پر گئے تو آگے سے کوئی شخص ان کے استقبال کو نہیں آیا۔اس زمانے میں وہ انگریزوں سے وظیفہ لیتے تھے اور دربار میں شامل ہوتے اور قصیدے بھی پڑھکر انعام و خلعت پاتے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود انھوں نے صوبے کے سب سے بڑے انگریز حاکم سے ملاقاتک کر کالج میں ملازمت سے انکار

کردیابات اتنی سی ہے کہ جب غالب اُن کے کوٹھی پر ملاقات کے لیے گئے تو کوئی شخص اُن کی پذیرائی کو کیوں نہیں آیا۔

ہمدردی:

غالبؔ کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے عمر کے آخری دور میں اور کمزوری کے عالم میں بھی غالبؔ بلا وقفیت کے بھی اشعار کی اصلاح کرتے دیتے تھے۔تکلیف کی حالات میں چھوٹے بڑوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔مثلاً غالب جب ضعف دماغ میں مبتلا تھے ان دنوں جہاں عالم شاگردوں کے کلام نہیں کا کلام کی اصلاح نہیں کرسکتے تھے وہاں انھوں نے نواب رام پور کے کلام کے ساتھ بھی وہی سلوک کیاتھا حالانکہ وہ سرکار رام پور سے مستقل وظیفہ پاتے تھے۔

غالبؔ میں ایک طرف تو شوخی و ظرافت تھی ۔ دوسری طرف غمناک واقعات کا بیان اور اظہار ہمدردی اسطرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو متا ثر کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔یوسف مرزا اُن کی عزیز دوست کے والد کے وفات پر جو خط غالب نے لکھا اس میں ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے۔

خط کا اقتباس ۔

’یوسف مرزا!

کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کر و مگر صبر؟ یہ ایک شیوہئ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجاکٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔دواکا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مراپھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپاکس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گار یوسف مرزا کو۔" ۷۲ـہ

غالبؔ ایک اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ ان میں یہ بھی خصوصیت تھی کہ وہ دوسروں کا احسان کبھی نہیں بھولتے تھے بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ ایک دفعہ غدر کے ایام میں مرزا کے بعض ہندو دوستوں نے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور مرزا نے اس کا ذکر '' دستبنو'' میں ان صاحبوں کا خاص طورپر ذکر کیا اور لکھا اگر چہ بات معمولی نظر آتی ہے اور میں اسے آسانی سے نظر انداز کردے سکتا تھا لیکن احسان مندی کا تقاضا یہ ہے کہ میں ان صاحبوں کا شکریہ ادا کروں۔

فراخ حو صلگی:

غالبؔ کی آمدنی کچھ قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ غالبؔ کے دروازے سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ غالبؔ ہر ایک منگنے والے کی مدد کرتے تھے۔اُن کے مکان کے آگے اندھے لنگڑے لوے اور اپاہچ مرد و عورتیں ہر وقت پڑے رہتے تھے۔غدر کے بعد غالب کی آمدنی کچھ ڈیرھ سو روپیہ ماہوار ہوگئی تھی اور اِن کے اخراجات بھی لمبے چوڑے تھے مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لیے وہ ہمیشہ تنگ رہتے تھے۔

غالبؔ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جوگردش روز گار سے بگڑگئے تھے نہایت ہی شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔یہ دوسرا واقعہ ہے کہ غالبؔ کے ایک امیر دوست جن کی حالت غدر میں بہت سقیم ہوگئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے غالبؔ سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی اُنکو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چُغو ں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغُل اُن کے بدن پر دیکھ کر غالب کا دل بھر آیا اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ کا فرغل آپ نے کہاں سے لی۔ ؟ مجھے اسکی وضع بہت ہی اچھا معلوم ہوتی ہے۔آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوادیں۔ اُنھوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بنکرآیا ہے۔ اور میں نے اسی وقت اسکو پہنا ہے، اگر آپ کو پسند ہی تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین لوں مگر جاڑا شدّت سے پڑرہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائینگے؟

پھرادہر دیکھکر کھونٹی پر سے اپنا ما لیدہ کا نیاچْغہ اُتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چْغہ انکی نذر کیا۔ ے۷۳

حسن اخلاق

غالبؔخوش اخلاق مزاج کہ تھے۔ جو شخص ملاقات کے لیے آتا اس سے اچھی طرح مِلتے، اپنے دوستوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ غریبوں اور محتاجوں کی اِمداد اکرتے تھے۔غالب اکثر غریب احباب اور اعزاکی مدد اپنی تنگدستی کے باوجود کرتے تھے، اپنے دوستوں کی ہر قسم کی مدد کے لیے ہمشہ تیار رہتے تھے۔اپنے رشتہ داروں سے محبت کرتے تھے۔ شاگردوں پر شفقت اور اُن کے اشعار کی اصلاح بھی فرماتے تھے۔بیوی کی ہر ضروریات اور آرام کا خیال رکھتے تھے۔ اپنوں کو دِل سے چاہتے تھے۔بھائی جب بیمار تھے تو اُن کی تیمار دا ری اور بھائی کے گھر کی ضروریات کا پورا خیال رکھا اور جب بھائی تندرست ہوئے تو خدا کی شکرگزاری ادا کیں۔

سخاوات، دریادلی:

غالبؔ بہت فیاض اور دریا دلی تھے۔دوست احباب طرح طرح کی فرمایش کرتے تھے اور غالب ان سب کی فرمائش پورا کرتے تھے۔غالب کے گھر کے سامنے ہمشہ اپاہچ اور محتاج جمع رہتے تھے اور انکی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ غالب کے یہاں ملازمین کی تعداد زیادہ تھی لیکن غالب نے اپنی تنگ دستی کے دنوں میں بھی ان ملازمین کو بر طرف نہیں کیا۔کوئی نوکری چھوڑگیا تو اسے روک نہیں۔ کوئی لوٹ آیا تو اسے بہرحال پناہ دی کہ بھائی جہاں سے ہم کھائیں وہاں سے تم بھی کھاؤ۔

ایک مرتبہ کا واقعہ یہ کے غدر کے بعد انہیں لفٹنٹ گورنر کی طرف سے سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے مطابق انعام لینے کے لیے آئے۔ غالبؔ کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے چپراسی کو ایک الگ مکان میں بٹھا دیا اور خلعت مع رقوم جواہر بغرض فروخت بازار بھیج دیا۔ جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب چپراسیوں کو انعام دے کر رخصت کیا۔

دوست نوازی:

غالبؔ اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔دوستوں سے وفااور ان پر جان جھڑکنا ان کا ایمان تھا۔اپنے دوستوں کے لیے جو کچھ اُن سے بن پڑھتا تھا وہ کرتے اور نہ ہو سکتے تو دوسرے سے سفارش کرتے ۔غالب ایک حسّاس طبعیت کے مالک تھے

ان اپنی مصیبت ناک زندگی اور تنگ دستی میں بھی وہ اپنی دوستوں کی مدد ضرور کرتے تھے۔

ایک دفعہ دہلی میں افواہ اُڑی کے راجہ بھرت پوروفات پاگئے۔ انھیں فوراً اپنے دوستوں کی فکر ہوئی جو اس سرکار سے وابستہ تھے۔ دیکھئے کس اضطرب سے تفتہؔ کو خط لکھتے ہیں۔ خط کا اقتباس۔

”منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجہ بھرت پور کی بیماری کی خبر سُنی جاتی تھی۔ کل اور بُری خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو یقین ہے کہ تم کو حقیقی حال معلوم ہوگا۔ جلد لکھوکہ کیا صورت ہے راجہ بھرت کا مجھ کو غم نہیں۔ مجھ جانی کی فکر ہے کہ اُسی علاقہ میں تم بھی شامل ہو۔صاحبان انگریز نے ریاستوں کے باب میں یہ قانون وضع کیا ہے۔ یعنی جو رئیس مرجاتا ہے سرکار اس ریاست پر قابض و متصرف ہو کر رئیس زادہ کے بالغ ہونے تک بندوبست ریاست کا اپنے طورپر رکھتی ہے۔ سرکاری بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بدستور قائم رہے۔“ ۷۴ـــ

غالب ؔکی سب دوستوں سے محبت اور دوستوں کی مدد کی متعدد مثالیں ان کی تحریروں ملتی ہیں۔غالب کی بے چارگی کا احساس ایسے موقع پر شیدید ہوجاتا جب وہ کسی دوست کو تکلیف میں دیکھتے اور اس کی مد د نہ کرسکتے۔ میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں۔ خط کا اقتباس۔

”اے میر مہدی تو دریانده و ماجز پانی پت میں پڑا ہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلیؔ دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈھتا پھرنے اور میں ان عمائے جانگدازکی تاب لاؤں۔ مقدور ہوتاتو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا اس بساآرزہ کہ خاک شده۔“ ۷۵ـــ

ایک اور مقام پر غالب ؔنے جو کچھ نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھا ہے وہاں گویا اپنی تمام حسرتوں کو زبان قلم سے بیان کردیا ہے۔خط کا اقتباس۔

” مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی دادبہ اندازۂ بایست پائی نہیں۔ اپنی ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آرزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بردے ہیں بہ قدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جِسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اُس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹامع سوت کی سری کے لٹکالوں اور پیادہ پاچل دوں کبھی شیراز نکلا کبھی مصر میں جاٹھہرا کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تما م عالم میں نہ ہوسکے نہ

سہی جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آؤں۔۔۔وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور کو دربہ در بھیک مانگے وہ میں ہوں۔“ ۷۶ے

اظہار تعزیت:

غالب کو نظم اور نثر دونوں میں اپنے اظہار پر یوں تو قدرت حاصل تھی لیکن اگر کبھی کسی کی وفات پر تعزیتی خط لکھنا ہوا۔ تو انھیں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی وجہہ یہ کے غالب موت کے ذکر سے بہت گھبراتے تھے۔ اور شاید اسی لیے تعزیت کے لیے انھیں مناسب الفاظ نہیں مل پاتے ہے۔ اکثر سرسری انداز میں تعزیت کرتے ہیں۔ اگر کسی دوست یا شاگرد کو کسی کو موت کی خبر دیتے ہیں تو کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پس ماندگان کو تعزیتی خط لکھتے ہیں تو صبر وعمل کی تلقین کرکے پچھا چھڑا لیتے تھے۔اور اس طرح کے خطوں میں ایک آدھ بات اسی فضل لکھ دیتے تھے جس سے متلقین کے دل کا بو جھ ہلکا ہوسکے۔ ایسے تعزیتی خط چند ہی ہیں جو غالب نے دل جوائی کے ساتھ لکھے۔

غالبؔ کے مزاج میں ظرافت داخل تھی ہر وقت ہنستے ہنساتے تھے اور دل آسائی اور دلجوئی ان کے مزاج کا ایک دوسرا پہلو تھا۔ ان میں شوخی وظرافت کے ساتھ غم کو اپنانے کی عادت بہت کمال کی تھی ۔ وہ کہتے ہے کہ ‘‘کسی کے مرنے کا غم وہ کرتے جو آپ نہ مرے ’’۔ لیکن غم کسی کا بھی ہو ان کے دل کو تڑپا دیتا ہے اور موت کسی کی بھی ہو وہ ماتم گسار نظر آتے ہیں ایک خط میں جو حاتم علی بیگ مہر کے نام لکھا،

‘‘ ہائے میجر جان کو جا کوب کیا جوان مارگیا ہے۔’’

غالبؔ کے بہت سے دوست اس دُنیا سے چل بسے تو لکھا۔

‘‘ ہائے کتنے دوست مرے کہ جو اب میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی ہوگا۔’’

اس بیان میں ظرافت کے ساتھ اُن کا غم بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے جو بھی دوست اس دُنیاسے رخصت ہوئے ان کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں ضرور کیا اور ان کی دلجوئی کرتے نظر آئے۔ جب میاں داد خان سیاحؔ کا بیٹامرگیا تو ان کو دلا سادیتے ہوئے اپنی مثال دیتے ہوئے کہاکہ اکہتر برس کی عمر تک میر ے سات بچے ہوئے ان میں سے کوئی پندرہ مہینے سے ذیادہ نہ جیا۔

غالبؔ یوسیف مرزا کے والد کے موت پر اُن کو تسلی د یتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

خط کا اقتباس۔

" یوسف مرزا ! کیوں کہ تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کہ نہ تڑپے گا۔" ۷۷ـہ

یوسف مرزا کے نام غالبؔ کے کل بارہ خطوط ملتے ہیں۔ ان چند خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کو یوسف مرزاسے بہت محبت تھی۔ پہلے ان کے بیٹے کی وفات ہوئی اور کچھ عرصے بعد والد کا انتقال ہوگیا۔ غالبؔ کو دوسرے حادثے کا دلی صدمہ ہوا۔ انھوں نے اس موقع پر یوسف مرزا کو جو تعزیت نامہ لکھا ہے، اُس سے بہتر تعزیت نامہ ابھی تک اردو میں نہیں چھپا۔ اس تعزیت نامے میں اظہار ہمدردی بھی ہے اور صبر و تحمل کی تلقین بھی اور فکر و اسلوب کی جدّت بھی لکھتے ہیں۔

نواب امیں الدین خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس موقعے پر غالب نے انھیں جو تعزیتی خط لکھا ہے اوہ اپنی مثال آپ ہے۔ رسمی باتیں بھی آگئیں اور دلی کیفیت کا اظہار ہوگیا۔

خط کا اقتباس۔

" بھائی صاحب! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیالکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہار غم۔ تلقین صبر۔ دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہار غم تکلف محض ہے۔جو غم تم کو ہوا ہے، ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر بے دردی ہے۔یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلتِ نواب مغفور کو تازہ کیا۔ بس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دُعائے مغفرت تو میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربّیہ اور محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔" ۷۸ـہ

غالب نے اللہ کے فصل سے خاصی طویل عمر پائی تھی۔ اُن کے بیشتر دوست اور عزیز ان کی زندگی ہی میں وفات پاگئے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں اُنکے بہت سے دوست آشنا اور رشتہ دار قتل ہوئے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دے گئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ غالب موت کی خواہش کا اظہار بار بار کیا کرتے تھے۔ ایک خط میں موت کی خواہش کااظہار بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔

خط کا اقتباس۔

" زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آیندہ کے، اسی مہینے، میں اپنے آقا کے پاس جاپہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت۔ نہ حاکم کا خوف ن مخبر کا خطرہ، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت، گھی منگاؤں نہ روٹی پکواؤ۔" ۷۹ـہ

انسانی نفسیات کچھ اس طرح کی ہے کہ فن کار خود اپنی موت کاذکر تو بڑی انشاپردازی کے ساتھ کرتا ہے لیکن جب

دوسروں کو فی الحقیقت مرتا ہوادیکھتا ہے تو خاصا خائف نظر آتا ہے۔ غالبؔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

خط کا اقتباس۔

"کثیر الاحباب شخص ہوں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مرگئے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو، جو دوست اب باقی ہیں، بہت عزیزہیں۔واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احیا میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔" ۸۰ـہ

بنام حکیم غلام نجف خان

غالبؔ کے مزاج میں ظرافت تھی اُن کو تعزیتی الفاظ لکھنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ کسی کی موت پر بہت افسوس کرتے، ان کا دل مرنے کی خبر سُن کر تڑپ جاتا لیکن افسوس ظاہر کر نے کے لیے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ اسی لیے غالبؔ تعزیت نامہ لکھنے سے کتراتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے جذبات کی صحیح عکاسی نواب کلب علیؐ خاں کے نام ایک خط میں بیان کی۔ خط کا اقتباس۔

"چاہتاہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھاکہ تعزیت نامہ بہ زبان فارسی و عبارت بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم! دل نے قبول نہ کیا۔ آرایش گفتار، نظماً و نثراً واسطے تہنیت کے ہے کہ دل کثرت نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے، طبعیت راہ دیتی ہے۔الفاظ ڈھونڈے جاتے ہیں معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ،جس باب میں لفظ ومعنی فراہم کیا چاہوں وہ سراسر طبع کے خلاف۔ جس بات کا تصور ناگوار ہو، اُس کے تذکر سے جی کیوں نہ بے قرار ہو۔" ۸۱ـہ یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ کو دوسروں کی موت کا ذکر بہت ناگورا گزرتا تھا، اسی لیے وہ عام طورسے تغریتی کلمات مختصرلکھتے ہیں۔ یہ مختصر کلمات کبھی کبھی

محض رسمی الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثال کے طورپر مرزا قربان بیگ خاں سالکؔ کے چچا کا انتقال ہوا تو غالبؔ ان الفاظ میں تعزیت کرتے ہیں۔

خط کا اقتباس۔

" میری جان! کن اوہام میں گرفتار ہے، جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی روتجھ کو خدا جیتارکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورتو قوعی دے۔" ۸۲ے

مرزا ہر گوپال تفتہؔ ، غالب کے عزیز ترین شاگرد تھےلیکن جب تفتہؔ کی بیوی کا انتقال ہوا تو غالبؔ نے سرسری انداز میں صرف اس طرح تعزیت کی۔

خط کا اقتباس۔

"تمہارا خط پہنچا مجھ کوبہت رنج ہوا۔ واقعی اُن چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہوگا۔ دیکھومیں تو اسی آفت میں گرفتار ہوں۔ صبر کرو اور صبر نہ کروگے تو کیا کروگے کچھ بن نہیں آتی میں مسہل میں ہوں یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔" ۸۳ے

میاں داد خاں سیاحؔ کے ہا ں لڑکا پیدا ہوتے ہی مرگیا۔ اس خبرسے بظاہر خود غالبؔ کے زخم ہرے ہوگئے۔ غالبؔ کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے لیکن پندرہ مہینے سے زیادہ کوئی نہ جیا۔ غالبؔ لکھتے ہیں۔

خط کا اقتباس۔

" تمھارے یہاں لڑکا پیداہونا اور اس کا مرجانا معلوم ہوکر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ اَکتہر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔ تم ابھی جوان ہو، حق تعالی تمھیں صبر اور نعم البدل دے۔" ۸۴ے

غالبؔ کے یہاں اس قسم کے تعزیتی خطوں کی بعض ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں غالبؔ نے بہت مختصر لفظوں میں تعزیت کی ہے یا کسی کی موت کی اطلاع دی ہے لیکن اپنے مخصوص اسلوب سے اظہار کو غیر معمولی حد تک موثر بنادیا ہے۔ منشی نبی نخش حقیرؔ کی بہو بیمار پڑیں تو غالب کو خاصی تشویش ہوئی کئی خطوں میں اُن کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ ایک دن خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ یہ خاتون غالبؔ کے عزیزترین دوست منشی بنی بخش حقیرؔ کے صاحبزادے منشی

عبداللطیف کی بیوی تھیں۔ حقیرؔ کے رشتے سے غالبؔ کو منشی عبداللطیف اور اُن کی بیوی دونوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ اس خاتون کی بیماری کے دوران غالبؔ ، حقیرؔ سے اُن کے خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ ایک دن جب ان کی وفات کی خبر سُنی تو غالبؔ کو دلی صدمہ ہوا۔چنانچہ انتہائی مختصر مگر رقت آمیز انداز میں اس طرح تعزیت کی۔

خط کا اقتباس۔

" ہائے ہائے، وہ نیک بخت نہ بچی۔ واقعی یہ کہ تم پر اور اس کی ساس پر کیا گزری ہوگی۔ لڑکی تو جانتی ہی نہ ہوگی کہ مجھ پر کیا گزری۔ لڑکا شایدیاد کرے گا اور پوچھے گا کہ اماں کہا ں ہیں۔یہ اس کا پوچھنا اور تم کو رلائے گا۔ یہ ہر حال چارہ جز صبر نہیں ہے۔ غم کرو، ماتم رکھو۔ روؤ پیٹو، آخر خون جگر کھاکے چپ رہنا پڑے گا۔ حق تعالیٰ عبداللطیف کو اور تم کو اور یتیموں کی دادی اور پھپھیوں کو سلامت رکھے اور تمھارے دامنِ عطوفت و آغوشِ رافت میں اُن کو پالے۔" ۸۵ے

نواب یوسف علی خان ناظمؔکی والدہ فتح النساء بیگم اکا انتقال ہواتو غالبؔ کے لیے ضروری تھا کہ رسمی تعزیت نامہ لکھیں مگر یہ اُن کے بس کی بات کہاں تھی۔ دیکھے کیسے مختصر لفظوں میں اپنا کام نکالتے ہیں۔

"کل اُس (مرزا داغ) نے ازروے خط آمدِ رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سُنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصورکر کر اور زیادہ مغموم ہوا، بیدرد نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بہ طریق انشاپر داری عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دل دیدور کو تلقین صبر و شکیبائی کروں۔" ۸۶ے

ازدست گدائے بے نوا ناید ہیچ

جزآں کہ بہ صدق دل دعائے بکند

بنام یوسف علی خاں ناظمؔ

شاید دنیا میں ایسے خطوط لکھے گئے ہوں جو تعزیت نامے ہوں یا جن میں کسی کی موت کی اطلاع دی گئی ہو اور ان میں طنز و مزاح سے کام لیا گیا ہو۔ غالبؔ جب اس طرح کے خطوط لکھتے ہیں تو کبھی کبھی ان کو شوخی طبع اور بذلہ سنجی بر قرار رہتی ہے۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ '' غم آگیں مضامین '' سے اُن کے خطوط زیادہ بوجھل نہ ہوجائیں۔ علی بخش خاں، غالبؔ کے سسرالی رشتے دار اور عزیز دوست تھے ممکن نہیں کہ غالبؔ کواُن کی وفات کا صدمہ نہ ہواہو۔ علائیؔ کے نام خط میں اُن کی

وفات کا ذکر ایک فقرے میں کرتے ہیں اور پھر اس صدمے کہ بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے مرحوم کا ایک ایسا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں، جسے پڑھ کر مکتوب الیہ ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھتے ہیں کہ۔

خط کا اقتباس۔

”علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۲ء میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے جب کے مہینے سے انہتروں برس شروع ہوا ہے۔ اس نے چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ نتی تقریر و تحریر کا آدمی تھا۔ اکبرآباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ جنرل لارڈلیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکرسے جو محاربات ہوئے ہیں، اُس میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قباوپیرہن اتار کردکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے، جابہ جا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔وہ ایک بیدار مغز او دیدہ ور آدمی، اُن کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب،ہم ایساجانتے ہیں کہ نم جرنیل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہوگے۔ یہ سُن کر آپ نے کہا کے درست بجا ارشاد ہوتا ہے۔ خدایش بیامرزاد و بدین دروغ ہائے بے نمک یگراد۔“ ۸۷ے

مرزا حاتم علی مہرؔ کی محبوبہ کا انتقال ہوگیا۔ غالبؔ نے تعزیت نامہ ایسے دلچسپ انداز میں لکھا کہ اس میں غم واندوہ کااظہار بھی ہوگیا اور کچھ چھیڑ چھاڑ بھی۔ مقصد غالبؔ کا یہ کہ مہرؔ کا غم کچھ ہلکا ہو اور اُن میں صبر و ضبط کا حوصلہ پیدا ہو۔

خط کا اقتباس۔

” ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پنیسٹھ برس کی عم ہے، پچاس برس عالم رنگ وبو کی سیر کی، ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد وورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگریہ یاد رہے کی مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہاہے، کسی کے مرنے کا وہ غم کر ے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو، چناّ جان، نہ سہی، مناّ جان سہی، میں جب بہشت کا تصور کرتاہوں اور سو نچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملااور ایک حورملی، اقامت جاوادنی ہے اور اُسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے! و حوار جیرن ہوجائے گی۔ طبعیت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبی کی ایک شاخ،چشم بددور، وہی ایک حور، بھائی، ہوش میں أؤ کہیں اور دل لگاؤ۔“ ۸۸ے

علالت، آخری ایا م اور وفات :

غالب نے اپنے خطوط میں اپنی علالت ، بیماری اور آخری عمر کی تکا لیف کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی عمر کا آخری حصہّ تکلیف و بیماریوں میں گزرا ، طرح طرح کی امراض نے انھیں گھیرلیا تھا۔صحت کی خرابی نے ایسا عاجز کردیا تھا کہ کبھی کبھی تو موت کی دُعا کرتے تھے۔ جوانی میں صحت قابل رشک تھی لیکن شراب نوشی کی کثرت اور ہجوم آلام نے صحت برباد کردی تھی۔ ایام غدر میں فولیج کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے چار سال بعد دردسر میں مبتلا ہوگئے۔ ساتھ ہی سید ھے ہاتھ میں پھنسی نکلی جو پھوڑا بن گئی۔ پھوڑا پھوٹا تو جسم میں ایک غارسابن گیا۔ ان دنوں اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ یہ سب فسادِ خون کا نتیجہ تھا۔اس بات کا ذکر غالبؔ نے قاضی عبدالجلیل کو لکھے خط میں کیا۔

خط کا اقتباس۔

”مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خد کی پناہ! ضعف کیوں کر نہ ہو، برس دن صاحب فراش رہاہوں۔ ستر برس کی عمر جتنا خون بدن میں تھا، بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔ سن کہاں جواب پھر تو لیدومصالح ہو۔ بہر حال زندہ ہوں اور ناتواں۔“ ۸۹ ؎

غالبؔ کی آخری زندگی بڑی ہی تکلیف اور معذوری میں گزری، بیماری نے ان کو کس قدر افسردہ اور مایوس کردیا تھا۔ اس کا ذکر وہ اپنوں دوستوں کو خط لکھ کر اس کا حصہّ بناتے اور اپنے بوج کو ہلکا کرکہ مطمئن ہوجاتے تھے۔ ایک خط جو انھوں نے اپنے دوست چودھری عبدالغفو سرورؔ کو لکھتے ہیں۔

” مہینے بھر سے صاحب فراش ہوں۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ محل سرائے اگر چہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے، پر کیا امکان جو جاسکوں۔ صبح کو نوبجے کھانا یہیں آتا ہے، پلنگ سے کھسک پڑا۔ ہاتھ منہ دھوکر کھانا کھایا۔ پھر ہاتھ دھوئے کلی کی پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگکے پاس حاجتی لگتی رہتی ہے اور حاجتی میں پیشاب کیا اور پڑرہا۔ مدّتوں سے یہ مرض جلد جلد آتا ہے۔اس صاحبِ فراش ہونے کو دیکھو اور دمبدم تقاضے بول کو دیکھو۔ پاخانے اگر دن رات میں ایک دفعہ جاتا ہوں۔ مگر صعوبت کو تصور کرو ایک پھوڑا دائیں پہنچے میں جس کو ساعد کہتے ہیں۔ وہ پھوڑے بائیں پہنچے میں یہ سہل میں بائیں پاؤں میں کف پاوپشت پاسے لے کرآدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی سخت روادعات ومحلّات سے کچھ نہ ہوا اب تجویز ہے کہ نیم کا بھُر تا باندھے۔ جب یکے پھوٹے تب مرہم لگائیے۔ کہو کف پامیں جراحت کا عمل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا۔“ ۹۰ ؎

غالبؔزندگی کے آخری دو سالوں میں قریب قریب باہر آنا جانا بالکل چھوڑدیا تھا۔دن رات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ صحت ایک دم کمزور ہوچوکی تھی بنائی آخر تک قیام رہی پر لیکن کانوکی سماعت کمزور ہوگئی تھی۔ کوئی ملاقاتی آتاتو اُٹھ بیٹھتے ورنہ لیٹے لیٹے ثقِل سماعت کے باعث بات چیت لکھ کر کرتے تھے۔پہلے کچھ مدت تک خطوں کے جواب لیٹے لیٹے لکھ لیتے تھے لیکن جب ہاتھوں میں رعشہ ہوگیااور قلم پکڑنے اور لکھنے سے اُنگلیوں میں تکلیف ہونے لگی تو اس حالت میں خط لکھنا بھی ترک کردیا، کوئی ملنے والے آجائے تو اِن سے خطوط لکھوادیتے تھے۔

غالب کے خطوط میں اپنی بے بسی اور موت کی تمنا کے اظہار کو ذیادہ موثر طریقے سے بیان کیا ہے۔ اُردو اور فارسی کے کچھ اشعار ہیں جن کی مددسے غالبؔ نے اپنے صنف نقاہت ، بے بسی اور موت کی تمنا کو ظاہر کیا ہے۔ فارسی کے اشعاروں کے اعلاوہ اُردو کے ایک شعر ہے جو خود غالب ہی کا شعرہے وہ اپنے زندگی کے آخر دور میں دہراتے دیکھائی دے۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

مرگئے پر دیکھے دکھلائیں کیا

مرنے سے چند روز پہلے غالبؔ پر بے ہوشی سی طاری ہوگئی تھی۔کچھ دیر کے لیے ہوش میں آتے ہو پھر بے ہوش ہوجاتے تھے۔ موت کے ایک دن پہلے کچھ افاقہ ہوا تو کھانے کی خواہش کا اظہار کیا اور اپنے ملازم سے کہا کہ میزا جیون بیگ جو باقرعلی خاں کی سب سے بڑی صاحبزادی تھی اُن کو بلاؤ۔ملازم کُلو ان کو بلانے کے لیے محل سرامیں آیا تو آرام کررہی تھی۔ملازم نے واپس جاکر مرزا سے کہا کہ وہ سورہی ہیں۔ مرزا نے اس پرفرمایا کے اچھا جب وہ آئے گی تو ہم کھانا کھائیں گے۔اس کے گاؤ تکئیے پر سررکھا بے ہوش ہوگئے۔ حکیم محمود خان اور حکیم احسن اللہ خاں بہادر کو دی گئی۔ انھوں نے تشخیص کیا کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ بہت علاج کئے گئے مگر انھیں ہوش نہیں آیا نہ اس کے بعد انھوں نے ہوئی بات کی۔ اس حالت میں اگلے دن ۱۵، فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲، ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ روز شنبہ کو دوپہر ڈھلے اس باکمل شخص کا انتقال ہوگیا۔جس نے اگر ایک طرف اس ہندوستان کو علم وا دب اور فارسی کو نقظ، معراج پر پہنچادیا تودوسری طرف اُردو نظم و نثر کو تقلید کی زنجیروں سے آزاد کرکے ایک نئے رنگ کی بیناد ڈالی اور اپنے نئے انداز تحریر سے پورے عالم کو روشناس کیا۔

مرحوم کی جنازے کی نماز دلّی دروازہ کے باہر ہوئی ۔ بعض شیعہ حضرات نے کہا کہ مرحوم شیعہ تھے اس لیے ہمیں اپنے طریقے پر ان کی تجہیزو تکفین کی اجازت

دی جائے مگر نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر اور حکیم محمود خاں یہ دونوں حضرات نہیں مانے اور تمام رسومات اہل سنت کے طریقے پر ادا ہوئیں۔

۱۔ Herold Nicolson " The Development of English Biography " p.71 The

Hagrath press, London, 5th Edition, 1968

۲۔ Herold Nicolson " The Development of English Biography " p.71 The Hagrath press, London, 5th Edition, 1968

۳۔ .Encycolopedia Britunica, p. 640 vol. III edition 1971

۴۔	فیروز اللغات، حصہ سوم	الحاج فیروز الدین	ص ۸۱۷
۵۔	فرہنگ آصیفہ، جلد سوم	مولوی سید احمد دہلوی	ص ۱۱۷
۶۔	فن سوانح نگاری	ڈاکٹر عبدالوسع	ص ۶۱
۷۔	نثر حالی رسالہ اُردو	شیخ چاند	ص۲۸
۸۔	فن سوانح نگاری	ڈاکٹر عبدالوسع	ص ۱۶
۹۔	فن سوانح نگاری	ڈاکٹر عبدالوسع	ص ۵۱
۱۰۔	عود ہندی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۱۵۵
۱۱۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۳۰
۱۲۔	یاد گار غالب (باردوم)	الطاف حسین حالی	ص۱۶۷
۱۳۔	یاد گار غالب (باردوم)	الطاف حسین حالی	ص۱۶
۱۴۔	غالب کی زندگی	امیر حسین نورانی	ص ۱۴
۱۵۔	غالب کی زندگی	امیر حسین نورانی	ص ۱۵،۱۶
۱۶۔	اُردوئے معلی	مرز اسد ا للہ ا غالب	ص ۳۸۴
۱۷۔	غالب کی زندگی	امیر حسین نورانی	ص۱۷
۱۸۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۷۲
۱۹۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۵۸ ، ۵۹
۲۰۔	غالب کے خطوط (جلد سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۱۱۵۲
۲۱۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص۴۸
۲۲۔	غالب کے خطوط (جلد اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۳۲۷
۲۳۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۴۱
۲۴۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۴۲۴
۲۵۔	غالب کے خطوط (جلد اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۱۹۹

۲۶۔ غالب کے خطوط (جلد اول) ڈاکٹر خلیق انجم ص۱۹۸

۲۷۔ اورَاق معانی مرزا غالب(مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد) ص۴۹

۲۸۔ نقش نیم رُخ مرزا غالب (مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد) ص۶۵

۲۹۔ اورَاق معانی مرزا غالب(مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد) ص۵۳

۳۰۔ اورَاق معانی مرزا غالب(مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد) ص۶۴

۳۱۔ غالب کی سوانح عمری ڈاکٹر تنویر احمد علوی ص۴۲

۳۲۔ ذکر غالب مالک رام ص۶۴

۳۳۔ غالب کا سفر کلکتہ او کلکتہ کا ادبی معرکہ ڈاکٹر خلیق انجم ص۳۵

۳۴۔ یاد گار غالب الطاف حسین حالی (باردوم) ص۲۵

۳۵۔ اورَاق معانی مرزا غالب(مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد) ص۷۴

۳۶۔ غالب اور بنارس شاہد ماہلی ص۹۱

۳۷۔ اُردوئے معلی اسد اللہ خان غالبؔ ص ۸

۳۸۔ نقش نیم رُخ مرزا غالب (مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد) ص۷۶

۳۹۔ نقش نیم رُخ مرزا غالب (مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد) ص۷۸،۷۹

۴۰۔ اورَاق معانی مرزا غالب(مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد) ص۵۱، ۵۲

۴۱۔ غالب کا سفر کلکتہ او کلکتہ کا ادبی معرکہ ڈاکٹر خلیق انجم ص۷۹

۴۲۔ غالب کا سفر کلکتہ او کلکتہ کا ادبی معرکہ ڈاکٹر خلیق انجم ص۸۷

۴۳۔ غالب کا سفر کلکتہ او کلکتہ کا ادبی معرکہ ڈاکٹر خلیق انجم ص۸۱

۴۴۔ غالب کا سفر کلکتہ او کلکتہ کا ادبی معرکہ ڈاکٹر خلیق انجم ص۱۲۶

۴۵۔ غالب کا سفر کلکتہ او کلکتہ کا ادبی معرکہ ڈاکٹر خلیق انجم ص۱۲۸

۴۶۔ غالب کا سفر کلکتہ او کلکتہ کا ادبی معرکہ ڈاکٹر خلیق انجم ص۱۲۹

۴۷۔ غالب کا سفر کلکتہ او کلکتہ کا ادبی معرکہ ڈاکٹر خلیق انجم ص۱۳۰

۴۸۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۷۹

۴۹۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۴۲۲، ۴۳۲

۵۰۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۱۶۲،۱۶۱

۵۱۔ غالب کے خطوط (جلد اول) — ڈاکٹر خلیق انجم — ص۳۰۹

۵۲۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۲۹۲

۵۳۔ غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور — افتخار عارف — ص۳۰

۵۴۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۲۴۸

۵۵۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۲۴۸

۵۶۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۳۷

۵۷۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۲۳

۵۸۔ یاد گار غالب — الطاف حسین حالی (باردوم) — ص۶۳

۵۹۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۲۹

۶۰۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۴۲

۶۱۔ غالب کے خطوط (جلد دوّم) — ڈاکٹر خلیق انجم — ص۸۳۳

۶۲۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص۶۰

۶۳۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۱۷۹

۶۴۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۹،۱۰

۶۵۔ غالب کے خطوط (جلدسوم) — ڈاکٹر خلیق انجم — ص۱۱۳۰

۶۶۔ غالب کے خطوط (جلداوّل) — ڈاکٹر خلیق انجم — ص۳۹۷

۶۷۔ غالب کے خطوط (جلد دوّم) — ڈاکٹر خلیق انجم — ص۷۰۶، ۷۰۷

۶۸۔ اُردوئے معلی — اسد اللہ خان غالبؔ — ص ۵۵

۶۹۔ غالب کے خطوط (جلد دوّم) — ڈاکٹر خلیق انجم — ص۷۵۷، ۷۵۸

۷۰۔	غالب کے خطوط (جلدسوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۱۰۹۰
۷۱۔	یاد گار غالب	الطاف حسین حالی (باردوم)	ص۲۵
۷۲۔	غالب کے خطوط (جلد دوّم)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۷۸۳
۷۳۔	یاد گار غالب	الطاف حسین حالی (باردوم)	ص۵۷، ۵۸
۷۴۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۵۴
۷۵۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص
۷۶۔	غالب کے خطوط (جلداوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۴۱۷
۷۷۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۳۲۵
۷۸۔	غالب کے خطوط (جلد دوّم)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۶۸۸
۷۹۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۲۲۳
۸۰۔	غالب کے خطوط (جلداوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۲۱،۲۲۰
۸۱۔	غالب کے خطوط (جلداوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۲۱
۸۲۔	غالب کے خطوط (جلد دوّم)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۰ ۸
۸۳۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۷۶
۸۴۔	غالب کے خطوط (جلداوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۲۲
۸۵۔	غالب کے خطوط (جلداوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۲۳
۸۶۔	غالب کے خطوط (جلداوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۲۵، ۲۲۶
۸۷۔	غالب کے خطوط (جلداوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۲۷،۲۲۶
۸۸۔	غالب کے خطوط (جلداوّل)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۲۸،۲۲۷
۸۹۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۲۰۳
۹۰۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۱۴۰

باب ششم

خطوط غالب میں سوانحی عناصرکا تجزیہ

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

غالب اُردو ادب کے اعظیم شاعر اور نثر نگار تھے۔غالب ؔ کے خطوط جس کی روشنی سوسال گزرنے کے بعد بھی ماند نہیں پڑی ہے ۔ان کی ادبی خدمات کے اتنے پہلو ہیں جن پر سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ان تمام کتابوں میں ان کے فن اورشخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگرکیا گیا ہے اور پُر امید اور مسرت سے جینے والے باکمال انسان کی شخصیت کو اس دنیاسے روشناس کروایا۔ غالب ؔ کے عہد میں جب تمام معاشرے میں عملی ادبی حلقوں میں فارسی کو مقبولیت حاصل تھی وہی غالبؔ نے اپنے عہدے کے بدلتے ہوئے ماحول کو محسوس کیا۔ سیاسی ، معاشی اور معاشرتی حالات کے بدلتی رفتار کو دیکھ کر فارسی کی جگہ اُردو کو دی اور ۱۸۵۰ء میں اُردو خطوط لکھنے شروع کئے ان کے یہ خطوط اس وقت کے لحاظ سے انو کھے اور دلچسپ تھے۔

مکاتیب غالب میں نواب یوسف علی اور نواب کلب علی خان رام پور کے نام غالب نے ۱۱۵ خطوط لکھے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۷ء میں چھپا امتیاز علی عرشی نے ۱۸۱ صفحات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ مہیش پر شاد، مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکڑ خلیق انجم کے مرتب کردہ مکاتیب زیادہ اہم ہیں۔جب انہوں نے اُردو میں خط لکھنے شروع کئے وہ بڑا پر آشوب دور تھا ، سیاسی ، سماجی، معاشی اور اخلاق قدریں ٹوٹ رہی تھیں۔ غالب بھی معاشی مشکلات کاشکار تھے اُن کی آمدنی کم تھیں اور اخراجات ذیادہ تھے جس سے اُن پر تنگدستی کی صورت پید اہوگئی تھیں اسی وجہہ سے وہ اپنی ظاہری روایات کو زندہ رکھنے کے لیے قرض بھی لیتے تھے ان باتوں کاذکر ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۸۶۵ء میں انہوں نے فارسی نگاری قطعی ترک کردی اور اپنی وفات یعنی ۱۸۶۹ء تک وہ اُردو میں ہی خطوط لکھتے رہے۔ ان کے خطوط کے چار سے ذیادہ مجموعے ہیں یہ تقریبا ۹۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں جن میں خطوط کی تعداد ۸۶۵ کے قریب تھیں۔ اگر چہ رقعات کا شمار تصنیف میں نہیں ہوتا لیکن ایسا ضخیم مجموعہ یقینا غالب کی مستقل تصنیف کہلائے گا۔ ان خطوط میں غالب کی ایجاد کردہ طرزتحریر ہے۔ ان کی شوخی ، ظرافت یا ادبی نکات ہیں یا علمی مباحثہ یا اس کی تشریح یا شاگردوں کے کلام کی اصلاحت ہیں۔

غالبؔ کے خطوط کے مجموعے مختلف ناموں سے منظر عام پر آئے جن میں '' اُردو ئے معلی'' ، ''عود ہندی'' ، ''مکاتیب غالب''، '' نادرات غالب'' اور '' خطوط غالب'' وغیرہ شامل ہیں۔ ''اُردوئے معلی'' غالبؔ کے حیات میں مرتب ہو اور ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ '' عود ہندی '' غالبؔ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

غــالبؔ کــے یہ تمــام مجمــوعے جن میں غــالب نــے اپــنے دوســت، عزیــزوں ، شــاگردوں اور احبــابوں کــو خــط لکھے ان میں غــالب ؔکی زنــدگی کــے مختلــف ســوانحی عناصــر موجــود ہے۔غــالبؔ نــے اِن خطــوط میں اپــنی زنــدگی کــے نجی حــالات، کیفیــات اورتکلیفات کا ذکر اپــنے قریبی دوست احبــاب ســے کیــا ہیں۔جب ہم ان کــے خطــوط کــا مطالعہ کرتــے ہیں تو ہمیں ان کی نجی زندگی کــے اہم پہلوؤں ســے واقفیت ہوتی ہــے اور اِ ن خطــوط میں موجــود مختلــف ســوانحی عناصــر اُجــاگر ہــوتے ہیں۔اِن تمــام ســوانحی عناصر کو ایکجا کیا جائے تو غالب کی سوانحی حیات تیار کی جاسکتی ہیں۔

غالبؔ کــے خطوط کــے چنــد اقتباســات کــا مطــالعہ کــرکے ان میں موجــود مختلــف سوانحی عناصرکا تجزیہ کرتــے ہوئــے غالبؔ کــے زندگی کــے تمام تر پہلوؤں پر روشــنی ڈالیں گئیں ۔

” میں قــوم کــا تــرک سلجوئی ہــوں وہ مــیرا مــادر الہنرســے شــاہ عــالم کــے وقت ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضیعف ہوگی تھی صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ دنشان ســے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پر گنہ ز سیر حاصل ذات کی تنخواہ پایا“۔ ١ــہ

” آپ کو معلوم رہــے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھپھیاں، تین چچــا اور ایــک بــاپ اور ایــک دادی اور ایــک دادا۔ دادی یعــنی اس مرحــومہ کــے ہــونے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کــے مــرنے ســے میں نــے جانــا کہ یہ نــو آدمی آج ایک بار مرگئے۔“ ٢ــہ

پہلے خط غالبؔ نــے مالک رام اور دوسرا خط منشی حبیب اللہ خاں ذکاحیدرآبادی کو لکھا ہے۔غــالب کــے اِن خطــوط ســے یہ بــات عیــاں ہــوتی ہــے کہ غــالب ایــک معــزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کــے دادا ترک وطن تھــے وہ مــدرالنہر ســے شــاہ عــالم کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے۔

غالب کــے اس خط ســے یہ معلوم ہوتا ہــے کہ ان کــے مورث اعلیٰ توران فریــدون تھے۔ جب کمیائی خاندان نــے تمام ایران و توران پر غلبہ حاصل کرلیاتو تمــام تورانیــوں نــے اپنے وطن کو چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ان میں ایــک شــہزادہ امــیر زادے ترسم خان تھا اس نــے سمر قنــد میں ســکونت اختیــار کی یہ غــالب کــے پــردادا تھــے جــو تورانی سلجوتی خاندان سے تھے۔غالب کے دادا قوقان بیگ خاں شــاہ عــالم کــے زمــانے میں سمر قند سے ہندوســتان آئے تھــے وہ اســی ترســم خــان کی اولاد میں ســے تھــے۔اس بات ذکرغالب کــے فارسی خطوط ســے ملتا ہے۔جو مہر نیمروز میں موجود ہیں۔

غالب کے داداقوقان بیگ خاں کے اپنے والدسے کسی وجہہ سے اختلافات آگئے تھے اور وہ نارض ہوکر سمر قند سے ہندوستان آئے تھے۔مرزا کے دادا کی زبان ترکی تھیں اور وہ ہندوستانی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔قوقان بیگ خاں دہلی آنے کے بعد انکی ملاقات ذوالفقار الد ولہ مرزا نجف خان بہادر سے ہوئی۔ذوالفقار الد ولہ مرزا نجف خان بہادر محمد شاہ عالم کے دربار سے وابستہ تھے۔ انھوں نے مرزا کے دادا کو سلطنت شاہ عالم میں ایک عمدہ منصب دِلوایا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ مقرر کردیا۔

مرزا قاقون بیگ خاں کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ دو بیٹوں کے متعلق غالب کے خطوط میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ باقی دو بیٹوں کا ذکر غالب کے خطوط میں موجود ہے ایک غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا اور دوسرے غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں۔غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خان کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی جو سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر تھے اور آگرہ میں رہتے تھے۔مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔

مرزا عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے ۔ ایک مرزا اسداللہ خان (غالب) اور دوسرے مرزا یوسف خاں جو جوانی میں پاگل ہوگئے تھے۔ اور اسی مجنون کی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوگیا۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے۔ اور چند دنوں کے بعد حیدرآباد نظام سرکار اور اسکے بعد الور جاکر راجا بختار سنگھ کی ملازمت کی۔ اسی ملازمت کے دوران ایک زمین دار نے راجہ سے سرکشی اختیار کی۔ اس کی سرکوبی کے لیے جوفوج بھیجی گئی اس میں غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں بھی معہ اپنے دستے کے ساتھ شامل کرلئے گے۔ راج گڑھ کے مقام پرجنگ ہوئی۔ عبداللہ بیگ ایک کولی لگنے سے شہید ہوگئے اس وقت غالب کے علاوہ ان کی اولادوں میں سب سے بڑی ایک لڑکی تھی جس کا نام چھوٹی خانم تھا۔ اس کے بعد مرزا غالب اور ان کے ایک چھوٹے بھائی یوسف مرزا تھے۔

والد عبداللہ بیگ کے انتقال کے بعدان کے چچا نصراللہ بیگ خان نے اپنے بھائی کی اولادوں کی کیفالت کی ذمہ داری لی کیوں کہ وہ اپنے بھائی کے اولادوں سے بے حد محبت کرتے تھے اُن کی خود کی کوئی اولاد نہ تھی۔غالب کے چچا نصراللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبے دار تھے۔ جب انگریزوں کا اقتدار ہندوستان میں بڑا تو صوبے داری کمشنری بدل گئی اور صاحب کمشنر ایک

انگریزی افسر مقرر ہوا۔ لاڈر لیک نے غالب کے چچا کو انگریزی فوج میں رسالداری کا منصب دیا اور انھیں چار سو سواروں کا بریگیڈ پر مقرر کیا۔ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ سال کی جاگیر تا عین حیات مقرر کی۔اخراجات کے لیے آگرہ کے اطراف میں دو پرگنے دئے گئے۔

نصراللہ بیک خان کی بیوی فیروز پور جھرکہ کے جاگیردار نواب احمد بخش بہادررستم جنگ کی بہن تھی۔انگریزوں کے نصراللہ بیگ خان کے سالے نواب احمد بخش سے خوش گوار تعلقات تھے۔نواب صاحب احمد بخش کا لارڈ لیک بہادر سے بھی دوستی اور باہمی اعتماد کا رشتہ تھا۔اس لیے نواب صاحب نے ہی اپنے بہنوی نصراللہ بیگ کو لارڈلیک کے لشکر میں سرکاری فوج میں رسالداری ملازم کروایا تھا۔اور ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دوپرگنے یعنی سونک اور سونسہ جوآگرہ میں واقع ہیں سرکار سے ان کے نام پر مقرر ہوگئے۔ ابھی ذیادہ دن نہ گزرے تھے کہ مرزا نصراللہ بیگ خان ہاتھی سے گر ے۔ اس حادثہ میں ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ شدید طورپر زخمی ہوگئے تھے۔ یہی ان کی موت کا بہانہ ہوا۔اس وقت غالب صرف نو برس کے تھے۔ اب وہ چچا کی شفقت سے بھی محروم ہوگئے۔ انگریزی حکاّم نے نصراللہ بیگ خان کے پسماندگان کے لیے وظیفہ مقرر کردیا۔

غالب کے سر سے والد اور چچا دونوں کا سایہ اُٹھ گیا تو غالب اپنے ننھیال میں نانا کی سرپرستی میں چلے گئے۔ان کے ناناخواجہ غلام حسین خان کمیدان بھی حکومت کے ایک اچھے فوجی عہدہ پر فائز تھے اور آگرہ کے رئیسوں میں شمار کئے جاتے تھے۔چچاکے انتقال کے بعد غالب نانا ہی کے مکان میں رہے۔ ان کی والدہ عزتّ النساء بیگم تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔غالبؔ نے خود کئی جگہ خطوط میں ان کا ذکر کیا۔ان کے ننھیال میں جو حویلی ان کو رہنے کے لیے دی گئی تھی اسکا اور اس کے ہمہ سایہ مکانات کا ذکر غالب کے اپنے خطوط میں موجود ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے نانا کی آگرہ میں اچھی خاصی ملکیت تھی اور وہ جاگردارنہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لیے مرزا غالب کا بچپن اور جوانی بھی بڑے نازو نعم میں بسر ہوا۔

’’ میں ؁۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں، اب کے رجب کے مہینے سے اُنہتروان برس شروع ہوا ہے۔‘‘ ۳

یہ خط کا اقتباس ہے جو غالب نے نواب علاء الدین کو ۱۲۸۰ھ میں لکھا تھا۔ اس خط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غالب کا نام اسداللہ بیگ خاں، مرزا نوشہ عرف، نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ، ۸ رجب اواخر ۱۲۱۲ھ یعنی ۲۷ ،اکتوبر

۱۷۹۷ء کو اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ غالبؔنے نواب صاحب ممدوح، منشی حبیب اللہ خاں ذکاؔ، خواجہ غلام غوث خان بخبر کو بھی لکھے خطوط میں یہ بات ظاہر کی کہ وہ اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے ان کواکہتر برس شروع ہوگیا۔اس طر ح غالب نے اپنے خطو ط میں اپنے پیدائش کا ذکر کیا ہے۔

"میں نے ایام دبستان نشینی (مکتب کی تعلیم کا زمانہ) میں شرح مائتہ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کرفسق و فجور یاعیش و عشرت میں مہنمک ہوگیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری وطبعی تھا۔" ۴ـہ

درجہ ذیل خط سے یہ معلوم ہوتا ہے غالب کی تعلیم و تربیت ابتدا میں گھر پر ہی ہوئی۔اُن کی والدہ ایک معزز خاندان کی تعلیم یافتہ خاتون تھی اس لیے اتبدائی تعلیم غالب نے اپنی والدہ سے حاصل کی جس بات کا ذکر غالب کے خطو ط میں موجود ہیں۔اُس زمانے میں دستور کے مطابق مرزا صاحب نے مکتب میں ناظرہ قرآن شریف اور فارسی عربی کی چند درسی کیابیں پڑھیں۔ باقاعدہ تعلیم انہوں نے آگرہ کے مشہور استاد شیخ معظم سے حاصل کیں۔ عربی اور قواعد کی چند کتابیں پڑھی۔ ان کی ذیادہ توجہ فارسی پر رہی۔ اپنی تعلیم کے متعلق انھوں نے کئی خطوں میں ذکر کیا ہے۔

"نا گاہ ایک شخص کی ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا مظق و فلسفہ میں مولانا فصل حق مرحوم کا نظیراور مومن، موحد، صوفی، صافی، میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا۔ اور لطائف فارسی بحت (خالص فارسی بے آمیز ش عربی) اورغوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے مرے حال ہوئے، سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ذہن محوج (کند) نہ تھا زبان دری سے پیوندازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہوگئی۔" ۵ـہ

غالبؔ نے اعلیٰ تعلیم ،فارسی اور دیگر علوم کی استاد ملا ّعبدالصمد ایرانی سے حاصل کی۔ غالبؔ کے زمانے میں ایران کے ایک امیر ذادے ہندوستان آئے جو فارسی علوم کے ماہر تھے۔ وہ مذہب کے پارسی تھے بعد میں انھوں نے اسلام مذہب قبول کرلیا اور اپنا نام عبد الصمد رکھا۔ یہ ماہر فارسی فاصل شخص ۱۸۱۰ء میں سیر وسیاحت کے لیے ہندوستان آئے تھے اور اکبرآباد میں مقیم ہوئے۔ اس وقت غالب چودہ برس کے تھے۔ مرزا غالب نے ان کو دو برس تک اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان سے باقاعدہ فارسی ادبیات اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کیں۔

غالب نے اپنے اُستاد عبدالصمد سے استفادہ حاصل کیا اور اُستاد نے بھی ان کو ذہن اور قابل پاکر ذیادہ سے ذیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔غالب نے اپنے اُستاد عبدا لصمد کا ذکر اپنے کئی خطوط میں کیا۔غالب نے ملا ّ عبدالصمد سے صرف

دوسال تعلیم حاصل کی لیکن غالب نے ان دو سالوں مین بڑی محنت اور توجہ سے سیکھا اور فارسی میں ماہر ہوگئے۔

اس طرح غالب قیام آگرہ ہی میں تحصیل علم سے فارغ ہوگئے اور اپنے فطری شوق سے مطالعہ کتب میں مشغول ہوگئے۔اور جب دلیؔ میں قیام ہوا تو بڑے بڑے عالموں ، فاضلوں اور شاعروں کی صحبتوں نے اُن کے علم کو مزید جِلا بخشی۔

آگرہ میں غالب محلہ گلاب خانہ میں ذیادہ وقت تک مقیم رہے۔ یہ محلہ فارسی زبان کے ماہرین کا تھا۔اور اسی محلہ میں مولوی محمد معظم اور ان کے بھائی کا مکتب بھی تھا۔ اس محلہ کا ماحول ادبی اورعلمی تھا اور غالب کا اس سے متاثر ہونا لازمی تھا۔غالبؔ کی مختلف تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کی علم صرف ، علم نحواور علم تاریخ پر کامل عبور حاصل ہوگیا تھا۔ وہ عربی سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ علم نجوم کے علاوہ تصوف کی اکثر کتابوں کا مطالعہ کرچکے تھے اور علم طِب سے بھی واقف تھے۔

”۷ رجب ۵۲۲۱ ھ کو میرے واسطے حکم دوام جس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں دال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔“ ۶ے

یہ خط غالب نے مرزا علاء الدین علائیؔ کے نام تحریر کیا جو اُردو معلی میں موجود ہے اس خط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ غالب کی شادی ۷ٍ رجب ۱۲۲۵ھ کو نواب اِلٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ شادی کے وقت غالب کی عمرتیرہ سال تھی اور اُن کی بیوی کی عمر گیارہ سال تھیں۔ غالبؔ کے خسر نواب الہیٰ بخش خان بہادر بڑے معزز امیر و رئیس تھے۔ وہ نواب احمد بخش خان رستم جنگ، والی فیروز پور جھرکہ اور رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے عبادت گزار تھے۔ معروف شاعر بھی تھے۔ ان کا دیوان بھی شائع ہوچکا تھا۔ غالب کی بیوی امراؤ بیگم بھی بڑی دین داربی بی تھیں اور غالب سے بے حد محبت کرتی تھیں مگر غالب کی شراب نوشی سے اعتراض کرتی تھیں اُن سے خفا رہتی تھی۔ اس کے باجود ان کے آپس میں خوشگوار تعلقات رہے ۔ ایک وقت کا کھانا عموماً غالب اپنے بیوی کے ساتھ گھر پر ہی کھاتے تھےشادی کے بعد انھوں نے دلیؔ ہی میں سکونت اختیار کرلی۔

غالب کے یہاں سات بچےّ پیدا ہوئے۔ لڑکے اورلڑکیاں دونوں ہوئے مگر کوئی پندرہ ماہ سے ذیادہ زندہ نہ رہے۔ غالب کواولاد نہ ہونے کا بہت افسوس تھا۔اس لیے انھوں نے اپنی بیوی کی بڑی بہن بنیادی بیگم جو نواب غلام حسین کی بیوی تھیں ان

کے دو بیٹے تھے ان میں سے ایک بیٹے کو غالب نے گود لے لیا۔جس کا نام زین العابدین تھا۔ اس سے غالب بے حد محبت کرتے تھے۔وہ بھی بڑا ہو کرنہایت خوش گو شاعر ہوا۔ اور عارفؔ تخلص استعمال کرتا تھے۔غالب اس سے بے حدخوش تھے لیکن بد قسمتی سے اسکی عین جوانی کے عالم میں وفات ہوگئی۔ جس کا غالب پر بہت گہرا اثر ہوا۔اور غالب نے اُردو میں پُردرد مرثیہ لکھ کر اپنے غم کا اظہار کیا۔

زین العابدین عارفؔ کے دو کمسن بچےؔ تھے ان کی پرورش کاذمہ داری غالب نے اپنے سرلے لی۔ ایک کا نام باقر علی خان اور دوسرے کا حسین علی خان تھا۔ یہ دونوں کو بھی شاعری کا شوق تھا۔ مرزا باقر علی خان فارسی میں باقرؔ اور اُردو میں کاملؔ تخلص استعمال کرتے تھے۔

’’ میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اوراس محلہ کا نام بھی بلی ماروں محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوست میں نہیں پایاجاتا۔واللہ ڈھونڈ نے کو مسلمان ملتا،کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ سہنودالبتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔ اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ!میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نودس برس سے کرایے کو رہتا ہوں۔‘‘ ۷ے

یہ خط غالب نے روز شنبہ یکمؔ جنوری ۱۸۵۷ء وقت نمر وز میں لکھا ہے۔جو اُردو معلی صفحہ نمبر ۲۷۲ پر موجود ہے۔ غالبؔ کا سات برس کی عمر سے دلیؔ آنا جانا تھا۔ جب وہ دلیؔ میں مقیم ہوئے تو ابتداء میں شعبان بیگ کی حویلی میں رہے۔ غالبؔ کی دلیؔ میں مستقل سکونت ۱۸۱۶ء میں ہوئی جب وہ ۱۹ برس کے تھے۔ دلیؔ میں وہ کرایہ کے مکانوں میں رہے ان کا کوئی ذاتی مکان نہ تھا۔

بہادر شاہ ظفر کے پیر و مرشید ، حصرت کالے شاہ صاحب جو غالب کے قریبی تھے اور غالبؔ سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے غالبؔ کو گلی قاسم جان میں اپنی مکان کرایہ کے بغیر رہنے کو دیا تھا۔ شعبان بیگ کی حویلی کے بعد یہ پہلا مکان تھا جس میں غالب نے قیام کیا۔ کچھ عرصہ بعد کالے شاہ صاحب کی حویلی سے حکیم محمد حسین خان کی حویلی کرایہ پر لے لی۔ یہ ۱۸۵۲ء کے ابتدا کا واقعہ ہے یہ مکان خراب حالات میں تھاستمبر ۱۸۶۵ء میں غالب نے اس مکان کو بھی بدل کر ایک دوسرا مکان کرایہ پر لیا۔اس کا کرایہ اس وقت ساڑھے پانچ روپیہ ماہوار تھا۔ غالبؔ اسی مکان میں اپنی وفات تک رہتے تھے۔یہ مکان بلّی ماران میں گلی قاسم جان کی طرف موڑ پر قائم تھا جس کا ذکر غالبؔ نے مذکورہ خط میں کیا۔ غالب کو ذاتی مکان زندگی بھر میسرا نہ ہوا ہو کرایہ کے مکانون میں ہی رہایش رہی۔ مرتے دم تک

دلّی میں قیام رہا، یہی شہرت پائی۔ جس طرح کی زندگی گزارنے کے وہ آرزومند تھے اس کے لئے دلیؔ موزوں تھی۔ وفات کے بعد دِلّی ہی میں سپرد خاک کیے گئے۔

”مرزا تفتہ۔ ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجب نشاط مفرط ہوگا۔میں اجراے پنشن سرکارانگریزی سے مایوس تھا۔بارے وہ نقشہ پنشن داروں جو یہاں سے بن کر صدرکو گیا تھااور یہاں کے حاکم نے نسبت میرے صاف لکھ دیا تھاکہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کہ حاکم کے راے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا میں نے بھی سُنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آیندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنحواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھاچاہئے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔“۸ـہ

غالبؔنے یہ خط مرزا تفتہؔکو ۱۶ ؍ اپریل ۱۸۶۰ء میں لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے پنشن کے مقدمے کا ذکر کیا ہے جس کا اثر ان کی زندگی پر پڑا تھا۔ غالبؔ کو جو پنشن انگریزی سرکار کی طرف سے ملتی تھی وہ بند ہوگئی تھی جس کی وجہہ سے وہ بہت پریشان تھے اور اسکو پانے کے لیے وہ سرکاری کاروائیاں کرتے رہے۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنے خطوط میں کیا۔

غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خان کے انتقال کے بعد چچا نصراللہ بیگ خان نے ان کی کفالت کی۔ چچا نصراللہ بیگ خان لارڈلیک فوجی دستے کے رسالہ دار تھے۔ انھیں جاگیر اور پندرہ ہزار آٹھ سو روپیہ تنخواہ ملتی تھیں۔ اچانک ان کا انتقال ہوگیا توجاگیر واپس لے کر ان کے متعلقین کے لیے دس ہزار روپے سالانہ رقم مقرر کردی گئی۔ اور نواب احمد بخش خان کو سرکارنے ہدایت دی کے وہ دس ہزار روپے اپنی مال گزاری میں سے نصراللہ بیگ کے وارثوں کو دیے جائیں۔ اس کے بعد دوسرا حکم نامہ حاصل ہوا جس میں پانچ ہزار روپے دینے اور ان پانچ ہزار کی تقسیم کے بارے میں لکھا تھاکہ پندرہ سوروپے سال مرزا نوشہ غالبؔ کو اور ان کے بھائی مرزا یوسف کو اور دوہزار روپے سال خواجہ حاجی کو دیے جائیں۔ خواجہ حاجی نصراللہ بیگ کا رشتہ دار نہیں تھا بلکہ وہ ان کے رسالہ میں ملازمت کرتا تھا اور اُس کا نصراللہ بیگ خان کے خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا۔دو ہزار روپے خواجہ حالی کو غلط دیے جارہے تھے یہ بات غالبؔ کو نا گوار تھی۔

غالبؔ نے اس سلسلے میں انگریز افسروں سے ملاقاتیں کیں اور اس کے لیے کلکتہ تک کا سفر کیا۔ بہت کوشش کی کہ پانچ ہزار روپے غالب کو ہی ملے۔ لیکن تمام کاروائیاں در ہوگئی پر غالب نے ہمت نہیں ہاری اور کوشش جاری رکھیں۔آخر کار

کامیاب ہوئے۔ اور مئی ۱۸۶۰ء کو تین سال کی رُکی ہوئی پنشن کی رقم واپس مل گئی۔ اس بات کا ذکر غالب کے خط میں موجود ہے جو مرزا تفتہؔ کو تحریر کیا ہے۔

غالبؔ نے اس خط میں تفتہؔ کو یہ بات بتائی کہ وہ سرکار انگریز سے مایوس تھے کیوں کہ انگریز سرکارنے غالبؔ کا نام پنشن داروں کے نقشہ سے رد کردیا تھا اور کہا کہ غالبؔ پنشن پانے کے مستحق نہیں ہے۔ لیکن گورنمنٹ نے اس کے برخلاف غالبؔ کی پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور مئی کی پہلی تاریخ کو جب تنخواہ کا بٹنا شروع ہوگا تو غالب کو بھی پنشن ملنے لگی۔غالب کی مذکورہ خط تحریر سے ہمیں اس بات کی تفصل ملتی ہے۔

"نواب یوسف علی خاں بہادر بیس تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگردہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۹۵۸۱ ؁ء سے سوروپیہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں بلاتے رہتے ہیں۔اب میں گیادو مہنیے رہ کرچلاآیا۔ بشرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سورروپیہ مہینہ یہاں رہوں وہاں رہوں۔ خدا کے ہاں سے میرا مقررہے۔" ۹؎

غالبؔ نہ یہ خط ۳۱ ، مارچ ۱۸۶۲ء کو مرزا تفتہؔ کو لکھا ہے۔ خط کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ غالب کو ملنے والے وظیفہ ہی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔نواب رام پور سے بھی غالبؔکے اچھے تعلقات تھے۔ غالب نے یوسف علی خان کوجو رام پور کے نواب تھے فارسی پڑھائی تھی۔ یوسف علی خان غالب کے شاگرد بھی تھے اور غالب ان کے کلام کی اصلاح بھی کرتے تھے۔نواب یوسف علی خان کی ریاست رام پور سے غالب کو سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اس رقم کے علاوہ بھی نواب صاحب سے کچھ نہ کچھ رقم ملتی رہتی تھیں جس کا ذکر غالبؔ کے مذکورہ بالا خط سے ملتا ہے۔

غالب رام پور اکثر جاتے رہتے تھے اس خط میں گیارہ مہینے رام پور میں رہنے کا ذکر آیا ہے۔ برسات میں آنے کا اِرادہ بھی غالب نے یہاں ظاہر کیا ہے۔یعنی غالب رام پور گرمیوں کے موسم بھی گئے ہوگئے ۔ نواب صاحب غالبؔ کے وظیفہ کو باقاعدہ ہرماہ بھجتے رہتے کبھی ناغہ نہ کرتے۔

غالبؔ کی آمدنی کا ذرائع ماہانہ اور سالانہ پنشن ہی تھی۔ اس کے علاوہ انعام امداد یا نذرانے مل جاتے تھے۔قلعہ معلی میں غالبؔ کو ۱۸۵۰ء میں بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے تاریخ تیموری لکھنے پر مامور کیا تھااور پچاس روپیہ اس کام کی تنخواہ مقرر تھی۔

”یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیرالدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن پانچ ہزار روپیہ کے بھیجنے کا حکم ہوا۔“ ۱۰ے

دوشنبہ ۱۹, اگست ۱۸۶۱ء کو غالب ؔکے یہ خط مرزا تفتہؔ نے نام تحریر کیا۔ سلطنت اودھ سے بھی غالبؔ کا تعلق رہا۔ نواب واجد علی شاہ نے غالبؔ کو قصیدہ گوئی اور مدح گوئی کے عواض پانچ سو روپے سالانہ مقرر کیاتھا۔ غالبؔ نے نصیرالدین حیدر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھاجس سے خوش ہو کر نصرالدین نے غالب کو پانچ ہزار روپے بطور انعام دیے تھے جس کا ذکر غالبؔ کے خط کے اقتباس سے ہوتا ہے۔ مذکورہ خط جو غالب نے مرزا تفتہؔ کو لکھا اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے۔ قصیدہ منشی محمد حسین کی مرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے ہاتھ نصیرالدین کے پاس بھیجا۔ جس کو پڑھا کر نصیرالدین بے حد خوش ہوا ۔ اُسی دن پانچ ہزار روپیہ دینے کا حکم دیا۔

ریاست الور جے پور، گوالیا اور پٹالہ سے بھی غالب کو انعام و اکرام ملتے رہتے تھے۔ وہاں کے نواب غالب کی بے حدقدر و عزّت کرتے تھے۔ نواب صاحب دل کے رئیس بھی تھے غالب کی قدردانی کرتے اور اُن کو کچھ نہ کچھ نذرانے دیا کرتے تھے۔

”بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ اِدھر متھراداس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول نہ سود۔اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سرباایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوادیا کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکڑی کے، سوروپے رام پور کے قرض دینے وال ایک میرا مختار کار۔ وہ سودماہ بہ ماہ لیا چاہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکی دار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدام بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمدوہی ایک سوباسٹھ تنگ آگیا۔ گزار مشکل ہوگیا۔“ ۱۱ے

غالبؔ نے یہ خط علاء الدین علائیؔ کو ۲۷, جولائی ۱۸۶۲ء میں لکھا تھا۔ اس خط میں اپنے قرض اور خرچ کا ذکر کیا۔ اُن کا ماہانہ خرچ تین سو روپے سے کم نہ تھا۔ اور آمدنی ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے تھی۔ گویا ایک سو چالیس روپے ماہوار کا قرض لینا پڑتا تھا۔ یعنی آمدنی کم اور خرچ زیادہ تھا جس کی وجہہ سے ان کو قرض لینے پڑتا تھا۔ امیروں اور رئیسوں کی طرح زندگی گذارتے تھے۔ آمدنی کم اور خرچ

زیادہ کرتے تھے۔اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے مہاجنوں سے سودی قرض لیا کرتے تھے۔ ماہ بہ ماہ سود کی رقم ادا ہوجاتی اور قرض کی رقم مول باقی رہتی تھی۔ کھانے کا خرچ ان کی والدہ آگرے سے بھیج دیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کی پھوپھی اور کبھی خان الور سے کچھ مل جاتا تھا۔ اور دیگر اخراجات انکم ٹیکس، چوکی دار قرض کی مول رقم، گھر کے خرچ باقی ہوتے۔ ایک سو باسٹھ روپے میں ان تمام اخراجات کی ادائیگی نہ ممکن تھی گذار مشکل سے ہوجاتا تھا۔غالب کی سارسی زندگی اپنی انا ّکی حفاظت میں گزری، کبھی تو اپنی حالت کا مذاق اُڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔

غالبؔ نے جو قرض لیے تھے اس کی ادائیگی نہ ہوسکی اس وجہہ سے اُن کی عزت جاتی رہی۔انا کو ٹھیس لگی۔ غالبؔ نے اپنی کمزوریاں، معاشی، بدحالیوں کو مزاحیہ انداز سے بیان کرکے اپنے زخم اور دلی ِکفیت ، ذہنی کرب اور شدت کا احساس دکھاتے رہے۔غالبؔ اپنے ذُکھ درد کو بڑے مزے لے کر بیان کرتے تھے اور اپنے دوستوں سے خطوط میں اس حالت و کیفیت کا ذکر کرتے رہتے۔

قلعے سے جو ماہوار تنخواہ ملتی تھی وہ بھی چھ ماہی ہوگئی۔ وظیفہ بند ہوچکا تھا جس کا اثر مالی حالت پر پڑا۔شراب نوشی کی بُری عادت نے ان کے خرچ کو بڑھادیا، جو خاندانی پنشن ملتی تھی وہ بھی بند ہوگئی۔ اس کے لیے غالب نے مقدمہ لڑتے رہے اور مقدمے کی کامیابی کی اُمید پر وہ خوب قرض لیتے رہے تاکہ پنشن کی بقایا رقم مل جائے تو قرض اداکریں گے مگر ان کو نا کامیابی ملی۔ اور قرض بڑھتا گیاقرض دار پریشان کرتے رہے یہ حالت ہوگئی کہ وہ دن میں قرض داروں کے تقاضوں کی وجہہ سے گھر سے باہر نہیں جاتے تھے۔ رات کو ملنے ملانے جایا کرتے تھے۔

غالبؔ نے اپنی مالی پر یشانی کا ذکر اپنے خطوط میں کیا ہے۔بہر حال غالبؔ زندگی بھر مالی پریشانیوں میں گھِرے رہے۔ لیکن اپنا خرچ کم نہ کرسکے۔

" اگر چہ میں وطن میں نہیں ہوں لیکن وطن سے قریب ہونا قیامت سے کچھ کم نہیں اب تک اہل کاشانہ کے ساتھ نامدو پیام کا سلسلہ جاری ہے لیکن جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے وہ آشوب چشم کا درجہ رکھتا ہے جو سننے کو ملتا ہے وہ زحمت گوش، کے علاوہ کیا ہے۔ میں موج کے ان تھپٹیر وں سے جونیم جان لے کر باہر آیا ہوں شاید وہ خاک فیروزپور کی امانت ہے مجھے بہ جبرو کراہ اس قیام پرراضی ہونا پڑا۔ اپنی موت جو میں ہزار آرزو کے ساتھ خدا سے چاہتا ہوں شاید اس کے لیے سرزمین

موعود یہی فیروزپور ہے لیکن بوجہ افتادگی یہاں کے قیام میں اس قدر ورنگ واقع ہورہی ہے۔"

مندرجہ بالا خط غالبؔ نے بنام رائے چھج مل کھتری کو لکھا تھا۔ یہ فارسی خط جس کا ترجمہ اوراقِ معانی سے لیا گیا ہے۔ غالبؔ نے اپنے وظیفہ کے مقدمے کے سلسلے میں کئی سفر کئے۔ وطن سے دور فیروز پورجھرکہ میں تھے لیکن وہاں سے اپنے اہل خانہ سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ فیروز پور چھرکہ میں بھی ان کا مقصد حاصل نہیں ہوا اس کا ان کو بہت افسوس ہوا۔ان کو نہ چاہتے ہوئے بھی فیروز پور قیام کرنا پڑاکہ کوئی نہ کوئی حل مل جائے۔ لیکن کچھ کامیابی نہیں ملی۔ اسی ذہنی حالت ُمبتلا اور تشویش کے ساتھ غالب نے فیروز پور چھرکہ سے لوٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ احساس آدمی تھے اور اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی جانتے تھے۔ فیروز پور جھرکہ سے مایوس ہوکر غالب نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

غالبؔ نے کانپور کا سفر کیا۔ تاکہ وہ سر چارلس مٹکاف سے مل کر اپنی پنشن کے بارے میں انصاف کی اپیل کرسکے۔ لیکن جب وہ کان پور گئے تو بیمار پڑگئے۔ اس شہر میں کوئی اچھا طبیب نہ ملنے کی وجہہ سے ان کو مجبوراً دریائے گنگا کے راستے لکھنو ٔ کے لیے روانہ ہونا پڑا۔

"دوسرے دن ایک بیل گاڑی کرائے پر مل گئی۔ صبح کے وقت گنگا کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ہوا کی طرھ تیزی سے پانی پر سے گزرا پائے شوق کے ساتھ بنارس کی طرف سرگرم سفر ہوگیا۔ جس دن بنارس پہنچا، بادۂ جانفز اور ٹھندی ٹھندی ہوا، مشرق کی طرف سے چل رہی تھی۔ جس سے میری جان کو طاقت ملی اور دل میں تازگی پیدا ہوگئی۔ اُس ہوا کے اعجاز نے اس غبار کو علم فتح کی طرح بلند کردیا۔" ۱۳ے

اس خط میں غالبؔ نے الہ آباد سے بناس کا سفر کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ۱۸۲۵ء سے لے کر ۱۸۲۷ء کے درمیان بنارس کا سفر کیاور وہاں قیام کیا۔ یہ خط غالبؔ نے محمد علی خان کو لکھا ۔ جس میں بنارس کے سفر کی روداد لکھی ۔

غالبؔ نے اپنے پنشن کے مقدمے کے لیے کلکتہ کا سفر کیا۔ کانپور کے راستے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئےکلکتہ کے لیے کانپور کے راستے باندہ ، الہ آباد اور بنارس شہر سے گزرنا پڑتا تھا۔ اُس زمانے میں ریل گاڑی نہیں تھی، سفر کے لیے کشتی، پالکی، گھوڑے گاڑی سے سفر طے کرنا پڑتا تھا۔غالب نے سفرکبھی گھوڑے پر کبھی گھوڑے گاڑی پر کیا ذیادہ سفر گنگا میں کشتی کے ذریعہ طر کرنا پڑا۔ اسی طرح وہ الہ آباد پہنچے گئےوہاں سے دوسرے دن بنارس کے سفر پر نکلے۔ دورسرے دن ایک بیل گاڑی کرائے پر لی اور وہ صبح کے وقت گنگا کے ساحل پر

پہنچ گئے اور پھر کشتی کے ذریعے گنگا کا سفر کرکے بنارس پہنچ گئے۔ گنگا کے پانی پر ہوا کی طرح گزر نہ پڑا اور جس دن مشرق کی طرف سے ملنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے غالب کو طاقت و سکون ملتا گیا اور دل میں تازگی پیدا کرنے والی کفیت پیدا ہوئی۔اس وجہہ سے غالبؔکو بنارس کی ہوا اور بنارس شہر بہت پسند آیا۔ جس کی خوبصورتی کا ذکر انھوں نے اپنے خطوط میں دل کش انداز میں کیا۔ بنارس ہندوستان کا تاریخی اور ہندوسماج کا مقدس شہر ہے۔ بنارس کی پرسکون فضاء اور وہاں کا رومانی ماحول غالب کے دل کو خوش کردیتا ہے۔ غالبؔ کا بحیثیت شاعر اس رومانی ماحول سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ غالبؔ نے اپنے قیام بنارس کے دوران ایک سو آٹھ ابیات پر مشتمل ایک مثنوی ‘‘ چراغ دیر ’’ کے نام سے لکھی جو غالب کے فارسی دیوان میں موجود ہے۔اس مثنوی میں بنارس کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ بنار س کی سماجی اور مذہبی اہمیت کے علاوہ قدرتی مناظر ، عبادت خانے گنگا کے کنارے اشنان کے مناظر یہاں کے فطری حُسن کو اپنی مثنوی میں دل کش انداز میں پیش کیا۔غالبؔ نے اس شہر کی تعریف میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ جس کا ذکر غالبؔ نے اپنے خطوط میں بھی کیا اپنے دوست و احباب کو بھی اس شہر سے واقف کروایا۔

” مسٹراندرواسٹرلنگ کو میرے حال پر رحم آیا، ایک انگریز افسر ہے اور اعیان کو نسل میں سے ہیں۔ نیز ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگاکہ وہ دردمندوں کے چارہ ساز اور خستہ خاطروں کے غم گسا ر ہیں۔اگر چہ میرایہ دل کہ ایک مدّت سے مایوسیوں کا خوگر ہے، یکایک نا امّیدی کے رشتے کو منقطع بھی نہیں کرسکتا۔ پھر بھی یہ مردِ   تو انادل اپنی کام بخشی سے کہ جادوکا سا حکم رکھتی ہے مجھ میں اور میرے احساس نامرادی میں ایک دائمی جدائی کی طرح ڈال دے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔“ ۱۴ ؎

مذکورہ خط غالبؔ نے مرزا علی بخش بہادر کے نام لکھا ہے۔ جب غالب پنشن کے مقدمے کی کاروائی کے سلسلے میں کلکتہ گئے تھے۔کلکتہ میں غالب کو اپنے مقدمے کی کاروائی آگے بڑھانے کے لیے انگریزی حکاّم سے جلد از جلد ملنا تھا۔ایک نگریزی افسر جس کا نام مسٹر اندرو اسٹر لیک تھا اس سے غالبؔ ملاقات کرنا چاہتے تھے اور اپنے پنشن کے مقدمے کا ذکراس خط میں ملتا ہے کہ مسٹراندرو اسٹرلیک کو غالب پر رحم آیا اور وہ ان کے پنشن کو شروع کرنے کا حکم دے۔ یہ انگریز افسر عیان کونسل کا رُکن ہے جس کے بار ے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ درد مندوں کے ہمدرد ضرورت مندوں کی مدد کرتا تھا۔ اور غالب کا دل ایک عرصے سے نا اُمیدوں اور مایوسیوں کی وجہہ سے پریشان تھا۔ غالبؔ کا خیال تھا کہ وہ نا امیدی کو اپنے

اوپر حاوی نہیں کرسکتے اور کہتے تھے کہ اگر انسان کوشش کرے تو اُس کو کامیابی ضرور ملتی ہے۔

اُس وقت شہر کلکتہ ہندوستان کی نیا مرکز حکومت کا دفتر تھا۔ جہاں غالب کے پنشن کا مسلہ بھی حل ہوسکتا تھا۔ اس لیے غالب طویل سفر پر نکاگئے۔ اور وہاں جاکر انگریز حکاّم سے ملاقات کرکے اپنے مقدمہ کی کاروائی کو آگے بڑھا سکیں۔ وہاں کو رہنے کے لیے جو کرایہ کا مکان ملا تھا وہ بہت کشادہ تھا۔ کلکتہ کی آب و ہوا خوش گوار تھی جو غالبؔکے صحت کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ وہاں گرمی کی شدت کو کم کرنے والے ناریل کے تازہ پانی غالبؔ کے صحت کے لیے سود مند ثابت ہوا۔یہ شہر مرزا غالب کو بہت پسند آیا۔کلکتہ کا سفر غالبؔ کے زندگی کا سب سے لمباسفر تھا۔ا س سفر میں پیش آنے والی تمام پریشانیوں کا غالب نے اپنے خطو ط میں اکثر جگہ ذکر کیا ہے۔

" مرزا یوسف سراپا ننگے رہتے تھے اور دیوانگی کی وجہ سے کسی ایک جگہ آرام سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ماں کو ماں اور بہن کو بہن نہیں سمجھتے تھے۔ ۷۲ رمضان کو مجھے دہلی سے ایک خط ملا۔ خط کے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نظر پڑتے ہی میں نے پہچان لیا کہ میرے بھائی کی تحریر ہے۔ جب میں نے غورسے دیکھا تو معلوم ہواکہ مرزا یوسف ہی کا خط ہے، جواس نے خود لکھا ہے۔ اس میں القاب و آداب پوری ہوش مندی کے ساتھ لکھے گئے تھے۔ میں خوشی سے ناچنے لگا۔ اتنا خوش ہوا کہ روپڑا۔" ۱۵ ؎

یہ خط غالبؔ نے نواب مولانا محمد علی کو تحریر کیا جب وہ کلکتہ میں تھے ۔ غالب اپنے عزیزوں اور اہل خانہ کے لیے فکر مند تھے۔اپنے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کی بیماری کی وجہہ سے وہ کافی پریشان رہتے تھے۔مذکورہ خط سے یہ بات عیاں ہوتی ہے۔مرزا غالبؔ کے بھائی یوسف مرزا اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے۔ وہ سراپا ننگے رہتے تھے اور دیوانگی کی وجہہ سے کسی ایک جگہ آرام سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ماں کو ماں اور بہن کو بہن نہیں سمجھتے تھے۔ غالبؔ کے اہل خانہ بہت پریشان تھے۔ دور رہے کر بھی ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔ ۲۷ ؍ رمضان کو غالب کو کلکتہ میں دہلی سے ایک خط ملا، جوان کے بھائی یوسف مرزا کا لکھا ہوا تھا۔غالب نے خط کے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نظر پڑتے ہی پہچان لیا کہ وہ اُن کے بھائی کی تحریر ہے۔جب غالب نے اس خط کو غور سے دیکھا تو ان کو یہ معلوم ہوا کہ مرزا یوسف ہی کا لکھا ہوا ہے اس خط میں تمام القاب و آداب پوری ہوش مندی کے ساتھ لکھتے گئے تھے غالبؔاتنا خوش ہوئے کے روپڑے۔ غالبؔ کے اس عمل و حرکت کی

وجہہ یہ تھی کہ ان کا بھائی پوری طرح ٹھیک ہوگیا ہیں اس خط کی تحریر اس بات کا ثابت تھی۔اس بات سے غالبؔ کو بے حد خوشی ہوئی اور ناچنے لگے۔

بھائی،

"میں نے دلی کو چھوڑ اور رام پور کو چلا۔ پنچشنبہ انیس کو مراد نگر اور جمعہ بیس کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ اکیس کو بھائی مصطفےٰ! خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہجہاں آباد، پر سوں گڑھ مکٹیشر رہوں گا پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔ اب جو مجھ کو خط بھیجو رام پور بھیجنا۔ سرنامہ پر رام پورکا نام اور میرا نام کافی ہے اب اسی قدر لکھنا کافی تھا۔ باقی جو کچھ لکھنا ہے، وہ رام پورسے لکھوں گا۔" ۱۶ ؎

مندرجہ بالا خط غالبؔ نے ہر گوپال تفتہؔ کے نام تحریر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے رام پور کے سفر پرجانے کا ذکر کیا غالب رامپور کے لئے ۱۹ ؍ جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے روانہ ہوئے میٹرھ سے ہوتے ہوئے شاہ جہاں پور اور مراد آباد سے رام پور کو پہنچے۔

'' دہلی چھوڑا اور رام پور کو چلا '' غالب کے اس جملے سے رام پور کو جانے کی اطلاح ملتی ہے کہ ۲۰ ؍ جنوری کو میٹرھ پہنچے اور وہاں مصطفےٰ خان کے گھر قیام کیا۔ مصطفےٰ خان کے گھر سے ہی یہ خط ہرگوپال تفتہؔ کو لکھا بھیجا۔ آگے کے سفر کی معلومات بھی دی کہ وہ شاہ جہاں آباد اور مراد آباد ہوتے ہوئے رام پور چلے جائے گئے۔

غالبؔ نے تفتہؔ سے کہا کہ وہ غالبؔ کو خط بھیجنا چاہتے تو رام پور بھیجنا سرنامہ پر یعنی خط کے پہلے ورق پر رام پور کا نام اور غالب کانام لکھنا کافی ہے۔ اس پتے پر غالب کو تفتہؔ کا خط مل جائے گا۔

"یہاں جشن کے وہ سامان ہورہے ہیں کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا شہر سے دوکوس پر آغا پور نام ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے پرسوں صاحب کمشزبہادربری مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خمیوں میں اُتر نے۔ کچھ سو صاحب اور نیم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان کل س شنبہ ۵ دِسمبر حضور پرْ نور بڑے تجمّل سے آغا پور تشریف لے گئے ممکن دو بجے گئے۔ اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خان،سے باتیں میں سے روپے پھنیکتا ہوا آتا تھا۔" ۱۷ ؎

غالب کا درجہ بالا خط علاء الدین علائی کو لکھے ہے۔ غالبؔ ماہ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دوسری مرتبہ رامپور گئے اُس وقت نواب یوسف علی خان کی وفات کے بعدنواب کلب علی خان کو تخت نشین کیا جارہا تھا۔کلب علی خان کی تخت نشینی کے جشن میں غالبؔ کو بھی مدعد کیا گیا۔ اس جشن کی تیاری بہت زور و شور سے ہورہی تھی۔ غالبؔ نے اس جشن کو جشن جمشیدی کا نام دیا۔

خط کے اس اقتباس میں غالبؔ نے شہر رام پور اور اس جشن کا نقشہ کھینچا ہے۔ غالبؔ نے لکھا یہاں جشن کی تیاریاں بڑے زور شور ہو رہی ہے۔ شہر کے دو کوس کے دوری پر آغا پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں مہمانوں کا کو ٹھہرایا جارہا ہے۔ کمشنر بہادر اس کے علاوہ چند صاحبوں اور میموں بھی وہاں مقیم تھے۔غالبؔ بھی اس ریاست کے مہمان تھے اور ان کو بھی عالی شاہ حویلی میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ۵ ؍ دسمبر کو نواب کلب علی خان آغا پور تشریف لے گئے اور شام پانچ بجے خلعت پہن کر جشن میں شامل ہوئے۔

رام پور کی شان و شوکت سے غالب بہت متاثر ہوئے۔نواب کلب علی خان غالبؔ کے عزیز شاگرد میں سے تھے اور وہ اپنے اُستاد کی قدر و عزت کرنا بخوبی جانتے تھے۔اس لیے نواب کلب علی خان نے غالبؔ کا ہر طرح سے قیام اور

آرام کا خیال رکھا۔

”ہا ہا ہا! میر پیارا میر مہدی آیا آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اُس کا نام ہے بے شبہ چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔ تمھارا خط پہنچا ترددعبث۔ میر مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے نہ عُرف لکھنے کی حاجت نہ محلّے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجئے اور جواب لیا کیجئے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب اور صحت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں۔دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر ہیں کوئی وقیقہ فروگذاشت نہیں ہے لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔“ ۱۸ ـہ

غالبؔنے یہ خط میرمہدی مجروحؔ کے نام ۱۸۶۰ء کولکھا جس کے اقتباس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ غالب رام پور میں شاہی مہمان تھے۔ اس شہر کی فضاء میں خوشی و مسرت محسوس کررہے تھے۔ اس شہر میں موجود دریائے کوسی کا ذکر بھی کیا کہا کہ اس کاپانی میں آب حیات کی سوت ملی معلوم ہوتی ہے اس لیے اس

دریا کا پانی پینے کے بعد سکون محسوس ہوتا ہے۔ دریائے کوسی کے پانی کو آب حیات سے تشبیہ دی ۔غالب کے اس بات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ غالب تصورات اور ذہنی تجربوں کے ساتھ اشیاء اور اشخاص اور مظاہر سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

کسی نئے آدمی سے مل کر اسکا چہرہ دیکھ کر جو کفیت پیدا ہوتی ہے اُسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا انسانی فطرت میں موجود ہے اسی طرح غالبؔ نے بھی رامپور کی نئی تہذیب اور ماحول سے متاثر ہو اس شہر کی تعریف میں اپنے دوست میر مہدی کو کہا کہ رامپور کا ماحول بہت خوب ہے اور صحت کے لیے بہتر ہے۔

" ہاہاہا میرا پیارا میر مہدی آیا" اس جملے میں ہمیں غالب کا انوکھا انداز تحریر نظر آتا ہے جس میں غالبؔ مکتوب الیہ کو بھی خط میں شامل کرتے ہیں۔ یہ جملہ غالب کی تحریر کی اہم خصوصیات کہ مراسلہ کو مکالمہ بنانے کو ظاہر کرتا ہے۔

رام پور کو غالبؔ نے بیت العموردارالسرور۔ کہا ہے۔غالبؔ نے رام پور میں تین ماہ قیام کیا۔ اس دوران پیش آنے والی تمام کفیات کا ذکر غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بتاتے رہے۔غالب ؔنے شہر رام پور کے قیام کے سلسلے میں دیگر خطو ط میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ تاریخی و تحققی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

"جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہواکہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچارمسی بھی چھوڑ دی اورڈاڑھی بھی۔ مگر یہ یا د رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام ملاّ۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقّہ بھٹیارہ۔ جو لاہہ، کنجڑا مُنہ پر ڈاڑھی سر پربال۔ فقیرنے میں دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر منڈوایا۔" ۱۹ـ

مندرجہ بالا خط کے اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے تھے اور اپنے حلیے کہ بارے میں لکھتے ہے کہ ڈاڑھی کے بال سفید ہونے لگے تھے۔ کمر ذراسی جھک گئی تھی۔ بڑھاپے کا آغاز ہوتو جوانی کے ساتھ ساتھ چہرے کا حسن بھی رخصت ہونے لگا۔ ڈاڑھی اور مونچھ میں سفید بال آنے لگے۔ دانت ٹوٹنے شروع ہوگئے۔غالبؔ نے اس خط میں مرزاحاتم سے اپنے بدلتے ہوئے حلیے کا نہ صرف مذاق اُڑایا ہے بلکہ اپنی شکل و صورت کی انفرادیت کا بھی اظہار کیا۔

اپنی جوانی کی یاد کرتے ہوئے کہتے ہے کہ وہ جوانی میں بہت خوبصورت تھے ان کا قد ، جسم ، چہرہ، صحت ، طاقت، مردانہ حُسن کا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن

ضعیفی کے عالم میں شکل و صورت میں تبدیلی آگئی۔ ڈاڑھی مونچھ کے سفید بال ہوگئے جیسے گالوں پر جیونٹی کے انڈے کی طرح سفیدی بکھر گئی۔ انھوں نے سر کے بال بھی منڈوادیے۔ میر مہدی کو یہ بات بتائی کے انھوں نے حافظ اور ملاّ کی طرح ڈاڑھی اور سر پر بال رکھے تھے۔

"غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ دوپہر میں سر بھر گوشت کا گاڑھا پانی قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب چھ گھڑی رات گئے۔" ۲۰؎

یہ خط غالبؔ نے مولوی حبیب اللہ خان ذکاؔ کو تحریر کیا ہے۔ اس خط میں غالب نے اپنے کھانے پینے کے بارے میں لکھا ہے۔غالبؔ کو کھانے پینے کا بڑا شوق تھا۔ان کے کھانے میں ہر روز گوشت، کباب، چنے کی دال دہی ہوتا تھا۔ صبح کے وقت سات بادام کا شیرہ اور شربت ہوتا تھا۔ دوپہر کے وقت گوشت کا شوربہ اور شام میں تلے ہوئے کباب یہ سب ہر روز کھانے میں ضرور شامل ہوتا تھا۔اسی وجہہ سے بوڑھا پے میں معدہ کمزور ہوگیا اور صحت بھی اچھی نہ رہتی تھی۔ تو رات کا کھانا چھوڑدیا۔

غالب کو پھلوں میں آم بہت پسند تھے۔ دوست احباب غالب کو آموں کی ٹوکریاں بھیجا کرتے تھے جس سے غالب بہت خوش ہوا کرتے تھے۔جب بھی آم کا موسم آتا غالب اپنے دوستوں سے تقاضا کرکے آم منگواتے تھے۔مرزاکی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی تھی۔ ایک وقت کا واقع ہے جب غالب بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ تھے اور آم کے باغ سے گزر ہوا۔یہ باغ کے آم واقفہ صرف بادشاہ اور بیگمات کے لیے ہوا کرتے تھے۔غالب نے آم کے لدے پیڑوں کو غور سے دیکھا اور کہا خدا نے کہا کہ دانے دانے پر لکھا ہے کھانے والے کا نام دیکھا رہاہوں کس آم پر میرا نام لکھا ہے۔غالب کے اس انداز کو بادشاہ سمجھ گئے اور غالب کے گھر اپنے باغ کے آموں کی ٹوکریاں بھیجوادی۔

"آج میرے پاس نقد بکس میں ۴ بوتل شراب اور ۳ شلیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔" ۲۱؎

غالبؔ کو شراب نوشی کی عادت تھی جس کا ذکر غالبؔ نے کئی خطوط میں کیا۔ مندرجہ بالا خط کے اقتباس میں شراب نوشی کا ذکر ملتا ہے جو غالبؔ نے مولوی منشی حبیب اللہ خاں ذکاؔکو لکھا ہے۔ غالبؔ شراب کو کافر کہا کرتے تھے۔ ان کے لیے شراب کو ترک کرنا ممکن نہ تھا۔ شراب نوشی کی وجہہ سے ان کی صحت خراب ہوتی جارہی تھی لیکن شراب غالب کہ منہ سے نہیں چھوٹ رہی تھی۔ غالبؔ کو رات کے وقت پانچ تولے عمدہ شراب اور اس کے ہم وزن عرق گلاب ملا کر پینے کے عادی تھے۔

انگریزی شراب کا سٹے لین ان کو بہت پسند تھا۔شراب کے ساتھ نمکین تلے ہوئے بادام بھی کھانا ان کو بہت پسند تھا۔غالب کی بیوی اُن کے شراب نوشی کی عادت کو نہ پسند کرتی تھی وہ اپنے کھانے پینے کے برتن بھی الگ رکھتی تھیں۔

غالبؔ کو شراب نوشی کی لت جوانی سے ہی لگ گئی تھی۔ جب وہ آگرہ میں رہتے تھے اور اُن کا بیٹھنا اُٹھنا رئیس زادوں کے ساتھ تھا۔یہاں سے غالب کے عادات و اطوار پر بُری صحبتوں کا اثر پڑا اور غالبؔ کو شراب نوشی کی لت لگ گئی اور یہ لت مرتے دم تک رہی۔غالبؔ زندگی کے آخری ایام میں شراب کی تیزی کم کرنے کے لیے اس میں عرق گلاب ملایا کرتے تھے لیکن پینا ترک نہیں کیا۔غالبؔ کے دوست اور احباب نے ان کو شراب چھوڑ نے کے لیے بہت سمجھایا لیکن غالب باز نہیں آئے۔ پھر ان کے دوستوں نے دُکان دار سے غالب کو شراب اُدھار دینے سے منع کیا۔ غالبؔ شراب چھوڑنے کے بجائے اُس کی مقدر کم کردی کیونکہ غالبؔ کو رات میں اگر شراب نہ پینے تو نیند نہیں آتی تھی۔روزانہ رات میں پاؤ بھر کے قریب شراب پینا ان کے لیے ضروری تھا۔

”دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۸۵۸۱ء کے جواب ۹۵۸۱ء میں بھیجے ہو۔ اور مزہ یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا۔ تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔“ ۲۲ے

درج بالا اقتباس غالبؔ کے تحریر کرہ خط جو غالبؔ نے مرزا تفتہؔ کو نگاشتہ دوشنبہ ۳ ، جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھا۔ اس اقتباس سے غالب کے مزاج میں موجود شوخی و ظرافت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ غالبؔ کو کم بولنے کی عادت تھی لیکن جو بولتے و لطف و مزا سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ان کے خطوط میں شواخی و ظرافت کئی جگہ ملتی ہیں۔ ان کے مزاج میں بلا کی شوخی اور ظرافت موجود تھی۔ غالبؔ کی زندگی پریشانیوں ، تنگ دستی ، بیماریوں اور قرض کے بوجھ کے تلے دبی تھی لیکن ان تمام حالتیوں کا ذکر غالبؔ اپنے دوستوں کو خطوط کے ذریعہ بیان کرتے تھے۔ اوراپنے پریشانیوں اور فکروں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔وہ اپنے زندگی کے تمام ذاتی اور نجی مسائل کو مذاحیہ انداز میں بیان کرتے تھے۔

اس اقتباس میں غالبؔ مرزا تفتہؔ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالبؔ کا لکھا خط جو دسمبر ۱۸۵۸ ء کی آخری تاریخ میں لکھا تھا اُس کا جواب مرزا تفتہؔ نے جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو تحریر کیا، اس پر غالبؔ نے تفتہؔ کو کہا کہ غالب کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ غالب کا دسمبر ۱۸۵۸ ء کو لکھے خط کا جوا ب

جنو ری ۱۸۵۹ء کو لکھ بھیجا۔ اگر غالبؔ تفتہؔ سے اس بات کی وجہہ پوچھتے تو تفتہؔ کہتے ہیں کہ میں نے دوسرے ہی دن خط کا جواب لکھا۔

غالبؔ کے مزاج میں ظرافت تھی اس وجہہ سے وہ اپنے مالی پریشانیوں اور فکروں کو ہنسی مذاق میں بیان کرکے دل کو ہلکا کرتے تھے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ ان کو کوئی پریشانی بھی ہے بلکہ ان کے اندازے بیان سے ان کا بے فکرا پن ظاہر ہوتا تھا۔

ایک دوست کو رمضان کے مبارک مہینے میں خط لکھا جس میں ظرافت اور شوخی بیان ملتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا کبھی حقہ پی لیا کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا یہاں کہ لوگ عجیب فہیم ہے وہ سمجھتے ہیں کہ غالبؔ روزہ نہیں رکھتا، روزہ رلکھنا اور روزے کو بہلانا اور بات ہے، اس طرح کے جملے غالبؔ کے مزاج میں موجود شوخی و ظرافت کو عیاں کرتے ہیں۔

" میرمہدی جتنے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں اُردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا۔ کہ مجھ رشک آنے لگاہے۔سنودلی ؔکی تمام مال و متاع وزو گوہر کو لوٹ پنجاب احاطے میں گئی۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے اس کو سجل کیا، اللہ برکت۔"۲۳ ے

یہ اقتباس غالب کے میر مہدی مجروح ؔکے نام لکھے خط سے ماخوذ ہے۔ اس میں غالب نے میر مہدی کو جیتے رہو اور ہمیشہ خوش رہو دعائیے کلمات لکھتے ہے۔ غالبؔ کو میر مہدی کے خط لکھنے کے انداز بہت پسند آیا۔ میر مہدی کی تعریف کرتے ہوئے غالبؔ لکھتے ہے کہ تمہارا خط پڑھ کر رشک آنے لگتا ہے۔ میر مہدی تم نے بہت ہی اچھے انداز میں اُردو لکھا ہے،خط کو بہت اچھی ترتیب دی ایسا لگتا ہے جیسے ہیرے ،جواہرات ، موتی سب لے کر آپ پنجاپ چلے گئے یہ سب عبارتیں خاص میری دولت تھی۔میرمہدی جو پانی پت انصاریوں کے محلّے میں رہنے والے تھے انھوں نے غالبؔ کی خاص طرز عبارت لوٹ کر لے گئے۔پھر بھی غالبؔ میر مہدی کو دُعا دیتے ہوئے کہا کہ، اللہ آپ کو برکت دے۔

" مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں،نہ مقید نہ رنجور ہوں، نہ تندوست ہوں،نہ خوش ہوں، نہ مردہ ہوں،نہ زندہ جئے جاتاہوں، باتیں کیے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔شراب گاہ گاہ پینے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مررہاہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے،جو

تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہےبارے جہاں ر ہوجس طرح رہوہر ہفتہ میں ایک خط لکھا کرو۔" ۴۲ ـہ

یہ اقتباس غالبؔ نے ۱۹، دسمبر ۱۸۵۸ء کومرزا تفتہؔ کے نام لکھے خط سے لیا گیا ہےیہاں غالبؔ نے اپنی کیفیت تفتہؔ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔غالبؔ اپنی حالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ نہ آذاد نہ خوش اور نہ مردہ نہ زندہ ہے۔ بس جیئے جاتے ہیں اور باتیں کہے جاتے ہیں۔ یعنی ان کی حالت زندگی پریشانیوں میں گھری ہے ۔نہ تو وہ خوش ہے نہ غم میں مبتلا ہیں اور نہ زندہ ہے نہ مردہ یہ کیفیت سے غالب بے حال ہے۔ لیکن پھر بھی جی رہے ہیں۔ روٹی کھار ہیں اور شراب بھی پی رہے ہیں۔ اگر موت آجائے تو مربھی جائے گے۔ ان کو کسی سے شکایت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ وہ تفتہؔ کو ہفتے میں ایک بار خط لکھنے کو کہتے ہیں۔ جہاں بھی رہو جس طرح رہو لیکن ہفتے میں ایک خط غالب کو ضرور لکھنا ۔ اس سے یہ بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کے خاص مشغل خط لکھنا تھا اور اپنے دوستوں کو بھی خط لکھنے کو کہتے تھے اور وہ ان کے خطو ط کا جواب دینا وہ اپنا فرض سمجھتے اور خوشی خوشی دوستوں کے خط کا جواب دیتے ان کا خیا ل تھا کہ جس دوست کا خط آئے وہ شخص ان کو ملنے شریف لایا۔ غالبؔ خط آنے پر اس طرح کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ وہ خدا کا احسان مانتے تھے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا۔ اس کو اطراف و جوانب سے دوچار خط نہ آتے رہتے کبھی کبھی دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا رہتا تھا۔ ایک صبح کو اور ایک شام کو تو غالبؔ بہت خوش ہوتے ان کا دن پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزرجاتاتھا۔ اگر کسی کا خط نہ آتا جو ان سے شکایت کرتے اور خط نہ لکھنے کی وجہہ پوچھتے اور کہتے کہ آدھ آنے میں نجل نہ کرو ورنہ ایسا ہی ہے تو بیرنگ خط بھیجو دو ۔

"آؤ مرزا تفتہؔ میرے گلے لگ جاؤ بیٹھو اور میری حقیقت سنو۔ سامعہ مرگیا تھا اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں، حواس سراسر مختل ہیں حافظ گویا کبھی نہ تھا۔۲۵ ـہ

مندرجہ بالا خط مرزا تفتہؔ کو ۱۴ دسمبر ــــ ۱۸۶۴ء کو لکھا گیا ۔اس خط میں غالب نے اپنی جسمانی کمزوری اور بوڑھاپے کا ذکر کیا۔غالبؔ لکھتے ہیں کہ مرزا تفتہؔمیرے گلے لگ جاؤ، میرے پاس بیٹھو اور آگے لکھتے ہے کہ میری حقیقت تم کو سُنا تا ہوں کہ میری سُننے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے اور میری دیکھنے کی صلاحیت کمزور ہوچکی ہے جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہے وہ سب قوتیں کمزور

ہوگئی ہے میرے حافظہ تو بہت ہی کمزور ہوگیا ہے۔جس کا ذکر اس اقتباس میں ملتا ہے۔

ان تمام خطوط کے مطالعے سے ہمیں غالبؔ کی حالات و کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ غالب کی شخصیت کا مطالعہ ان خطوط کا مطالعہ ہیں اور انہوں نے اُردونثر کو ایک نیا موڑ دیا اور نیا اسلوب دیا۔ ان کے موجودہ خطوط اُردو نثر کا عظیم سرمایہ ہیں ان کی شخصیت میں پائی جانے والے خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے بے تکلفی روانی بے ساختگی ، اسلوب اور طرزادا خیال کی پرواز، خیال آفرینی یعنی ان کی شخصیت کا ہر پہلو ہمارے سامنے ان خطوط سے عیاں کرتے ہیں۔غالبؔ دُنیا وہ عالم کے ہر حادثات و ماحول سے آشنا نظر آتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے اثرات سے لے کر وہ دیگر سیاسی سماجی تہذیبی، اخلاقی، تمدنی اور ثقاتی ماحول کو اپنے خطوط کا ایک اہم حصہؔ بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ انمول اچھوتے اور انوکھے خطو ط جو جذبے کی گہرائیوں سے لکھے گئے ہیں۔ دیگر معلومات اور لوگوں کے تعلقات کے علاوہ ان میں قلبی واردات کے نمونے بھی موجود ہیں۔ جب ہم ان خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تاریخ کے ہر پہلو نظر آتے ہیں ۔ غالبؔ نے ان حادثات کو لوٹ مار قتل و غارت ، انگریزی حکومت کے تمام غدداری چال بازی کو دیکھا تھا۔ غالب اس زمانے میں بے شمار تکالیف سے گذرے ان تمام تکالیف کا تذکرہ اپنے مختلف خطوط میں الگ الگ لوگو ں کو لکھے رہے۔ یہ خطوط ان کے دلی خدمات اور کیفیات کے غمازبن گئے۔ غالب کی ساری زندگی کشمش میں گذری ،زندگی نے ان کا ساتھ نہیں دیالیکن وہ ہمیشہ زندگی کے ساتھ رہے وہ اپنی حالات زندگی سے نبھا کرتے رہے۔اپنے حالات کو سمجھا اور نبھایا زندگی کے اچھے بُرے ہر پہلو پر نظر کی گہرائی کے ساتھ جینے کا سلیقہ ڈھونڈ لیا۔ ان کے مزاج میں گہرائی کے ساتھ جدت پسندی بھی شامل تھیں۔ کسی چیز کا نہ ہونا اُن کو اداس غمگین ضرور کرتا تھا لیکن وہ اُسے حاصل کرنے کے لیے تھک کر نہیں بیٹھے بلکہ اُس کو حاصل کرنے کی لگن میں ہمیشہ کوشا رہتے۔ اور یہ ان کی زندگی کا انقلابی پہلو تھا۔ ان خطوط کا مطالعہ ہمیں ان کی زندگی کی گہرائی سے واقف کروایا ہیں۔ ان کی سوانح حیات کی رہنمائی میں ان خطوط کا خاص مقام ہیں۔ ان خطوط سے غالبؔ کی زندگی تمام صورتیں ہمارے سامنے آکھڑی ہوجاتیں ہیں شاعری کے بامقابلہ ان کی نثری خطوط ان کی زندگی کی تشریح باقاعدہ اندازمیں عیاں کردیتے ہیں۔خطوط غالبؔ کے سوانحی عناصر کا تحزیاتی مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط میں نجی زندگی کی سچی رودار بیان کی ہیں۔

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

بنیادی طورپرہمارا یہ مطالعہ غالبؔ کے خطوط کے تجزیے پر مبنی ہے جس میں ان کی شخصیت کا رنگ اور خوشبوشامل ہیں۔ خطوط غالبؔ میں ہم اس فن کار کی شخصیت کا رنگ اس کی نجی زندگی کے شب و روز کی تصاویر پھیلی ہوئی پاتے ہیں۔ یہ تصویریں انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔تو ہم ایک ایسی شخصیت کو اپنے روبرو پاتے ہیں جو ایک طرف اپنے کردار کی بلندی تو دو سری طرف کمزرویوں کی بدولت جیتی جاگتی معلوم ہوتی ہے۔

۱۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۳۰
۲۔	یاد گار غالب	الطاف حسین حالی (باردوم)	ص۱۶۷
۳۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص۵۰۴
۴۔	غالب کی زندگی	امیر حسین نورانی	ص ۱۴
۵۔	غالب کی زندگی	امیر حسین نورانی	ص ۱۵،۱۶
۶۔	اُردوئے معلی	مرز اسد ا للہ ا غالب	ص ۳۸۴
۷۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۲۷۲

۸۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۵۸ ، ۵۹
۹۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص۴۸
۱۰۔	غالب کے خطوط (جلد اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۳۲۷
۱۱۔	غالب کے خطوط (جلد اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۲۰۰، ۲۰۱
۱۲۔	اورَاق معانی	مرزا غالب(مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد	ص۶۴
۱۳۔	غالب اور بنارس	شاہد ماہلی	ص۹۱
۱۴۔	اورَاق معانی	مرزا غالب(مترجم۔ ڈاکٹر تنویر احمد)	ص۵۱، ۵۲
۱۵۔	غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتہ کا ادبی معرکہ	ڈاکٹر خلیق انجم	ص۷۹
۱۶۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۷۹
۱۷۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۴۲۲
۱۸۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۱۶۲،۱۶۱
۱۹۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۲۴۸
۲۰۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۳۷
۲۱۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص ۴۲
۲۲۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص۶۰
۲۳۔	اُردوئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص۱۸۵
۲۴۔	اُردو ئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص۱۸۵
۲۵	اُردو ئے معلی	اسد اللہ خان غالبؔ	ص۵۷

کتابیا ت

کتابیں جن سے اس مقالے کی تیاری میں مدد لی

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف؍ مرتب	پبلشر	اشاعت
۱۔	عود ہندی	رام نرائن لال	بینی ماھور الہ آباد	۱۹۷۲ء
۲۔	اردؤ معلی	مرزا غالبؔ	رام نرائن لعل بُک سیلر الہ آباد	۱۹۵۲ء
۳۔	غالب کے خطوط (جلد اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۰۰ء
۴۔	غالب کے خطوط (جلد دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۰۶ء
۵۔	غالب کے خطوط (جلد سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۱۶ء
۶۔	غالب کے خطوط (جلدچہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۱۱ء
۷۔	غالب کے خطوط (جلد پنجم)	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۱۰ء
۸۔	غالب کی مکتوب نگاری	پروفیسر نذیر احمد	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۰۳ء
۹۔	غالب شاعر و مکتوب نگار	پروفیسر نورالحسن نقدی	ایجوکیشنل بُک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۱۵ء
۱۰۔	ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عکسری صاحب	نظامی پریس وکٹوریہ لکنھؤ	۱۹۲۹ء
۱۱۔	خطوط غالب ۔ فنی تجزیہ	حامدہ مسعود	ایجوکیشنل بُک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۱۲۔	غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ	خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۰۵ء
۱۳۔	غالب اور بنارس	شاہد ماہلی	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۱۰ء
۱۴۔	غالب اوررام پور	شاہد ماہلی	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۱۰ء
۱۵۔	املائے غالب	رشید حسن خان	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۲۰۰۰ء

۱۶۔ غالب کا تنقیدی شعور اخلاق حسین عارف اوارہ فروغ اردو آمین آباد

مکتوبات کے آئینہ میں

۱۷۔ غالب کی فکری وابستگیاں انور معظم غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۲۰۱۱ء

۱۸۔ غالب کی کہانی محمد شفیع الدین نیر نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۹۷۱ء

۱۹۔ غالب کی سوانح عمری ڈاکٹر تنویر احمد علوی غالب اکیڈمی نئی دہلی ۲۰۰۴ء

خطوط غالب کی روشنی میں

۲۰۔ غالب کی زندگی امیر حسین نورانی آذاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۱۹۶۹ء

۲۱۔ غالب نامہ شیخ محمد اکرام قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۳۶ء

۲۲۔ واردات غالب فاروق ارمگی فرید بُک ڈپوپرایویٹ لیمیڈ ۲۰۱۲ء

۲۳۔ ۱۸۵۷ ء کی کہانی غالب کی زبانی محمود سعیدی نشنل بُک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی ۲۰۰۷ء

۲۴۔ غالب غلام رسوؒل مہر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۲۰۰۵ء

۲۵۔ غالب کی آپ بیتی نثار احمد فاروقی علمی مجلس دہلی ۱۹۷۱ء

۲۶۔ غالب اورعہد غالب شاہد ماہلی غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۲۰۰۱ء

۲۷۔ میرامن سے عبدالحق تک ڈاکڑسید عبد ا للہ چمن بُک ڈپو، اُردو بازار دہلی

۲۸۔ داستان تاریخ اردو حامد حسن قادری لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ ۱۹۴۱ء

۲۹۔ ادبی نثر کا ارتقاء ڈاکٹر شہناز انجم مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دلی ۱۹۸۵ء

۳۰۔ مطالعات خطوط غالب عبدالقوی دسنوی شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۸ء

۳۱۔ اوراق معانی ڈاکٹرتنویر احمد علومی اُردو ا کیڈمی دلی ۱۹۲۹ء

۳۲۔ اُردو مکتوب نگاری ڈاکٹرشاداب تبسم مکتب جامعہ لمیٹڈ ۲۰۱۲ ء

۳۳۔ لسانی مطالعہ گیان چند ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۹ء

۳۴۔ غالب شاعر و مکتوب نگار نورالحسن نقوی ایجو کیشنل بُک ہاوس علی گڑھ ۲۰۱۵ء

۳۵۔ اردو خطوط ایک مطالعہ نسرین ممتاز بصر

۳۶۔ خاموش آواز | جا نثار آختر | مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی ۱۹۸۱ء
۳۷۔ منتخب ادبی خطوط | مغیث الدین فریدی | ایجوکیشنل بُک ہاؤس
۳۸۔ محیط اُردو (حصّہ اول) | عرفان الحق | عامر کتاب گھر دہلی۱۹۹۷ء
۳۹۔ مکاتیب مہدی | مہدی بیگم | مکتبہ جامعہ لمیٹڈنئی دہلی
۴۰۔ اردو مکتوب نگاری | ڈاکٹر شاداب تبسم | مکتبہ جامعہ لمیٹڈنئی دہلی ۲۰۱۲ء
۴۰۔ مکتوبات حالی(حصّہ اول) | خواجہ سجاد حسین | حالی پریس پانی پت ۱۹۲۵ء

سوامی راما نند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی

ناندیڑ مہاراشٹرا

مقالہ نگار

زرین سلطانہ امین احمد

ریسرچ اسکالر

نگراں

ڈاکڑ سیلم محی الدین

،پروفیسر، ریسرچ گائیڈ، صدر شعبہ اُردو
شری شواجی کالج، پربھنی

ریسرچ سینٹر

اسکول برائے زبان، ادب و ثقافتی مطالعات

سوامی راما نند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی
ناندیڑ مہاراشٹرا

فروری-2023

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

Khutoot-E-Ghalib Mein Sawanehi Anaser

SWAMI RAMANAND TEERTH MARATHWADA
UNIVERSITY, NANDED

For the Award of Degree
DOCTORATE IN PHILOSOPHY IN URDU

Submitted by

Zareen Sultana Ameen Ahmed

Research Scholar

Under the Guidance of

Dr. Saleem Mohiuddin

Associate Prof. Head, Dept. of Urdu
Shri Shivaji College, Parbhani

Research Center
School of Language, Literature & Culture Studies,
SRTMU, Nanded (Maharashtra)

February 2023

اختتامیہ

اُردو زبان و ادب میں مختلف اصناف موجود ہیں۔ اُردو کے نثری اصناف میں داستان ، ناول، ڈرامہ، غیرافسا نوی ادب سوانح نگاری، مضمون نگاری، انشاء نگاری، خاکہ نگاری اور مکتوب نگاری وغیرہ شامل ہے۔ مکتوب نگاری کو اُردو زبان و ادب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ مکتوب نگاری کو خطوط نگاری بھی کہا جاتا ہے۔ خط عربی زبان کا لفظ ہے۔ خط ایسی تحریر کو بھی کہاجاتا جو دولوگوں کے درمیان رابط کا وسیلہ ہوتی ہے اس لیے خط لکھنا ایک ضرورت بھی ہے اور اظہار کا ذریعہ بھی۔

خطوط نگاری کا فن آسان فن ہے۔ ذہن میں کوئی خیال ہویا نہ ہو خط لکھا جاسکتاہے اور خط میں نہ تو کوئی اُصول کی ضرورت ہے اور نہ کسی خیال کی۔ جیسے کسی دوسرے اصناف میں ذہن میں ایک خاکہ ہوتا ہے اور اُس کے مطابق اُس تحریری شکل دی جاتی ہے۔ لیکن خطوط نگاری میں اس طرح کوئی خیال یا خاکہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں صرف دو افراد کے درمیان بات چیت کا عمل ہوتا ہے۔

اُردو خطوط نگاری کی ابتدا مرزا غالبؔ سے ہوتی ہے۔ غالبؔ کی عظمت اگرچہ ان کی شاعری کی وجہ سے ہے لیکن ان کی نثری تحریروں میں خطوط کا سرمایہ بھی گراں قدر اہمیت کا حامل ہے اور اسے اُردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ بھی حاصل ہے۔ان کے خطوط ایک طرف ان کی شخصیت کی نمائندگی کرتے ہیں تو دوسری جانب تاریخی، سیاسی، سماجی، اور معاشی حالات کے آئینہ دار بھی ہیں۔ مزید یہ کہ غالبؔ کے مخصوص اسلوب ، انداز تحریر، سادگی ، شوخی ، دل کش طرز اظہارکی وجہ سے ان کے خطوط اور بھی دلچسپ ہوجاتے ہے۔

آٹھارویں صدی کے ابتداء میں اُردو نثر کے اولین نمونے دکن ہی سے ملتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج اُردونثر کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرامنؔ کے بعد اُردو نثر کو مرزا غالبؔ جیسا فن کار ملا ۔ غالب نے نثر میں باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں لکھی لیکن اُن کے خطوط نے اُردو نثر کو بیش قیمتی سرما یہ عطا کیا جس سے اُردو نثر کی دُینا ہی بدل گئی۔

غالبؔ کو اُردو مکتوب نگاری کا نقوش اوّل کہاجاتا ہے۔ انھوں نے اُردو نثر کو نئی سمتوں سے روشناس کروایا ہے۔ غالب کے خطوط میں سادگی، دردمندی اور اخلاص موجود ہے اور یہی خصوصیات اس صنف کو ادب کا حصہ ّ بناتی ہیں۔غالبؔ کی بدولت مکتوب نگاری ادب کی ایک جاندار اور دلکش صنف بن گئی۔ غالب نے خطوط اپنے دوستوں ، عزیزوں اور شاگردوں کولکھے ہیں جس میں اپنے عہد کے تاریخی، سماجی، سیاسی حالات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کے خطوط

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

کے مطالعے سے ہمیں ان کی شخصیت ، کردارن مزاج اور ادبی ذوق سے واقفیت ہوتی ہے۔ دراصل ان کے خطوط سوانحی اور ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالبؔ کے زندگی کے تمام تر حالات شب روز اور اپنے عہد کے دہلی کے تمدنی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے خطوط میں ڈرامائی کیفیت سے لے کر غالبؔ کے مزاج کے کئی پہلو، زندگی کے مشاہدے اور تجربہ موجود ہیں۔ ان کی نثر ان کی شخصیت کی مکمل طور پر آئینہ دار ہے۔ غالب کے نثرکی ایک نمایاں اور اہم خصوصیات جدید انداز بیان ہے انھوں نے ایک وقت میں نثر کے مختلف اسالیب کو یکجا کردیا ، کہیں افسانوی انداز ہے تو کہیں ڈرامے کے مکالمے نظر آتے ہیں۔

آٹھارہویں صدی کے خاتمے تک اُردو ادبی نثر میں ہمیں مذہبی، اخلاقی صوفیانہ کتابیں ملتی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پہلے اُردو نثر کا عام روجحان مرصبع و مسجع انشاپردازی کی طرف تھا اور اس پر فارسی اسلوب کے اثرات تھے مگر جیسے جیسے نثر پھلتی گئی اور عوام سے جوڑتی گئی اور پھر اس میں فارسی کے اثرات ختم ہوتے گئے اور اسلوب میں سادگی، سلاست پیدا ہوتی گئی یہی طرز جدید دور میں پروان چڑھ کر باغ وبہار سے ہوتا ہوا خطوط غالب سے جا ملتا ہے۔ خطوط غالب اس جدید طرز کے ساتھ اپنے عہد کے مکمل تصوری کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط میں فرد کی مایوسیوں اور ناکامیوں کی داستان بھی ہے۔ غرض انسان کی روزمرہ زندگی کے مسائل اُردو نثر میں پہلی بار خطوط غالبؔ ہی میں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے خطوط اُردو ادب میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

خطوط غالبؔ کی مذکورہ بالا خصوصیات کے پیش نظر ان کے بعض احباب کو یہ خیال آیا کہ ان کے خطوط کو یکجا کرکے شائع کردیا جائے۔چنانچہ انھوں نے ‘‘ عود ہندی ’’ کے نام سے غالبؔ کے خطوط کا سب سے پہلا مجموعہ ۱۸۶۸ء میں مطبع مجتبائی، میرٹھ سے شائع کیا گیا۔اس مجموعہ کی طباعت غالبؔ کے زندگی میں ہی آگئی تھی لیکن غالبؔ اس کی ناقص طباعت سے مطمئن نہ تھے۔اس لیے غالبؔ نے دوسرے مجموعہ کی اشاعت کے لیے بذات خود کوشش کی لیکن بدقسمتی سے ان کا دوسرا مجموعہ ان کی وفات کے ۱۹ دن بعد ۱۵؍ فروری ۱۸۶۹ء کو ‘‘ اردوے معلی ’’ کے نام سے اکمل المطابع ، دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد غالبؔ کے خطوط کی کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں سب سے پہلا نام مولانا امتیازعلی عرشی ؔکا ہے جنھوں نے ۱۹۳۷ء میں ‘‘ مکاتیب غالبؔ ’’ کے نام سے مطبع قیمہّ بمبئی سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں صرف نواب رومپور اور ان کے دربار سے وابستہ خطوط شامل ہیں۔بعد ازاں مولوی مہیش پرشاد نے ‘‘ خطوط غالبؔ ’’ کے نام سے ایک مجموعہ

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد سے شائع کیا۔اس کے بعد آفاق حسین آفاقؔ نے ۱۹۴۹ ء کو '' نادارت غالبؔ '' کے نام سے ایک مجموعہ ادارۂ نادارات ، کراچی سے شائع کیا۔

'' خطوط غالبؔ '' کے دو جلد منظر عام پر آئی ایک مولانا غلام رسول مہر اور دوسری جلد مالک رام نے مرتب کیں جس کی اشاعت بالترتیب ۱۹۵۱ء میں کتاب منزل، لاہور اور ۱۹۶۲ء میں انجمن ترقی اُردو ہند سے عمل میں آئی۔آخری اور جامع مجموعہ '' غالبؔ کہ خطوط '' کے نام سے ڈاکٹر خلیق انجم نے چار جلدوں میں مرتب کیں جو ترتیب وار ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۳ء میں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے شائع ہوئے ہیں۔

غالبؔ نے اپنے خطوط میں لسانی اور ادبی مباحث کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن میں لفظوں کی کہیں مفرد شکل ملتی ہے تو کہیں مرکب۔ ان کے خطوط میں بیشتر فارسی کے الفاظ اور محاوروں کا استعمال کیا گیا ہیں اور کمتر اُردو کے الفاظ و تراکیب شامل ہیں۔خطو ط غالبؔ میں کہیں تو لفظ کی صحت سے متعلق بحث کی اور کہیں اس کی معنی بیان کیے ہیں اور بعض جگہ انھوں نے دوسرے لغات سے اختلاف رائے بھی پیش کی۔مرکبات کے تعلق سے غالبؔ نے فارسی اور اُردو ترکیبوں سے متعلق گفتگو کی ہے۔خطوط غالبؔ میں تذکرو تانیث اور املاء کے بعض مسائل پر بھی بحث کیں ہیں۔غالب ؔ نے اپنے خطوط میں اشعار کی تشریح کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر اپنے شاگردوں کو ان کے کلام پر اصلاح دینے کا کام بھی کیا ہے۔

خطوط غالبؔ میں علم قافیہ، علم عروض، علم بلاغت اور نثر سے متعلق بُنیادی اور اہم اصولوں کی جانب بھی رہنمائی کی گئی ہے۔غالبؔ کے خطوط سے ان کے اسلوب کا بھی پتہ چلتا ہے کیوں کہ ان کے مخصوص اسلوب ان کے خطوط کی دلچسپی میں مزید اضافہ کردیتا ہے۔انھوں نے القاب و آدب کا بالکل نرالا طریقہ اپنایا ہے۔ اس کے علاوہ غالبؔ نے بیشتر خطوط تقریر اور تحریر کے درمیان کی چیزیں ندائیہ الفاظ بیانیہ اور خطبانہ انداز اختیار کرکے اپنے خطوط کو تقریر اور گفتگو سے قریب کردیتے ہیں کہ مجلس اور اجتماعی فضاء پیدا ہوجاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالبؔمکتوب الیہ ہی کونہیں بلکہ بہت سے افراد کو مخاطب کررہے ۔ انھوں نے مقفی عبارت کو کم استعمال کیا، غالبؔ نے صرف وہی خطوط مکمل طورپر مقفی عبارت میں لکھے ہیں جن میں ان کے پا س کہنے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے اور خط لکھنا ضروری ہے۔

غالب ؔ کی مکتوب نگاری کو سوانحی لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل تصوّر کیا جاتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط ان کی زندگی اورا ن کے عہد کا آئینہ ہیں۔ سادگی و

خطوط غالب میں سوانحی عناصر

سلاست غالب کے نثر کی اہم خصوصیت ہے۔ اسی سادگی و سلاست کے ساتھ وہ خطوط میں اپنی زندگی کے متعلق بے حد اہم انکشیافات انتہائی بے تکلّفانہ انداز میں کرتے ہیں۔ان سوانحی اشاروں میں نہ صرف غالبؔ کی طرز زندگی ابھر کر سامنے آتی ہے بلکہ ان کی فکر کے کئی گوشے بھی اُجاگر ہوتے ہیں۔

غالبؔ کے خطوط کی وجہہ سے غالب کی ایک الگ قسم کی سوانح عمری تیار ہوگئی۔ اس سوانح عمری کا ماخذ غالب کے خطوط کی تحریر میں موجود ان کے سوانح عمری میں نئے گوشوں کے ساتھ ساتھ وہ معلومات بھی آگئی جو غالبؔ کی سوانحی عمری میں ملتی ہے۔ جیسے غالب کا خاندان ، تعلم و تربیت، شادی، خاندانی وظیفہ دلی کالج کی ملازمت، شراب نوشی وغیرہ کا ذکر ان کے سوانح حیات کے بہت سے گوشے ان کے مکتوبات ہی میں موجود ہیں۔ ان کے خطوط ہی ان کے مختلف ادواد زندگی کو عیاں کرسکتے ہیں اور ان کے حالات ، خیالات اور نقط نظر سے ہم بھی واقف ہوسکتے ہیں۔

غالبؔ پر جو تحقیق ہوئی وہ اپنے طورپر اور اپنے معیار فکر و نظر کی روشنی میں اُردو کی نہایت اہم تحقیقات کا نمونہ ہے۔ غالبؔ کے اُردو فارسی کے بہت سے شعرا اپنے تصوّر اور تاثر کے اعتبار سے اسی طرز وفکر اور انداز نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ خطوط کا مطالعہ بطور خاص ان کے ذہنی سفر اور سیر زند گی پر نظردواری اور تخلیقی حیثیت کی ادا شناسی کے اعتبار سے بے حد اہم ہے جو ذہن کو ان کی ر وداد زندگی سے بہت قریب لے آتا ہے۔

غالبؔ کے خطوط کو ان کی سوانح کہا جاتا ہے ان کی زندگی اور ان کے خاندان کی سبھی باتیں ان کے خطوط میں موجود ہیں۔ ان کی زندگی ایک المیہ تھی ۔ بچپن سے والد اور چچا کا سات چھوٹا عمربھر تنگ دستی میں رہی لیکن سخاوت اور دریادلی کی فطرت تھی اس لیے ان کے دروازے سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ غالب کے خطوط ان کے دوست و احباب ، ادب مجلس اور ان کی شاعری کا بھی آئینہ ہے۔ غالب کی مالی تنگدستی ان کے مسلسل بیماری ، دہلی کی تباہی و بربادی کے ہنگامہ نے بھی ان کی غم زدہ کررکھا تھا۔اس لیے غالب کے خطوط میں ہی ان کی سوانح حیات نظر آتی ہے۔

غالبؔ کے خطوط کا سوانحی عناصر کا ادبی، سماجی اور لسانی تجزیہ کرنے پر ان کی سوانحی عناصر کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ غالب کی شخصیات کے چند نئے گوشے روشناس ہوسکتے ہیں۔